ABDU'L BAHÁ ABBAS S o BAHÁ'ULLÁH

اَلنُّورُ الاَبْھیٰ

فی
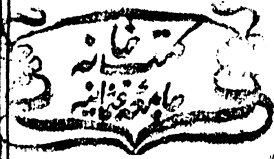
مُفاوضاتِ عبدالبہاء

گفتگو بر سرِ ناہار

مُرتّبۂ

کلیفورڈ بارنی امریکانیہ

جس کا ترجمہ اصل فارسی سے

حسبِ امرِ مُبارک محفلِ مقدسِ رُوحانیِ مرکزیِ ھند و برھما

عبّاس علی بٹ ۔ بی ۔ اے ۔ بی ۔ ای ۔ ڈی ۔ ایچ ۔ پی

نے کیا

محفلِ مُقدّس رُوحانی مرکزیِ ھند و برھما نے طبع کرا کے شائع کیا

سنہ ۱۹۳۷ء

فہرست مضامین

قسم چہارم

نوع انسان کے آغاز و انجام اور اس کے مختلف حالات اور اس کی قوتوں کے بارے میں

قسم پنجم

مقدمۂ ناشرِ کتاب

تعریف و ستایش اُس خداوند کے لئے سزاوار ہے جس نے اپنی کمال عنایت سے انسان کو عقل کے زیور سے آراستہ کیا اور اِس وسیلہ سے اس کو اسرارِ کائنات کا کھوج لگانے اور اپنے اسماء وصفات کے رموز کو پہچاننے کی ہدایت فرمائی۔ پھر اُس کی مشیّتِ ازلیہ نے یہ قرار دیا کہ اِس دَورِ اعلیٰ میں جو نورِ الہٰی کی تجلیات کے ظاہر ہونے کا دَور ہے مشرق و مغرب محبّت اللہ کے رشتہ سے مربوط ہو جائیں۔ مذہبی و دینی اختلافات اور قومی و وطنی امتیازات اُٹھ جائیں۔ اور سطحِ زمین ساری نوعِ بشر کا ایک مشترکہ وطن ہو جائے۔ بے شک اِس دَورِ جدید میں سب بندگانِ خدا ایک شاخ کے پتے اور ایک سمندر کے قطرے ہیں ؛

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے مجھ بے لیاقت حقیر کو جس کے پاس نہ تو سرمایۂ طاعت ہی تھا اور نہ شایستگی و لیاقت تھی حضرت عبدالبہاء (آپ کے قدموں کی خاک پر میری روح قربان ہو) کی مُلاقات کے فیض کی توفیق عطا فرمائی اور اِس ساقیِ ازل کے ہاتھ سے مجھے جامِ معانی پلایا ؛

کئی دفعہ ارضِ مقصود کی زیارت کا شرف حاصل کرنے اور اپنی دِلی آرزوں اور تمناؤں کے پورا کرنے کے بعد حقیر کو یہ شوق ہوا کہ حقائقِ رُوحانی کو سمجھوں اور معانی کے اُس بحرِ بیکراں سے کچھ حاصل کروں۔ پس میں نے دینِ بہائی اور دیگر مسائلِ الہٰیہ کے بارے میں کچھ سوالات آنحضرت سے کئے۔ اور آپ نے باوجود روزانہ دائمی مشاغل کے جن سے آپ کو ایک پل بھر کے لئے بھی فرصت نہ ملتی تھی نہایت محبت و مہربانی سے سب سوالات کے جوابات میری فہم و عقل کے مطابق عنایت فرمائے۔ اور اِس خیال کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کہ میں فراغت و فرصت کے وقت اُن مشکل مسائل کے جوابات پر غور و خوض کروں ایک زود نویس کاتب مقرر کیا گیا۔ جب حضرت عبدالبہاء بیان فرماتے تھے تو وہ لکھتا جاتا تھا ؛

چونکہ حقیر کو فارسی زبان اچھی طرح نہ آتی تھی اور مشکل مسائلِ الہٰیہ میں غور و خوض کرنے کی اتنی لیاقت

نہ تھی اِس لئے حضرت عبد البہاء (میری روح اُن پر فدا) نے مجبوراً ایک ہی مطلب کو کئی جگہ دُہرایا ہے۔ اور ایک ہی قسم کے استعارات و تشبیہات کو کئی موضوعات میں استعمال کیا ہے۔ حالانکہ آپ ایسے حقائقِ عالیہ کے بیان میں بلند ترین انشار استعمال کر سکتے تھے مگر میری رعایتِ فہم کے لئے حضرت عبد البہاء نے نہایت سیدھے سادے طریق پر بیان فرمایا ہے ۔

الغرض کچھ مُدت کے بعد اِن سوالات و جوابات کا ایک مختصر مجموعہ فراہم ہوگیا۔ اور میں ہمیشہ اُن حقائق پر غور و خوض کر کے لُطف اُٹھاتی تھی۔ پھر میرے دل میں آیا کہ کوثرِ معرفت کے اور پیاسوں کو بھی اِس آبِ حیاتِ جاودانی سے محروم نہ رہنے دوں۔ اور کُل نفوس کو خواہ وہ احباب ہوں یا اغیار بڑے ہوں یا چھوٹے اُس منبعِ فیضِ سرمدی کی آیات کے حقائق سے بہرہ ور کروں۔ پس میں نے حضرت عبد البہاء سے اجازت مانگی کہ اِن سوالات و جوابات کو ایک کتاب کی صورت میں چھاپ کر شائع کر دوں تاکہ اِس کا فائدہ سب لوگوں کو پہنچے ۔

اجازت حاصل ہونے کے بعد میں اُن فصلوں کی ترتیب و تنظیم میں مشغول ہوئی اور اُن بیاناتِ مُبارکہ کو جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح پڑے ہوئے تھے نظم و ترتیب کی ایک ایسی لڑی میں پرو دیا جو حقیر کی نظر میں مناسب تر اور لائق تر معلوم ہوئی۔ اور اس کے چھپوانے اور شائع کرنے کا انتظام کر لیا۔ اور اربابِ فضل و معرفت کے سامنے ایک بیش بہا خزانہ مفت تحفتہً پیش کر دیا ۔

اُمید ہے کہ اِس کتاب کے ذریعے اَمرِ اقدسِ ابہیٰ جس نے اَب تمام آفاق کو منوّر کیا ہوا ہے اور جس نے دُنیا کو ایک نئی صورت عطا کی ہے ہر خاص و عام کے کانوں تک پہنچ جائیگا۔ اور اُس کی عالمگیر آواز دور و نزدیک کے رہنے والوں تک پہنچ جائیگی۔ والسلام

کلیفورڈ بارنی اُمریکانیہ

پیرس ۱۶- جنوری ۱۹۰۸ء
۱۱- ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ

قسمِ اوّل

مقالات

بعنوان

نوعِ انسانی کی ترقی و تربیت

میں

انبیاء کا اثر

قسمِ اوّل
مقالات

نوعِ انسانی کی ترقی و تربیت میں انبیاء کا اثر

هُوَ الله

(۱) طبیعت (نیچر) ایک عالمگیر قانون کے ماتحت ہے

نیچر وہ کیفیت یا وہ حقیقت ہے جس سے بظاہر زندگی و موت یا بالفاظ دیگر تمام چیزوں کی ترکیب تحلیل وابستہ ہے۔ یہ نیچر یا طبیعت صحیح انتظامات مستقل قوانین۔ کامل ترتیب اور مکمل دستور کے ماتحت ہے۔ کہ ہرگز اُن سے الگ نہیں ہوتی۔ یہانتک کہ اگر غور و تعمق کی نظر سے دیکھیں تو کائنات کے چھوٹے چھوٹے نہ دکھائی دینے والے ذرّات سے لے کر بڑے بڑے کُرّے مثلاً سورج۔ عظیم الشان ستارے اور دیگر نورانی اجسام بھی کیا از روئے ترتیب و ترکیب کیا بلحاظِ شکل و حرکت نہایت ہی اعلیٰ درجے کے انتظام سے وابستہ ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سب ایک کامل قانون کے ماتحت ہیں۔ اور کسی صورت میں بھی اس سے تجاوز نہیں کرسکتے۔ مگر جب آپ خود نیچر یا طبیعت کو دیکھتے ہیں تو اُسے ارادہ و شعور سے عاری پاتے ہیں۔ مثلاً آگ کی طبیعت میں جلانا ہے۔ بغیر ارادہ و شعور کے جلاتی ہے۔ پانی کی طبیعت میں روانی ہے۔ بغیر ارادہ و شعور کے بہتا ہے۔ آفتاب کی طبیعت میں روشنی ہے۔ بغیر ارادہ و شعور کے چمکتا ہے۔ بخارات کی طبیعت میں اوپر کی طرف اُٹھنا ہے۔ بلا ارادہ و شعور کے اوپر کی طرف چڑھتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ تمام کائنات کی حرکات طبیعی مجبورانہ ہیں اور اُن میں سے ایک بھی سوائے حیوان خصوصاً انسان کے اپنے ارادہ سے متحرک نہیں۔ انسان طبیعت کا مقابلہ اور اُس کی مخالفت کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس نے اشیاء کی طبیعتوں کو معلوم کرلیا ہے اور اِس علم کے زور سے طبیعت یا نیچر پر حکمران ہے۔ یہ سب ایجادیں جو انسان نے اختراع کی ہیں جیسے تاربرقی جو مشرق و مغرب میں کام کر رہی ہے انسان نے اسی علم کے ذریعے معلوم کی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ انسان طبیعت یا نیچر پر حاکم ہے۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ انتظام اور

ترتیب اور یہ قوانین جو دنیا میں دکھائی دیتے ہیں طبیعت کے اثر سے ہیں؟ حالانکہ طبیعت خود شعور و ادراک سے عاری ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ طبیعت جو ادراک و شعور نہیں رکھتی خدائے قدیر کے قبضے میں ہے جو عالمِ طبیعت کا مدبّر ہے۔ اور جس طرح جو کچھ چاہتا ہے طبیعت سے ظاہر کرتا ہے۔ عالمِ وجود میں جو کچھ تقاضائے طبیعت سے واقع ہوتا ہے کہتے ہیں اُن میں سے ایک وجودِ انسانی ہے۔ اِس صورت میں انسان فرع اور طبیعت اصل ہوئی۔ کیا ہوسکتا ہے کہ فرع میں ارادہ و شعور اور ایسے کمالات ہوں جو اصل میں نہ ہوں؟ پس معلوم ہوا کہ نیچر یا طبیعت من حیث الذّات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس زندہ و پائندہ قادرِ مطلق نے اس کو صحیح قوانین اور انتظامات میں باندھ رکھا ہے اور اُس پر حاکم ہے۔

(ب)

خُدا کی ہستی کے دلائل و براہین

خدا کی ہستی کے دلائل میں سے ایک دلیل اور ثبوت یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کا پیدا کرنے والا اور بنانے والا کوئی اور ہے۔ اِس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ انسان کا خالق انسان ہی جیسا نہیں۔ کیونکہ ایک کمزور مخلوق دوسری ہستی کو پیدا نہیں کرسکتی۔ یہ لازم ہے کہ خالق فاعل تمام کمالات کا جامع ہو۔ تاکہ وہ پیدا کرسکے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مصنوع تو نہایت درجۂ کمال میں ہو اور صانع غیر کامل ہو؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تصویر تو نہایت پاکیزہ ہو اور مصوّر اپنے فن میں ناقص ہو؟ ہرگز نہیں! کیونکہ یہ اس کی صنعت اور اس کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ بلکہ تصویر مصوّر کے مانند بھی نہیں ہوسکتی۔ اگر تصویر مصوّر کی مانند ہوتی تو خود ہی اپنے آپ کو بنالیتی۔ تصویر خواہ کتنی ہی مکمل ہو تو بھی مصوّر کے مقابلہ میں بالکل ناقص ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عالمِ امکان نقائص کی کان ہے اور خدا کمالات کا سرچشمہ۔ دنیا میں نقائص کا ہونا ہی خدا کے کمالات کی دلیل ہے۔ مثلاً جب تم اِنسان پر نگاہ کرتے ہو تو دیکھتے ہو کہ وہ عاجز ہے۔ یہ مخلوق کا عجز۔ اُس حیّ و قدیر کی قدرت پر دلیل ہے۔ کیونکہ جب تک قدرت نہ ہو عجز متصوّر ہی نہیں ہوسکتا۔ پس مخلوق کا عجز۔ خدا کی قدرت پر دلیل ہے اور جب تک قدرت نہ ہوگی عجز تحقق نہیں پاسکتا۔ اس عجز کے ہونے سے پتہ لگا کہ دنیا میں "قدرت" بھی ہے۔ مثلاً دنیا میں فقر ہے تو لازماً غنا بھی ہے۔ جسکے مقابلہ میں فقر دنیا میں پایا جاتا ہے۔ دُنیا میں جہالت ہے تو لازماً علم بھی ہے۔ تبھی تو جہالت کا ہونا ثابت ہوا۔ اگر علم نہ ہوتا تو جہالت کی تمیز کیونکر ہوتی؟

کیونکہ جہل علم کے نہ ہونے کا نام ہے۔ اگر ہستی نہ ہوتی تو نیستی کا بھی پتہ نہ چلتا۔
یہ بھی مسلّم ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں ایک نظام اور حکم کے ماتحت ہیں جس کی وہ ادنیٰ نافرمانی بھی نہیں کر سکتیں۔ حتیٰ کہ انسان بھی موت، نیند، وغیرہ حالات سے مجبور ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان بعض حالات میں محکوم ہے۔ یہ محکومیت لامحالہ ایک حاکم کا پتہ دیتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ احتیاج ممکنات کے لوازمِ ذاتی میں سے ہے۔ پس اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک غنی ہے۔ جو غنیّ بالذات ہے۔ مثلاً مریض کے ہونے سے تندرست کا ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر تندرست نہ ہوتا تو کوئی سمجھ ہی نہ سکتا کہ مریض کسے کہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ایک حیّ قدیر ہے جو جمیع کمالات کا جامع ہے۔ کیونکہ اگر وہ جامعِ جمیع کمالات نہ ہوتا تو وہ بھی خلق کی مانند ہوتا۔ اسی طرح عالمِ وجود میں چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اپنے بنانے والے کا پتہ دیتی ہے۔ مثلاً یہ روٹی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ سبحان اللہ! چھوٹی چھوٹی چیزوں کی حالت میں ایک ادنیٰ تبدیلی تو یہ ثابت کرتی ہے کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے تو کیا یہ لا انتہا عظیم الشان عالمِ ہستی خود بخود وجود پذیر ہو گیا۔ اور کیا یہ عناصر و مواد کے اپنے ہی فعل سے پیدا ہو گیا ہے؟ یہ خیال کس قدر کھوکھلا اور صریح البطلان ہے۔
یہ موٹی موٹی دلیلیں کمزور عقول کے لئے ہیں۔ لیکن اگر چشمِ بصیرت کھل جائے تو لاکھوں روشن دلائل کا مشاہدہ کرتی ہے۔ جیسے کہ جب انسان اپنے اندر روح کا احساس کر لیتا ہے تو وہ وجودِ روح کی دلیل سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ لیکن جو اشخاص فیضِ روح القدس سے محروم ہیں اُن کے لئے خارجی دلائل کا پیش کرنا ضروری ہے۔

(ج)

دنیا کے لئے مربّی کا ہونا ضروری ہے

ہم جب موجودات کو دیکھتے ہیں تو مشاہدہ کرتے ہیں کہ وجودِ جمادی اور وجودِ نباتی اور وجودِ حیوانی اور وجودِ انسانی سب کے سب مربّی کے محتاج ہیں۔ اگر کسی زمین کا کوئی مربّی نہ ہو تو جنگل بن جاتی ہے اور اس میں بے کار گھاس سی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی کسان ہو اور اس میں زراعت کرے تو ڈھیروں اناج جانداروں کی خوراک کے لئے پیدا ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زمین کسان کی تربیت کی محتاج ہے۔

درختوں کو دیکھئے۔ اگر بے مربی رہتے ہیں تو بے ثمر ہو جاتے ہیں۔ اور بے ثمر درخت بے فائدہ ہیں لیکن اگر زیرِ تربیت آتے ہیں تو وہی بے ثمر درخت پھلدار ہو جاتے ہیں اور کڑوے پھل دینے والے درخت تربیت اور ترکیب اور پیوند کے سبب میٹھے پھل دینے لگتے ہیں۔ یہ عقلی دلائل ہیں۔ آجکل اہل عالم کو عقلی دلائل کی ضرورت ہے۔

اِسی طرح حیوانات کو دیکھئے کہ تربیت سے حیوان ہِل جاتا ہے۔ گھریلو ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان بے تربیت رہ جاتا ہے حیوان بن جاتا ہے۔ بلکہ اگر اُسے اُس کی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے۔ اور اگر تربیت کی جائے تو فرشتہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر حیوان اپنی جنس کو نہیں کھاتے لیکن سوڈان اور وسط افریقہ میں حبشی آدمی اپنی ہی جنس کو پھاڑتے اور کھاتے ہیں۔ پس دیکھئے کہ یہ تربیت ہی ہے جو مشرق و مغرب کو انسانیت کے سایہ تلے لاتی ہے۔ یہ تربیت ہی ہے کہ اِن عجیب و غریب صنعتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ تربیت ہی ہے جو اِن علوم و فنون کو رائج کرتی ہے۔ یہ تربیت ہی ہے جو اِن سب نئی ایجادوں اور نئے قوانین کو نمودار کر رہی ہے۔ اگر مربی نہ ہوتا تو راحت و مدنیت و انسانیت کے اِس قدر اسباب کسی طرح بھی فراہم نہ ہوتے۔ اگر ایک انسان کو ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے جہاں اُسے اپنی جنس کے افراد دیکھنے میں نہ آئیں تو کچھ شبہ نہیں کہ وہ بالکل حیوان بن جائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ مربی لازم ہے۔

لیکن تربیت تین قسم کی ہے۔

(۱) تربیتِ جسمانی

(۲) تربیتِ انسانی

(۳) تربیتِ رُوحانی

تربیتِ جسمانی اِس جسم کی نشو و نما کے لئے ہے۔ اور وہ زندگی کو آسانی سے گذارنا اور راحت و فراغت کے اسباب کا فراہم کرنا ہے۔ اس میں انسان و حیوان دونوں شریک ہیں۔

تربیتِ انسانی سے مراد تمدن و ترقی ہے جیسی سیاست تنظیم۔ بہبودی و تجارت صنعت و حرفت۔ علوم و فنون۔ بڑی بڑی ایجادیں اور عظیم الشان قوانین کا ایجاد کرنا ہے۔ یہ انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہیں۔

تربیت روحانی تربیتِ ملکوتی ہے۔ اِس سے کمالاتِ الٰہیہ کا حاصل کرنا مراد ہے اور یہی حقیقی تربیت ہے۔ کیونکہ اس مقام میں انسان فیوضاتِ رحمٰن کا مرکز اور "لنعملن انساناً علیٰ صورتنا و مثالنا" کا

مظہر بن جاتا ہے (یعنی خدا فرماتا ہے کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائینگے) عالمِ انسانی کا انتہائی ثمرہ یہی ہے۔"

اب ہمیں ایک ایسے مُربّی کی ضرورت ہے جو مُربّی جسمانی بھی ہو۔ مربّی انسانی بھی ہو اور مُربّیِ رُوحانی بھی ہو۔ جس کا حکم کُل حالتوں میں نافذ ہو۔ اگر کوئی کہے کہ میں عقل اور سمجھ میں مکمّل ہوں اور میں ایسے مُربّی کا محتاج نہیں تو وہ مُنکرِ بدیہیات ہے۔ اور اُس بچّے کی مانند ہے جو کہے کہ میں تربیت کا محتاج نہیں۔ میں اپنی عقل و فکر کے مطابق چلونگا اور کمالاتِ وجود کو حاصل کرلوں گا یا اُس اندھے کی مانند ہے جو کہے کہ میں آنکھوں کا محتاج نہیں۔ کیونکہ بہت سے اندھے ہیں جو گذارہ کر رہے ہیں۔

پس صاف صاف دِکھائی دیتا ہے کہ انسان مُربّی کا محتاج ہے۔ اور یہ مُربّی بھی بے شک و شبہ ایسا ہونا چاہئے جو کُل مراتب میں سب انسانوں سے کامل و ممتاز ہو۔ کیونکہ اگر وہ بھی اور انسانوں کی طرح ہو تو مربّی نہیں ہو سکتا۔ علی الخصوص اُسے مُربّیِ جسمانی بھی ہونا چاہئے اور مُربّیِ انسانی و مُربّی روحانی بھی۔ یعنی وہ انسانوں کو ایسی تربیت دے جس سے لوگ اُمورِ جسمانی کا انتظام و اجراء کرسکیں۔ وہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ قائم کرے تاکہ روزانہ زندگی میں باہمی امداد و تعاون حاصل ہو اور اُمورِ جسمانی تمام صورتوں میں تنظیم و ترتیب پائیں۔ اِسی طرح وہ تربیتِ انسانی کی بُنیاد رکھ سکے۔ یعنی عقول و افکار کو ایسی تربیت دے کہ کامل ترقی کے قابل ہو جائیں اور علوم و معارف وسعت پائیں۔ اشیاء کے حقائق۔ کائنات کے اسرار اور موجودات کے خواص منکشف ہوں۔ تعلیمات۔ قوانین اور ایجادیں روز بروز بڑھتی جائیں۔ محسوسات سے استدلال کرکے معقولات کی طرف منتقل ہونا جاری ہو جائے۔

اِسی طرح اُسے تربیتِ روحانی بھی کرنی چاہئے۔ تاکہ عقول و ادراک اُس عالَم تک رسائی پائیں جو طبیعت سے بالا ہے۔ روح القدس کے پاک نفحات سے فیض پائیں۔ اور ملأ اعلیٰ سے ارتباط حاصل کریں۔ انسانی حقائق فیوضاتِ رحمٰن کے مظاہر بنیں۔ حتیٰ کہ کُل اسماء و صفاتِ الٰہی حقیقتِ انسان کے آئینہ میں جلوہ نما ہوں۔ اور آیۂ مبارکہ "لنعملن انسانًا علیٰ صورتنا ومثالنا" واقعہ بن کر ظہور پذیر ہو۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ بشری قوی ایسے عظیم اَمر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ صرف غور و فکر ایسے بڑے کام کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ ایک تنِ تنہا شخص کس طرح بے ناصر و مددگار اتنی بڑی بلند بنیاد قائم کرسکتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ خدائی قوّۃ روحانی تائید عطا کرے تاکہ وہ اس کام کو نباہ سکے۔ ایک نفسِ پاک تن تنہا عالمِ انسانی کو زندہ کرتا ہے اور کُرّۂ زمین کی حالت کو بدل دیتا ہے۔ عقول کو ترقی بخشتا ہے۔ اور نفوس کو زندہ کرتا ہے

ایک جدید زندگی کی بُنیاد ڈالتا ہے اور نئے اصول جاری کرتا ہے۔ دُنیا کو درس تنظیم دیتا ہے۔ قوموں اور اُمتوں کو ایک جھنڈے تلے لاتا ہے۔ لوگوں کو نقائص اور رذائل سے چھڑا کر فطرتی اور اکتسابی کمالات کے حاصل کرنے کا شوق و جوش دلاتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ایسی قوت خدائی قوت ہے جو ایسے بڑے کام سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔

ذرا انصاف کیجئے کہ ایک کام جسے کُل حکومتیں اور دنیا کی تمام اقوام اس قدر طاقت اور افواج کے ہوتے ہوئے جاری نہیں کرسکتیں اُسے ایک نفسِ مقدس بے یار و مددگار جاری کرتا ہے۔ کیا یہ انسانی قوت سے ممکن ہے؟ لا واللہ۔ مثلاً حضرت مسیح نے تنِ تنہا صُلح و صلاح کے جھنڈے کو بلند کیا۔ حالانکہ سب زبردست بادشاہتیں اپنی کُل افواج کے ساتھ بھی اس کام کے کرنے سے عاجز ہیں۔ دیکھئے کس قدر مختلف حکومتیں اور ملتیں تھیں۔ روما۔ فرانس۔ جرمنی۔ روس۔ انگریز اور دیگر اقوام جو سب ایک خیمے تلے آگئیں۔ مقصد یہ کہ ظہور حضرت مسیح اِن اقوام مختلفہ میں اُلفت کا ذریعہ ہوا۔ یہانتک کہ ان مختلف اقوام میں سے جو مسیح پر ایمان لائیں بعض میں ایسی باہمی محبت ہوئی کہ ایکدوسرے پر جان و مال نثار کردیا۔ یہانتک کہ زمانہ قسطنطین میں جو حضرت مسیح کے دین کا سب سے بڑا حامی تھا اور اس کے بعد کچھ عرصہ گذرنے کے بعد مختلف وجوہات سے اختلاف پیدا ہوگیا۔ مقصد یہ ہے کہ حضرت مسیح نے ان قوموں کو جمع کردیا۔ مگر ایک مُدت کے بعد پھر بادشاہ اختلاف کے موجب ہوئے۔ ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ حضرت مسیح نے ایسے کام کئے جنھیں کُل دُنیا کے بادشاہ مِل کر بھی کرنے سے عاجز تھے۔ کیونکہ آپ نے مختلف اقوام کو متحد کیا اور عاداتِ قدیم کو بدل دیا۔ خیال کیجئے کہ رومیوں۔ یونانیوں۔ شامیوں۔ مصریوں۔ فینوشیوں۔ اسرائیلیوں اور سب اقوامِ یورپ کے درمیان کس قدر اختلاف تھا۔ حضرت مسیح نے اِن اختلافات کو مٹا دیا۔ اور اِن تمام اقوام کے درمیان محبت کا سبب ہوئے۔ اگرچہ کچھ مُدت کے بعد سیاسی ریشہ دوانیوں نے اِس اتحاد کو درہم برہم کردیا۔ مگر حضرت مسیح نے اپنا کام پوری طرح کیا۔

مقصد یہ ہے کہ مُربی کامل کے لئے مُربیِ جسمانی و مُربیِ انسانی ہو مُربیِ روحانی ہونا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اُسے ایک ایسی قوت کا مالک ہونا بھی ضروری ہے جو عالمِ طبیعت سے بالا ہو۔ تاکہ وہ خدائی مُعلّم کے مقام کو حاصل کرے۔ اِس قوتِ قدسیہ کے بغیر کوئی بھی لوگوں کی تربیت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جو خود ناقص ہے وہ کمال آفریں تربیت کس طرح کرسکتا ہے؟ مثلاً اگر کوئی نادان ہو تو وہ دوسروں کو کیسے دانا بناسکیگا؟ اگر خود ظالم ہو تو دوسروں کو کیسے عادل بناسکیگا۔ اگر خود ناسوتی ہو تو دوسروں کو کیسے ملکوتی بناسکیگا۔ اب ہمیں انصاف سے دیکھنا چاہیئے کہ یہ مظاہر الٰہی جو آچکے ہیں کیا وہ سب ان صفات سے

متصف تھے یا نہیں؟ اگر وہ اِن صفات و کمالات کے مالک نہ تھے تو مربیِ حقیقی بھی نہ تھے۔

پس ہمیں چاہیئے کہ ہم عقلمندوں کے لئے عقلی دلائل سے حضرت موسیٰ حضرت مسیح اور دوسرے سب مظاہرِ الٰہی کی نبوّت کو ثابت کریں۔ یہ براہین و دلائل جو ہم پیش کر رہے ہیں سب کے سب عقلی ہیں نقلی نہیں۔ یہ بات تو پورے پورے عقلی دلائل سے ثابت ہوگئی کہ دُنیا میں مُربّی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور جو تربیت وہ کرے وہ قوّتِ قدسیہ سے حاصل ہونی چاہیئے۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ قوّتِ قدسیہ وحی ہے اور اِس قوّت سے جو قوّتِ بشری سے بالا ہے لوگوں کا تربیت پانا لازم ہے۔

(۷)

حضرت ابراہیم

اِس قوّت کے مالک اور اِس سے مؤیّد ہونے والوں میں سے ایک حضرت ابراہیم تھے۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم عراق کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو وحدانیتِ الٰہی سے بالکل بے خبر تھا۔ آپ نے اپنی قوم و حکومت حتّٰی کہ اپنے گھر والوں کی مخالفت کی۔ اُن کے تمام دیوتاؤں کا رَد کیا۔ اور تن تنہا ایک طاقتور قوم کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ یہ مخالفت و مقاومت آسان نہ تھی یہ ایسا ہے جیسے آجکل کوئی شخص عیسائیوں کے سامنے جو تورات و انجیل کو مانتے ہیں حضرت مسیح کا رَد کرے یا دربارِ پوپ میں استغفر اللہ حضرت مسیح کو گالی دے اور سب کا مقابلہ کرتے ہوئے نہایت اقتدار سے چلتا پھرتا رہے۔

اُن لوگوں کا ایک خدا نہ تھا۔ بلکہ وہ بہت سے خداؤں کے ماننے والے تھے۔ اور اُن کے بارے میں معجزے بھی نقل و روایت کیا کرتے تھے۔ اس لئے سب کے سب حضرت ابراہیم کے خلاف کھڑے ہوگئے سوائے آپ کے بھتیجے حضرتِ لوط کے اور کسی نے آپ سے موافقت نہ کی۔ ہاں۔ ایک دو شخص اور تھے جن کا شمار مفلسوں میں تھا۔ آخرکار اپنے دشمنوں کی شدّتِ عداوت سے تنگ آکر حضرت ابراہیم نے اپنے وطن کو خیرباد کہا۔ اور فی الحقیقت دشمنوں نے آپ کو اِس لئے جلاوطن کیا تھا کہ حضرت ابراہیم نیست و نابود ہو جائیں اور اُن کا کچھ نشان باقی نہ رہے۔ حضرت ابراہیم اِس مُلک میں جو ارضِ مقدس ہے تشریف لائے۔ آپ کے دشمنوں نے

یہ سمجھا تھا کہ یہ جلاوطنی آپ کی بربادی اور تباہی کا سبب ہوگی۔ اور فی الحقیقت اگر ایک شخص کو وطن سے نکال دیا جائے اور اُسے تمام حقوق سے محروم کرکے ہر طرح سے اُس پر ظلم کیا جائے تو خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو مٹ جائے گا۔ مگر حضرت ابراہیم ثابت قدم رہے اور غیر معمولی استقامت سے کھڑے رہے۔ خدا نے آپ کی اِس غربت کو عزّتِ اَبدی میں بدل دیا۔ یہانتک کہ آپ نے وحدانیتِ الٰہی کو قائم کیا۔ ورنہ تمام لوگ بُت پرست تھے۔ اِس ہجرت کے سبب ابراہیم کی نسل نے ترقی کی۔ اِسی ہجرت کے سبب ارضِ مقدس ابراہیم کے خاندان کو دی گئی۔ اِسی ہجرت کے سبب حضرت ابراہیم کی تعلیمات پھیل گئیں۔ اِسی ہجرت کے سبب اولادِ ابراہیم سے یعقوبؑ پیدا ہوئے۔ یوسفؑ ظاہر ہوئے جو مصر کے حاکم بنے۔

اِسی ہجرت کے سبب اولادِ ابراہیم سے موسیٰؑ جیسے پیغمبر ظاہر ہوئے۔ اِسی ہجرت کے سبب حضرت مسیح جیسا وجود خاندانِ ابراہیم سے پیدا ہوا۔ اِسی ہجرت کے سبب ہاجرہ ملی اور جس سے اسمٰعیل اور اُن کی اولاد سے حضرت محمدؐ ظاہر ہوئے۔ اِسی ہجرت کے سبب آپ کی اولاد سے حضرتِ اعلیٰ (باب) ظاہر ہوئے۔ اِسی ہجرت کے سبب تمام انبیائے بنی اسرائیل ابراہیم سے ظاہر ہوئے۔ اور اِسی طرح ابدالآباد تک جاری رہے گا۔

اِسی ہجرت کے سبب تمام یورپ اسرائیل کے خُدا کے زیر سایہ آیا اور ایشیا کے اکثر حصّے اِس سایہ میں وارد ہوئے۔ دیکھئے کیا قدرت ہے۔ ایک جلاوطن شخص ایک ایسا خاندان قائم کرتا ہے۔ ایک ایسی قوم کھڑی کرتا ہے اور ایسی تعالیم جاری فرماتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب اتفاقاً واقع ہوا۔ پس انصاف کیجئے۔ کیا یہ شخص مُربّی تھا یا نہیں؟ اَب ذرا سوچئے کہ ہجرتِ ابراہیمی جو صِرف حلب سے مُلکِ شام کو ہوئی اُس سے کیا کیا نتیجے نکلے۔ تو پھر ہجرتِ جمالِ مُبارک (حضرتِ بہاءاللہ) سے جو طہران سے بغداد۔ بغداد سے اسلامبول۔ اسلامبول سے رومیلیہ۔ رومیلیہ سے ارضِ مقدس کو ہوئی کیا کیا نتائج ظاہر ہونگے۔ پس دیکھئے کہ حضرت ابراہیم کیسے کامل مُربّی تھے۔

(ھ)

حضرتِ موسیٰؑ

حضرتُ موسیٰ مُدّت دراز تک صحرا میں گلہ بانی کرتے رہے۔ اور ظاہراً ایک ایسے شخص تھے جس کی پرورش ایک ظالم خاندان میں ہوئی تھی۔ لوگوں میں آپ ایک قاتل مشہور تھے۔ اور گلہ بان

رہ چکے تھے۔ اور فرعون کے عمائدِ سلطنت و ارکانِ ملّت ان سے کینہ رکھتے تھے اور بے حد ناراض تھے۔ ایسے شخص نے ایک بڑی قوم کو قید سے آزاد کرایا۔ اور مصر سے نکال کر ارضِ مقدس پہنچایا۔ وہ لوگ جو حد درجہ کی ذلّت میں تھے انتہائی عزّت تک پہنچے۔ اسیر تھے آزاد ہو گئے۔ قوموں میں جاہلترین تھے عالمترین بن گئے۔ آپ کی تعلیمات نے اُنھیں اِس درجہ تک پہنچایا کہ تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہو گئے۔ ان کی شہرت تمام عالم میں پھیل گئی۔ یہانتک کہ آس پاس کی اقوام اگر کسی شخص کی تعریف کرنا چاہتی تھیں تو کہتی تھیں یقیناً یہ شخص اسرائیلی ہے۔ حضرت موسیٰ نے ایک ایسی شریعت و قانون کی بنا ڈالی جس نے قوم اسرائیل کو زندہ کر دیا۔ اور یہ قوم اپنے زمانہ کی اعلیٰ ترین متمدن قوم بن گئی۔ یہانتک کہ علمائے یونان آ کر فضلائے اسرائیل سے تحصیلِ کمالات کرتے تھے۔ مثلاً سقراط شام میں آیا۔ اور وحدانیت اور حیاتِ بعدالموت کی تعلیم بنی اسرائیل سے حاصل کر کے یونان کو واپس گیا۔ اور وہاں اِس تعلیم کو پھیلانے لگا۔ اہلِ یونان نے اس کی مخالفت کی۔ اور اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔ مجلسِ عدالت میں اُسے حاضر کیا اور آخر اُسے زہر دے دیا۔

اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جس کی زبان میں لکنت تھی فرعون کے گھر میں پل کر بڑا ہوا۔ لوگوں میں قاتل کے نام سے مشہور تھا۔ اور ایک مدّت مدید تک خوف سے روپوش ہو کر گلہ بانی کرتا رہا۔ ایسا شخص آئے اور ایسے امرِ عظیم کی دُنیا میں بُنیاد ڈالے کہ دُنیا کا بڑے سے بڑا فلاسفر اُس کا ہزارواں حصہ بھی قائم کرنے کی توفیق نہ پا سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ خارق العادت بات تھی۔ وہ انسان جس کی زبان میں لکنت ہو۔ اور جو معمولی بات چیت بھی ٹھیک طور سے نہ کر سکے وہ کس طرح ایسے بڑے امر کو کامیابی سے نباہ سکتا ہے؟ یقیناً اگر ایسے شخص کی خدائی قوّت تائید نہ کرتی تو وہ کبھی بھی اِس امرِ عظیم کو قائم نہ کر سکتا۔ یہ ایسی دلیلیں ہیں کہ اِن کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ علمائے سائنس۔ فلاسفۂ یونان۔ مشاہیرِ روم شہیرِ آفاق ہوئے با اینہمہ ہر ایک نے صرف ایک خاص فن میں کمال حاصل کیا تھا۔ مثلاً جالینوس اور بقراط نے معالجات میں ارسطو نے منطق و نظریات میں۔ افلاطون نے اخلاق و الٰہیات میں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چوپان آدمی اِن سب عُلوم و فنون کی بُنیاد ڈالے؟ بیشک یہ شخص ایک خارق العادت قوّت سے مؤیّد تھا۔

مُلاحظہ کیجئے۔ لوگوں کے لئے کس قدر امتحان و آزمایش کے اسباب فراہم ہوتے ہیں۔ حضرتِ موسیٰ نے ظلم کو روکنے کے لئے ایک شخصِ قبطی کے گھونسہ مارا۔ اور آپ قاتل کے نام سے لوگوں میں مشہور ہو گئے چونکہ مقتول حاکم قوم میں سے تھا۔ اس لئے آپ کو فرار ہونا پڑا۔ اس کے بعد نبوّت پر مبعوث ہوئے۔ اِس بدنامی کے ہوتے ہوئے آپ ایک خارق العادت قوّت کی مدد سے بڑی بڑی بُنیادیں اور عظیم الشان قوانینِ شریعت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

(۹)

پھر حضرت مسیح آئے اور کہا میں رُوح القدس سے پیدا ہوا ہوں۔ آجکل مسیحیوں کے نزدیک اِس مسئلہ کی تصدیق آسان ہے۔ لیکن اُس وقت نہایت مشکل تھی۔ انجیل میں بھی صاف لکھا ہے کہ فریسی کہتے تھے کیا یہ یوسف ناصری کا بیٹا نہیں؟ جسے ہم پہچانتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح کہتا ہے کہ میں آسمان سے آیا ہوں۔ المختصر یہ شخص جو سب کی نظروں میں حقیر تھا۔ پھر بھی ایسی قوت کے ساتھ اُٹھا کر پندرہ سو سال کی شریعت کو منسوخ کر دیا۔ حالانکہ اگر کوئی ایک شمّہ بھر بھی اِس شریعت سے تجاوز کرتا تھا تو ایک عظیم الشان خطرے میں پڑ جاتا تھا۔ اور ملیا میٹ ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں حضرت مسیح کے زمانہ میں تمام دُنیا کے اخلاق اور بنی اسرائیل کے حالات نہایت گندے اور بگڑے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل نہایت ذلت و خواری و قید میں اسیر تھے۔ کبھی ایران و کلدان کے اسیر ہوتے تھے۔ کبھی آشوریوں کے محکوم اور غلام بنتے تھے۔ کبھی یونان کی رعایا اور تابع فرمان ہوتے اور کبھی رومیوں کے مطیع و ذلیل فرمانبردار۔

اِس جوان یعنی حضرت مسیح نے خارق العادت قوت سے پُرانی شریعتِ موسوی کو منسوخ فرمایا۔ اور تمام دنیا کے اخلاق کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا۔ بنی اسرائیل کے لئے ایک دفعہ پھر عزتِ ابدی کی بنیاد ڈالی۔ اور ایسی تعلیمات پھیلائیں جو صِرف بنی اسرائیل کے لئے ہی خاص نہ تھیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کیلئے پوری بہبودی کی بُنیاد تھیں۔

سب سے پہلے جس قوم نے آپ کے مٹانے پر کمر باندھی وہ بنی اسرائیل اور آپ کے قبیلہ کے لوگ تھے۔ اِن لوگوں نے بظاہر آپ کو مغلوب کر لیا اور اپنی طرف سے اُنھوں نے آپ کو بڑی بھاری ذلت میں ڈالا۔ حتّٰی کہ کانٹوں کا تاج آپ کے سر پر رکھا اور صلیب پر چڑھایا۔ مگر اِس شخص جلیل نے اُس وقت جبکہ نہایت ذلت کی حالت میں تھا اعلان کیا کہ یہ آفتاب چمکیگا۔ یہ نور روشن ہوگا۔ یہ میرا فیض تمام دُنیا کو گھیر لیگا اور میرے تمام دشمن سرنگوں ہونگے۔ اور جیسا مسیح نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔

تمام دنیا کے بادشاہ آپ کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بلکہ ان سب کے جھنڈے گر گئے اور اِس مظلوم کا عَلم دُنیا کے بلند ترین مقاموں پر لہرانے لگا۔ کیا انسانی عقل کے کسی قاعدے سے ممکن ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں!

پس صاف ظاہر ہوگیا کہ یہ بزرگوار شخص عالمِ انسانی کا حقیقی مُربّی تھا۔ اور خدائی قوت سے مؤید و موفق تھا۔

(۳)

حضرت محمدؐ

یورپ و امریکہ کے لوگوں نے حضرت محمدؐ کے بارے میں بعض کہانیاں سُنی ہیں۔ اور اُنھیں سچ سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ راوی یا تو جاہل تھے یا دشمن۔ اور اکثر پادری تھے۔ بعض جاہل مسلمانوں نے بھی آپ کی تعریف کے خیال سے بے اصل کہانیاں نقل کی ہیں۔ مثلاً بعض جاہل مسلمانوں نے کثرتِ زوجات کو تعریف کا مدار سمجھا اور اُسے بزرگی قرار دیا۔ کیونکہ ان جاہل لوگوں کے نزدیک زیادہ بیویاں کرنا گویا معجزہ تھا۔ یورپین مورخین نے ایسے ہی جاہل نفوس کے اقوال کو اپنی سند بنایا ہے۔ مثلاً ایک جاہل شخص نے ایک پادری سے کہا کہ بزرگواری کی دلیل زبردست شجاعت و خونریزی ہے۔ اور حضرت محمدؐ کے ایک صحابی نے ایک دن میدانِ جنگ میں سو آدمیوں کے سر تن سے جُدا کر دیئے۔ پادری صاحب کو خیال ہوگیا کہ دینِ محمدؐ کی بُرہان قتل کرنا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ حضرت محمدؐ کی سب لڑائیاں محض دفاعی تھیں۔ جس کی کھُلی دلیل یہ ہے کہ تیرہ سال تک مکّہ میں کیا آپ اور کیا آپ کے دوست و اصحاب نہایت اذیت برداشت کرتے رہے۔ اور تیرِ جفا کا نشانہ بنتے رہے۔ آپ کے بعض دوست مارے گئے۔ ان کے مال و متاع لُٹ گئے۔ بعض اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر چلے گئے۔ خود آنحضرت کو بہت سے دُکھ دے کر آخر آپ کے قتل پر تُل گئے۔ اس لئے آپ نے آدھی رات کو مکّہ سے نکل کر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ بایں ہمہ دشمن جفا کاری سے باز نہ آئے۔ بلکہ حبشہ اور مدینہ تک پیچھا کیا۔

عرب کے قبائل اور خاندان حد درجہ کے وحشی و درندہ تھے۔ اُن کی وحشت اِس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ امریکہ کے وحشی اور جنگلی انسان اُن کے مقابلہ میں افلاطونِ زمانہ تھے۔ کیونکہ امریکہ کے وحشی اپنی اولاد کو زندہ نہیں دباتے تھے۔ مگر یہ اپنی بیٹیوں کو زندہ ہی خاک میں دفن کر دیتے تھے۔ اور فخر یہ کہا کرتے تھے کہ اُن کا یہ کام حمیت پر مبنی ہے۔ اکثر مرد اپنی عورتوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ اگر تو نے بیٹی جنی تو میں تجھے مار ڈالوں گا حتّٰی کہ آج تک عرب بیٹیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک شخص ہزار عورتیں لے سکتا تھا۔ اور اُن میں سے اکثر لوگ اپنے پاس دس دس سے زیادہ عورتیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ جب یہ قبائل آپس میں لڑتے تھے تو جو

قبیلہ غالب ہوتا تھا وہ مغلوب شدہ قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر لیتا تھا۔ اور اُنھیں لونڈی اور غلام سمجھکر ان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ جب کوئی شخص مرجاتا اور دس بیویاں چھوڑ جاتا تو اِن عورتوں کے بیٹے ایک دوسرے کی ماؤں پر قبضہ کر لیتے۔ اِن بیٹوں میں سے اگر کوئی اپنی عبا اپنے باپ کی کسی بیوی کے سر پر پھینک دیتا اور بآوازِ بلند کہدیتا کہ یہ مجھے حلال ہے تو فوراً وہ بیچاری اپنے شوہر کے بیٹے کی اسیر و کنیز ہو جاتی۔ اور جو کچھ وہ چاہتا اپنے باپ کی بیوی سے کرتا۔ خواہ وہ اُسے مار ڈالتا یا کنوئیں میں بند کر دیتا یا روزانہ مارپیٹ اور گالی گلوچ کرتا۔ حتیٰ کہ ایک نہ ایک دن وہ عورت مرجاتی۔ الغرض جو بھی وہ چاہتا تھا کر سکتا تھا۔ از روئے قانونِ عرب وہ مختار تھا۔ ایک شوہر کی عورتوں اور اُن کی اولاد کے درمیان جو دشمنی و کینہ و بغض و عداوت ہوتا ہے وہ معلوم ہی ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ اَب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان مظلوم عورتوں کی کیا حالت اور کیسی زندگی ہوتی ہوگی۔ اِس سے بڑھکر یہ کہ قبائلِ عرب کی گذراوقات ایک دوسرے کے قتل و غارت پر تھی۔ یہ قبائل ہمیشہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو قتل و غارت کیا کرتے۔ مال و متاع لوٹ لیا کرتے۔ عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے غیروں کے پاس بیچ دیا کرتے تھے۔ کتنی دفعہ ایسا واقعہ ہوا کہ ایک امیر کے بیٹے بیٹیاں نہایت ہی ناز و نعمت سے تمام دن گذارتے مگر شام کو نہایت ذلت و حقارت سے قید میں گرفتار ہو کر رات گذارتے۔ کل امیر تھے آج اسیر۔ کل بانو تھیں اور آج کنیز۔ حضرت محمدؐ اِن قبائل میں مبعوث ہوئے اور تیرہ سال تک کوئی بلا اور دُکھ ایسا نہ تھا جو ان قبائل کی طرف سے آپ نے برداشت نہ کیا ہو۔ تیرہ سال کے بعد آپ نے ہجرت فرمائی۔ لیکن اِس قوم نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جمع ہو کر آپ پر لشکر کشی کی۔ اور چاہتے تھے کہ آپ کے ہمراہیوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت یا بچے سب کو نیست و نابود کر دیں۔ جب نوبت یہانتک پہنچی تو حضرت محمدؐ مجبوراً ایسے قبائل سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ ہے حقیقتِ حال۔ ہم تعصب نہیں رکھتے اور نہ ہی حمایت کرتے ہیں۔ بلکہ انصاف سے کہتے ہیں۔ ذرا آپ بھی انصاف کیجئے۔ اگر حضرت مسیح ایسے وقت میں ہوتے اور تیرہ برس تک اپنے سب حواریوں کے ساتھ اِن وحشی قبائل کی ہر جفا کو سہتے اور صبر کرتے۔ حتیٰ کہ اپنے وطنِ مالوف کو چھوڑ کر بیابان میں چلے جاتے۔ پھر بھی اگر وہ وحشی قبائل پیچھا کرتے اور ان کے مردوں کو قتل۔ مال کو غارت اور بیوی بچوں کو اسیر بناتے تو حضرت مسیح اِن قبائل سے کیا سلوک کرتے۔ اِن قبائل کے ظلم اگر حضرت مسیح کی ذات تک ہی محدود رہتے تو آپ درگذر سے کام لیتے۔ اور آپ کا یہ کام نہایت ہی پسندیدہ اور قابلِ تعریف ہوتا۔ پر اگر آپ یہ دیکھتے کہ ایک خونخوار ظالم مظلوموں کی ایک جماعت کے قتل و غارت کرنے کے درپے ہے۔ اور اُن کے بیوی بچوں کے اسیر کرنے پر تُلا ہوا ہے تو یقیناً آپ اِن مظلوموں کی حمایت کرتے

اور اس ظالم کے ظلم کی روک تھام فرماتے۔ پس حضرت محمدؐ پر کیا اعتراض ہے؟ کیا یہ کہ آپ نے اپنے آپ کو مع اپنے دوستوں، عورتوں اور بچوں کے اِن ظالم سرکش قبائل کے ہاتھ میں کیوں نہ دے دیا؟ علاوہ ازیں اِن قبائل کو خونخواری کی عادت سے چھڑانا عین مہربانی تھی۔ اور اِن نفوس کو زجر و توبیخ کرنا سراسر عنایت تھی۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص زہر کا پیالہ ہاتھ میں لئے پینا چاہے اور اُس کا مہربان دوست اُس پیالے کو توڑ دے اور پینے والے کو ڈانٹے۔ اگر ایسے وقت میں حضرت مسیح ہوتے تو وہ بھی نہایت ہی زور سے اُن مردوں، عورتوں اور بچوں کو اِن خونخوار بھیڑیوں سے چھڑاتے۔ حضرت محمد نے مسیحیوں سے کبھی لڑائی نہیں کی۔ بلکہ اُن کی بہت رعایت کی اور اُنھیں پوری پوری آزادی دی۔ مثلاً نجران کے مسیحیوں کے بارہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ جو کوئی انھیں ستائے گا میں اُس کا دشمن ہونگا۔ اور خدا کے سامنے اُس پر دعویدار ہونگا آپ کے حکموں میں یہ حکم صریحاً درج ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا جان و مال و ناموس خدا کی حمایت کے تلے ہے۔ چنانچہ آپ کا حکم ہے کہ اگر شوہر مسلمان ہو اور بیوی مسیحی۔ تو شوہر بیوی کو گرجا جانے سے منع نہیں کرسکتا۔ نہ اُسے پردہ کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ مرنے پر اُس کی نعش کو اُسے پادری کے حوالے کرنا ہوگا۔ اگر مسیحی گرجا بنانا چاہیں تو مسلمانوں کو اُن کی اعانت کرنی چاہئے۔ جنگ کے وقت حکومتِ اسلام مسیحیوں کو لڑائی میں کام کرنے سے معاف رکھے۔ ہاں اگر وہ اپنی مرضی سے لڑنا اور اِسلام کی مدد کرنا چاہیں تو وہ کرسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی حمایت و حفاظت میں ہیں۔ اس معافی کے بدلے اُنھیں ہر سال کچھ تھوڑا سا معاوضہ دینا ہوگا۔ الغرض سات مفصل حکمنامے ہیں۔ اُن میں سے بعض کی نقلیں اِس وقت بھی بیت المقدس یروشلیم میں موجود ہیں۔ یہ حقیقتِ واقعی ہے۔ اِسے میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ یروشلم میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر کا فرمان آرتھوڈکس کے پاس موجود ہے۔ اِس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔

کچھ مدت کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں دشمنی و عداوت پیدا ہوگئی۔ زیادتی دونوں طرف سے ہوئی۔ المختصر اِس حقیقتِ حال کے سوا جو کچھ مسلمان و مسیحی وغیرہ کہتے ہیں وہ محض قصے کہانیاں ہیں۔ اُن باتوں کا منشاء یا تو تعصب و جہالت ہے یا دشمنی و عداوت کی شدت۔ مثلاً مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ نے شق القمر کیا اور چاند مکہ کی پہاڑی پر گرا۔ اُن کے خیال میں چاند ایک چھوٹا سا جسم ہے جسے حضرت محمدؐ نے دو ٹکڑے کیا۔ ایک ٹکڑا تو اِس پہاڑ پر جا گرا اور دوسرا اُس پہاڑ پر۔ یہ کہانی محض تعصب سے پیدا ہوئی ہے۔ اِسی طرح وہ قصے جو پادری حضرت محمدؐ کی مذمت میں روایت کیا کرتے ہیں سب جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت محمدؐ عرب کے لق دق بیابان بلکہ ریگستان یعنی صحرائے حجاز میں ظاہر ہوئے۔

اِس صحرا میں آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ جہاں کچھ لوگ بستے بھی تھے مثلاً مکہ و مدینہ وہاں سخت گرمی پڑتی تھی۔ وہاں کے باشندے بادیہ نشین تھے۔ جن کے عادات و اطوار صحرائی وحشیوں کے سے تھے۔ علوم و معارف سے بالکل بے بہرہ۔ حتیٰ کہ خود حضرت محمدؐ اُمّی تھے۔ قرآن کو بکری کے شانہ کی ہڈی یا کھجور کے پتوں پر لکھتے تھے۔ اِس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کی حالت کیا تھی؟ حضرت محمدؐ ایسے لوگوں میں مبعوث ہوئے۔ اور پہلا اعتراض جو آپ نے اُن پر کیا وہ یہ تھا کہ تم نے تورات و انجیل کو کیوں قبول نہیں کیا۔ عیسیٰ اور موسیٰ پر کیوں ایمان نہیں لائے؟ یہ بات اُنھیں بہت بُری لگی۔ پوچھنے لگے ہمارے باپ دادا جو تورات اور انجیل کے مومن نہ تھے اُن کا کیا حال ہوگا۔ فرمایا وہ گمراہ تھے۔ تم کو چاہئے کہ تم اُن لوگوں سے جو تورات اور انجیل کے مُومن نہیں، علیحدگی اختیار کرو خواہ وہ تمھارے باپ دادا ہی ہوں۔

ایسے مُلک میں اِن وحشی قبائل کے درمیان ایک اُمّی شخص ایک ایسی کتاب لایا۔ جس میں صفات و کمالاتِ خدائی۔ نبوّتِ انبیا۔ شرائعِ الٰہیہ اور بعض عُلوم اور علمی مسائل کو نہایت فصاحت و بلاغت سے بیان فرمایا ہے۔ ازاں جملہ آپ جانتے ہیں کہ آخری مشہور و معروف منجّم سے پہلے یعنی اوّل صدی مسیحی سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک تمام علمارِ ریاضی کی متفقاً یہ رائے تھی کہ زمین مرکز ہے اور سورج اُس کے گِرد حرکت کرتا ہے۔ اِس آخری منجّم نے ایک نئی رائے قائم کی۔ یعنی زمین کی حرکت اور سورج کے سکون کا پتہ لگایا۔ اُس کے زمانہ تک تمام دُنیا کے فلاسفر اور ریاضی داں قواعدِ بطلیموس کے پیرو تھے۔ اگر کوئی بطلیموس کی رائے کے خلاف ایک کلمہ بھی کہتا تو اُسے جاہل بتاتے اور نادان ٹھہراتے۔ اگر فیثا غورث اور افلاطون نے اپنے آخری ایام میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ منطقۃ بروج میں آفتاب کی سالانہ حرکت کا سبب آفتاب نہیں۔ بلکہ یہ زمین کے آفتاب کے گرد گھومنے سے ہے۔ مگر یہ رائے مفقود ہو چکی تھی۔ اور بطلیموس کی رائے سب اہلِ ریاضی کے نزدیک مسلّم تھی۔ مگر قرآن میں بطلیموس کی رائے کے خلاف آیات نازل ہیں۔ ازانجملہ آیۂ مبارکہ وَالشَّمْسُ تَجْرِی لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (سورۂ یٰسین) (یعنی سورج اپنے مقامِ مستقر پر ہی گھومتا ہے) جو آفتاب کے ایک جگہ ٹھہرنے اور اپنے محور پر گھومنے کا علم دیتی ہے۔ اور اِسی طرح آیۂ مُبارکہ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (سورۂ یٰسین) یعنی ہر ایک اپنے گھیرے میں گھومتا ہے) اِس سے سورج۔ چاند۔ زمین اور سب ستاروں کی حرکت کی تصریح ہوتی ہے۔ جب قرآن نے اِن باتوں کو پھیلایا تو سب ریاضی داں مذاق اُڑانے لگے اور اِس رائے کو جہالت پر محمول کرنے لگے۔ یہاں تک کہ علمائے اسلام نے بھی جب اِن آیات کو بطلیموسی مسلّمہ قواعد کے خِلاف دیکھا تو تاویل کرنے لگے۔ حتیٰ کہ پندرھویں صدی مسیحی میں حضرت محمد کے قریب نو سو سال بعد مشہور ریاضی داں (گیلیلیو) نے ٹیلسکوپ ایجاد کی۔ اور بڑی بڑی اہم باتیں ظاہر ہوئیں اور زمین کی حرکت اور آفتاب کا سکون ثابت ہوا۔ آفتاب کی حرکتِ محوری بھی صحیح نکلی۔ اور یہ واضح ہوگیا کہ

آیاتِ قرآن صریح طور پر حقیقت کے مطابق ہیں۔ اور بطلیموس کے قواعد صرف اوہام ہیں۔ مختصر یہ کہ مشرق کی بہت سی اقوام نے تیرہ سو سال تک شریعتِ محمدیہ کے سایہ تلے پرورش پائی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں جب یورپ حد درجہ کے توحش میں تھا، قومِ عرب علوم و فنون، صنعت و حرفت خصوصاً ریاضی، تمدن اور سیاست و دیگر فنون میں سب دنیا میں بڑھی ہوئی تھی۔ بادیۂ عرب کے قبیلوں کا محرک و مربی اور ان مختلف جماعتوں میں تمدن اور کمالاتِ انسانیت کا پیدا کرنے والا ایک اُمّی شخص یعنی حضرتِ محمدؐ تھے۔ کیا یہ محترم وجود سب کا مربیِ کامل تھا یا نہیں؟ انصاف چاہیے۔

(ح)

حضرتِ اعلیٰ (باب)

حضرت اعلیٰ روحی لہ الفداء نے عین عالمِ جوانی میں یعنی جب آپ کی عمر مبارک کے پچیس سال گذرے تھے اپنے امر کا اعلان فرمایا۔ شیعیوں میں عموماً یہ مسلّم ہے کہ آپ نہ تو کسی مدرسہ میں داخل ہوئے اور نہ ہی کسی شخص سے علم حاصل کیا۔ اِس بات کے گواہ سب اہلِ شیراز ہیں۔ باوجود اِس کے آپ یکدم انتہائی علم و فضل کے ساتھ لوگوں میں ظاہر ہوئے۔ حالانکہ آپ تاجر تھے۔ مگر تمام علمائے ایران آپ کے سامنے عاجز تھے۔ آپ نے تنِ تنہا ایک ایسے امر پر قیام فرمایا جس کا تصور بھی محال تھا۔ کیونکہ اہلِ ایران تعصّبِ دینی میں شہرہ آفاق تھے۔ آپ ایسی قوت سے کھڑے ہوئے کہ ایران کی شریعت و آداب و اطوار۔ اخلاق و رسوم کے ارکان کو ہلا دیا۔ اور نئی شریعت۔ نئے دین اور نئے آئین کی بنیاد ڈالی۔ باوجودیکہ ارکانِ دولت اور عمومِ ملت و رؤسای دین سب کے سب آپ کے مٹانے پر کمربستہ ہوئے۔ مگر آپ نے تنِ تنہا اُن کا سامنا کیا اور تمام ایران کو ہلا دیا۔ کتنے ہی علما و روسا، و معززین نے کمال مسرت و شادمانی سے آپ کی راہ میں جانیں قربان کیں۔ اور میدانِ شہادت کی طرف دوڑے۔ حکومت و ملت و علمائے دین اور امرائے قوم نے چاہا کہ آپ کے چراغ کو خاموش کر دیں۔ مگر نہ کر سکے۔ آخر کار آپ کا چاند بلند ہوا۔ اور آپ کا ستارہ چمکا۔ آپ کا دین مستحکم ہوا۔ اور آپ کا مطلع پُر انوار بنا۔

آپ نے ایک جمِ غفیر کو خدائی تربیت دی۔ اور ایرانیوں کے افکار و اخلاق و اطوار و احوال میں

ایک عجیب تاثیر ظاہر فرمائی۔ آپ نے اپنے تمام تابعین کو شمس بہا، کے ظہور کی بشارت دی اور اُنھیں اُس پر ایمان لانے کے لئے مستعد بنایا۔

ایک نوجوان تاجر سے ایسے عجیب آثار اور عظیم نتائج کا ظاہر ہونا عوام کے خیالات میں ایسی عظیم تبدیلی کا پیدا ہونا۔ اساسِ ترقی کا قائم کرنا۔ فلاح و کامیابی کی راہوں کا کھُلنا۔ اس بات کی بڑی بھاری دلیل ہے کہ یہ شخص مُربیِ کامل تھا۔ انصاف پسند لوگ آپ کے ماننے میں ذرا بھی تامّل نہیں کرتے۔

(ط)

حضرتِ بہاء اللہ

حضرت جمالِ مُبارک اُس زمانہ میں ظاہر ہوئے جب کہ مملکتِ ایران ظلمت و نادانی میں غرق اور حد درجہ کے تعصّب جاہلانہ میں منہمک تھی۔ اِس زمانہ کے ایرانیوں کے حالات و اخلاق یورپ کی تواریخ میں مفصل درج ہیں۔ جو آپ نے ضرور پڑھے ہونگے۔ یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ایرانی اِس درجہ انحطاط تک پہنچ گئے تھے کہ تمام اجنبی سیّاح افسوس کیا کرتے تھے کہ یہ مُلک جو پہلے تمدّن اور بزرگی کے اوج پر تھا آج اِس قدر گرا ہوا اور ویران اور منہدم ہے۔ اور اس کے باشندے درجۂ حیوانیت تک پہنچ گئے ہیں۔

القصّہ جمالِ مُبارک ایسے وقت میں ظاہر ہوئے۔ آپ کے والد وزرا، میں سے تھے۔ علما، میں سے نہ تھے۔ تمام اہلِ ایران میں یہ مُسلّم ہے کہ آپ نے کسی مدرسہ میں علم نہیں سیکھا۔ اور نہ کبھی آپ علما، و فضلا، کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ بچپن کا زمانہ نہایت خوشی و شادمانی سے گذرا۔ آپ کے ہم صحبت عُلما، نہیں۔ بلکہ عمائدِ ایران تھے۔ جوں ہی حضرتِ باب نے اظہارِ امر فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شخص بزرگوار بے شک سیّدِ ابرار ہے۔ اس پر ایمان لانا سب کے لئے لازم ہے۔ اُسی وقت سے آپ حضرتِ باب کی نصُرت پر کمربستہ ہوگئے۔ اور آپ کی سچّائی کے ثبوت میں اٹل براہین اور فیصلہ کُن دلیلیں دینے لگے باوجودیکہ علمائے ایران کے ورغلانے اور مجبور کرنے پر دولتِ علیّہ ایران سخت مخالفت پر کھڑی ہوگئی۔

اور تمام علماء نے قتل و غارت و اذیت کا فتویٰ دیا۔ اور ملک بھر میں لوگ بابیوں کو مارنے اور آگ میں جلانے لگے۔ حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کو بھی ستانے لگے۔ پھر بھی حضرت بہاء اللہ کمال استقامت و متانت سے حضرتِ باب کے کلمہ کو بلند کرنے پر قائم رہے۔ ایک پل بھر کے لئے بھی پوشیدگی اختیار نہ کی۔ دشمنوں میں کھلم کھلا مشہور تھے اور دلائل و براہین دینے میں ہر وقت مشغول تھے۔ اعلائی کلمۃ اللہ کے لئے معروف ہوئے اور بار بار شدید صدمات کے شکار ہوئے۔ ہر دم قتل کئے جانے کے خطرہ میں تھے گرفتار زنجیر کئے گئے۔ ایک زمین دوز قید خانے میں قید کئے گئے۔ اور آپ کی وسیع موروثہ جائداد کو تاخت و تاراج کرِ دیا گیا۔ چار مرتبہ آپ کو ملک بہ ملک جلاوطن کیا گیا۔ اور آخر کار سجنِ اعظم (عکّا) میں رکھا گیا۔ باوجود اِن سب مصائب کے آپ ہر وقت ندا۔ بلند کرتے رہے اور امر اللہ کا اعلان فرماتے رہے۔

آپ ایسے علم و فضل و کمال سے ظاہر ہوئے کہ تمام اہل ایران مات و حیران رہ گئے۔ طہران و بغداد و اسلامبول و اڈریانوپل و عکّا میں اہل علم سے جو شخص دوست یا دشمن حضور میں حاضر ہو کر سوال کرتا شافی و کافی جواب پاتا۔ سب اِس بات کے مقر و معترف تھے کہ یہ شخص سب کمالات میں دنیا کے اندر بے نظیر اور یکتا ہے۔ بغداد میں بارہا ایسا ہوا کہ مجلسِ مبارک میں مسلمان۔ یہودی عیسائی علماء اور یورپ کے اہل سائنس آتے اور سوال کرتے اور باوجود اختلافِ مشارب سب ایسا شافی و کافی جواب پاتے کہ اُن کے اطمینانِ قلب کا باعث ہوتا۔

ایک دفعہ ایرانی علماءِ نجف و کربلا نے ایک شخص عالم کا انتخاب کیا۔ اور اُسے اپنا وکیل بنا کر چند سوالات دے کر حضورِ مبارک میں بھیجا۔ اِس شخص کا نام مُلّا حسن عَمو تھا۔ علماء کی طرف سے جو سوالات اِس شخص نے کئے۔ آپ نے اُن کا شافی جواب دیا۔ اُس نے عرض کیا کہ علماء آپ کے علم و فضل کے مقر و معترف ہیں۔ اور یہ عام طور سے مسلّم ہے کہ آپ سب علوم میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ آپ نے کہیں کسی مدرسہ میں علم حاصل نہیں کیا۔ لیکن علماء کہتے ہیں کہ ہم اس پر قناعت نہیں کر سکتے۔ اور آپ کے علم و فضل کے سبب آپ کی سچائی کے مقر و معترف نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے اطمینانِ قلب کے لئے ایک معجزہ ظاہر فرمائیں۔ جمالِ مبارک نے فرمایا کہ اگرچہ اُن کا کوئی حق نہیں کہ وہ ہم سے معجزہ طلب کریں۔ کیونکہ خدا بندوں کو آزما سکتا ہے۔ مگر بندے خدا کو نہیں آزما سکتے۔ پھر بھی اس وقت ہم اِس بات کو قبول کرتے ہیں لیکن امر اللہ تھیئٹر کا اسٹیج نہیں کہ ہر گھڑی لوگ ایک تماشا چاہیں اور ہر روز ایک نئی خواہش کریں۔ اس صورت میں امر اللہ بچوں کا کھیل ہو جائے گا۔ ہاں علماء ایک جگہ جمع ہوں اور متفقاً ایک معجزہ

انتخاب کریں اور لکھ دیں کہ اِس معجزہ کے ظاہر ہونے پر ہمارے سب شبہات دور ہو جائیں گے اور ہم سب اِس اَمر کی سچّائی کا اقرار کرینگے۔ اِس کاغذ کو مُہر کر کے لائیں اور ایسے میزان بنائیں کہ اگر یہ معجزہ ظاہر ہو گیا تو ہمیں کوئی عذر باقی نہ رہے گا۔ اور ظاہر نہ ہوا تو ہم جھوٹے ثابت ہونگے۔ اُس شخص نے اُٹھ کر حالانکہ مومن نہ تھا زانوی مُبارک کو چوما۔ اور جا کر حضراتِ علماء کو جمع کیا اور پیغامِ مُبارک اُنھیں سُنایا۔ اِن حضرات نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا یہ شخص جادوگر ہے۔ شاید جادو کر دے۔ اور ہمیں لاجواب کر دے۔ اِس لئے خاموش ہو گئے۔ لیکن مُلّا حسن عَمو نے اکثر محفلوں میں اِس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ کربلا سے کرمانشاہ اور طہران گیا اور سب کو تفصیلاً علماء کے خوف اور عدمِ اقدام کا قصّہ سُنایا۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ مشرق کے تمام مخالفین حضرت جمالِ مُبارک کی بزرگی اور عظمت کے اقراری اور آپ کے علم وفضل کے قائل تھے۔ اور باوجود عداوت کے آپ کو "بہاء اللہ شہیر" کہا کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ نیّرِ اعظم دفعتہً اُفقِ ایران سے طالع ہوا۔ ایران کے عُلماء و وزراء وعوام سب کے سب نہایت عداوت سے آپ کے خلاف اُٹھے۔ اور اعلان کیا کہ یہ شخص ہمارے دین و شریعت وسلطنت و ملّت کو محو و نابود کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ حضرت مسیح کے بارہ میں بھی کہا تھا۔

جمالِ مُبارک نے یکّہ وتنہا سب کا مقابلہ کیا اور ذرہ بھر بھی نہ گھبرائے۔ آخر کار لوگ کہنے لگے کہ جب تک یہ شخص ایران میں رہے گا امن وامان قائم نہ ہوگا۔ اِس لئے اِس کو ایران سے نکال دینا چاہئے۔ تاکہ ایران میں اطمینان ہو جائے۔ پس جمالِ مُبارک پر سختی بڑھانے لگے۔ تاکہ آپ تنگ آکر ایران سے باہر جانے کی اجازت مانگیں۔ اِن کا یہ گمان تھا کہ اِس طرح آپ کے اَمرِ مُبارک کا چراغ گُل ہو جائے گا لیکن نتیجہ اِس کے برعکس ہوا۔ اَمر اور بھی بلند ہوا۔ شعلہ اور بھی چمکا۔ پہلے صرف ایران میں ہی تھا۔ پھر اور مُلکوں میں بھی پھیل گیا۔ پھر کہنے لگے۔ عراق ایران کے نزدیک ہے۔ آپ کو کسی دور مُلک میں بھیجنا چاہئے۔ اِسی لئے پھر حکومتِ ایران نے کوشش کر کے جمالِ مُبارک کو عراق سے اسلامبول کی طرف بھجوایا۔ مگر پھر ان لوگوں نے دیکھا کہ وہاں بھی کچھ نہ بگڑا تو کہنے لگے کہ اسلامبول مختلف اقوام کے آنے جانے کا مقام ہے اور یہاں ایرانی بہت ہیں۔ پس ایرانیوں کی کوشش سے جمالِ مبارک اڈریانوپل بھیج دئیے گئے۔ مگر شعلہ تیز تر اور اَمر بلند تر ہوا۔

آخر کار ایرانی کہنے لگے کہ اِن میں سے کسی مقام پر آپ کی اہانت نہیں۔ اِس لئے ایک ایسے مقام پر بھیجدینا چاہئے جو دُکھ اور مصیبت کی جگہ ہو۔ جہاں آپ کی توہین ہو۔ آپ کے اہل واصحاب حد درجہ کی بلا و اذیت میں مبتلا ہوں۔ پس سجنِ عکّا کو منتخب کیا گیا۔ جہاں مجرم۔ چور۔ ڈاکو۔ راہزن۔ قاتل اور

خونخوار لوگ قید کیے جاتے تھے۔ اصل میں اپنے گمان کے مطابق انھوں نے آپ کو بھی ان لوگوں کے زمرہ میں داخل کیا۔ لیکن قدرتِ الٰہی ظاہر ہوئی۔ کلمۃ اللہ بلند ہوا۔ عظمتِ بہآءاللہ روشن ہوئی۔ آپ نے ایسے جیلخانے اور ایسی اہانت میں رہ کر ایران کو ایک برزخ سے دوسرے برزخ میں منتقل کر دیا۔ آپ کے سب دشمن مقہور ہوئے۔ اور آپ نے سب پر یہ ثابت کر دیا کہ اس امرِ مبارک کا مقابلہ محال ہے۔ آپ کی تعالیم سب دنیا میں پھیل گئیں اور آپ کا امر ثابت ہو گیا۔

دشمن، ایران کے سب اطراف میں سختی سے اُٹھے۔ اہلِ بہآء کو پکڑا۔ باندھا۔ مارا قتل کیا۔ جلایا۔ تہ خاک کیا۔ ہزارہا خاندانوں کو جڑ بنیاد سے اُکھیڑ پھینکا۔ ہر طریقہ سے قتل و غارت کیا۔ تاکہ آپ کے امرِ مبارک کو خاموش کر دیں۔ مگر آپ نے قاتلوں اور چوروں اور ڈاکوؤں کے جیلخانے سے اپنے امر کو بلند کیا اور اپنی تعالیم کو پھیلایا۔ اور اکثر ایسے لوگوں کو جو سخت ترین دشمن تھے مُتنبہ کیا اور اپنا ماننے والا بنایا۔ حتیٰ کہ خود حکومتِ ایران بھی بیدار ہوئی۔ اور جو کچھ بدعمل علماء کے سبب واقع ہوا تھا اس سے پشیمان ہوئی۔

جمالِ مبارک جب ارضِ مقدس کے اس قید خانہ میں پہنچے تو دنیا کے خردمند بیدار ہوئے کہ وہ بشارتیں جو خُدا نے دو تین ہزار سال پہلے نبیوں کی زبانی دی تھیں آج پوری ہوئیں اور خدا نے اپنا وعدہ آشکار فرمایا۔ کیونکہ بعض انبیاء کو وحی ہوئی تھی اور ارضِ مقدس کو یہ بشارت دی گئی تھی کہ ربّ الجنود تجھ میں ظاہر ہوگا۔ یہ سب وعدے پورے ہوئے۔

آپ دیکھیئے کہ اگر دشمنوں کی دشمنی و مخالفت نہ ہوتی تو عقل باور نہیں کرتی کہ حضرت جمالِ مُبارک ایران سے ارضِ مقدس کی طرف ہجرت فرماتے۔ دشمنوں کا مقصد یہ تھا کہ یہ جیلخانہ آپ کے امرِ مبارک کو بالکل محو و نابود کر دے گا۔ مگر یہی جیلخانہ سب سے بڑی تائید اور ترویج کا سبب ہوا۔ خدا کی آواز مشرق و مغرب میں پہنچی اور آفتابِ حقیقت کی شعاعیں تمام آفاق میں چمک اٹھیں۔

سُبحان اللہ! باوجودیکہ آپ قیدی تھے۔ مگر کوہِ کرمل پر خیمہ بلند تھا۔ اور نہایت عظمت و وقار سے رفتار کرتے تھے۔ جو کوئی آشنا و بیگانہ آپ کے حضور میں مشرف ہوتا کہتا کہ آپ اسیر نہیں امیر ہیں۔

اِس قید خانہ میں آتے ہی آپ نے نپولین کو ایک لوح لکھی۔ اور سفیرِ فرانس کے ذریعے بھیجی۔ اِس کا خُلاصہ یہ تھا کہ :-

" اے نپولین تو پوچھ کہ ہمارا جُرم کیا تھا جس کے لئے ہمیں اس قید و زندان میں ڈالا ہے ؟

نپولین نے اِس کا جواب نہ دیا۔ اِس پر ایک اور توقیع صادر فرمائی جو سورۂ ہیکل میں درج ہے اور جس کا اختصار یہ ہے :-

"اے نیپولین! تو نے میری نِدا، کو نہیں سُنا اور جواب نہیں دیا۔ عنقریب تیری سلطنت برباد ہوگی اور تو بالکل تباہ ہو جائے گا۔"

یہ توقیع قیصر کفتا کو[1] کی معرفت بذریعۂ ڈاک ارسال کی گئی۔ اِس توقیع کی نقل باطلاعِ مہاجرین تمام اطرافِ ایران میں پہنچی۔ کیونکہ کتاب ہیکل اُن ایام میں سب ایران میں نشر کی گئی تھی۔ اور یہ توقیع کتابِ ہیکل میں درج ہے۔ یہ ۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے۔ چونکہ سورۂ ہیکل تمام ایران و ہندوستان میں سب احباب کے پاس پہنچ گئی تھی اِس لئے سب اِس خطاب کے نتیجہ کے مُنتظر تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ یعنی ۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی۔ حالانکہ جرمنی کی فتح کا کسی کو گمان بھی نہ تھا مگر نیپولین نے شرمناک شکست کھائی اور دشمن کے قابو میں آگیا۔ اُس کی عزت بڑی ذلت سے بدل گئی۔ اِسی طرح آپ نے تمام دُنیا کے بادشاہوں کے نام الواح بھیجیں۔ از انجملہ ایک توقیع اعلیٰ حضرت ناصر الدین شاہ کے نام ارسال فرمائی۔ اِس توقیع میں آپ فرماتے ہیں: "مجھے بُلا اور سب عُلما، کو جمع کر اور دلیل و حجّت طلب کر۔ تا کہ سچ اور جھوٹ ظاہر ہو جائے۔" اعلیٰ حضرت ناصر الدین شاہ نے توقیعِ مُبارک کو عُلما، کے پاس بھیجا۔ اور اُن سے کہا کہ وہ اِس کام کو سر انجام دیں۔ مگر علما، اِس بات کے ماننے کی جرأت نہ کر سکے۔ پس شاہ نے سات چوٹی کے عُلما، سے اِس توقیع کا جواب طلب کیا۔ مگر اُنھوں نے کچھ مُدت کے بعد توقیعِ مبارک کو لوٹا دیا۔ اور کہا کہ یہ شخص دین کا مخالف اور بادشاہ کا دشمن ہے۔ اعلیحضرت شاہِ ایران اِس جواب سے نہایت برافروختہ ہوئے۔ فرمایا یہاں تو حُجت و بُرہان اور سچ اور جھوٹ کا سوال ہے۔ اِس کا حکومت کی دشمنی سے کیا تعلق۔ افسوس ہم اِن علما، کی کتنی عزت مدّنظر رکھتے ہیں مگر یہ اِس خطابہ کا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ المختصر جو کچھ الواحِ مُلوک میں لکھا ہے وہ سب کا سب واقع ہو گیا۔ اگر ۱۸۷۰ء سے لیں اور واقعات کو ملائیں تو سب ظاہر ہو چکے ہیں۔ کچھ باقی رہ گئے ہیں جو اِس کے بعد ظاہر ہونگے۔

بیرونی جماعتیں اور غیر مومن اشخاص بھی جمالِ مُبارک کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کہتے تھے۔ بعض تو جمالِ مُبارک کی ولایت کے معتقد تھے۔ حتیٰ کہ بعضوں نے رسائل لکھے۔ ان میں سے سید داؤدی نے جو بغداد کے عُلمائے اہلِ سُنت میں سے تھے آپ کی تعریف و توصیف میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اِس رسالہ میں اُنھوں نے حضرت جمالِ مُبارک کے کچھ معجزات کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] قیصر کفتا کو تونسل فرانس کے بیٹے کا نام تھا جن سے جمالِ مُبارک جل ذکرہ الاعظم تعلق وارتباط رکھتے تھے۔

اس وقت بھی مشرق کے سب مُلکوں میں ایسے اشخاص ہیں جو جمالِ مُبارک کے مظہر ہونے پر ایمان نہیں رکھتے۔ مگر آپ کی ولایت اور آپ کے معجزات کے معتقد ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ کوئی ایسا موافق یا مخالف بارگاہِ اقدس میں مُشرف نہیں ہوا جو جمالِ مُبارک کی بزرگواری کا مقر و معترف نہ ہوا ہو۔ اگرچہ مومن نہ ہو۔ مگر آپ کی بزرگواری کی شہادت دی۔ جوں ہی بارگاہِ اقدس میں مشرف ہوتے آپ کی مُلاقات ایسی تاثیر پیدا کرتی کہ اکثر بات بھی نہ کر سکتے تھے۔ بارہا ایسا واقع ہوا کہ آپ کا سخت ترین دشمن دل میں یہ کچھ ویز کرکے جاتا تھا کہ میں حضور میں جاکر یہ کہوں گا اور وہ کہوں گا۔ یہ دلیل لاؤں گا اور وہ حجّت پیش کروں گا۔ مگر جب بارگاہِ اقدس میں آتا تو مات و متحیّر رہ جاتا۔ سوائے خاموشی اُسے اور کچھ نہ سوجھتا۔

جمالِ مُبارک نے زبانِ عربی نہ پڑھی تھی۔ آپ کا کوئی مُعلّم یا مُدرّس بھی نہ تھا۔ نہ آپ نے کسی مدرسہ میں درس حاصل کرنے کے لئے کبھی قدم رکھا تھا۔ لیکن عربی زبان میں آپ کے بیانِ مُبارک اور عربی الواح کی فصاحت و بلاغت فُصحاء و بُلغائے عرب کے لئے محیّر العقول تھی۔ سب اس بات کو مانتے ہیں کہ یہ عربی بے مثل و بے نظیر ہے۔ ہم تمام تورات کو خوب غور سے پڑھنے پر مظاہرِ الٰہی میں سے ایک کو بھی ایسا نہیں پاتے جس نے منکروں سے یہ کہا ہو کہ جو معجزہ تم مانگتے ہو میں ظاہر کرنے کو موجود ہوں۔ اور جو میزان و معیار تم مقرر کرو میں اُس کے پورا کرنے کے لئے مستعد ہوں۔ جمالِ مُبارک نے توقیع شاہ میں صاف لکھا ہے کہ عُلماء کو جمع کریں اور مجھے طلب کریں تاکہ حجّت و بُرہان ثابت ہو جائے۔ پچاس سال تک جمالِ مُبارک اپنے دشمنوں کے مقابل پہاڑ کی مانند کھڑے رہے۔ سب جمالِ مُبارک کو مٹانا اور برباد کرنا چاہتے تھے۔ اور سب کے سب آپ کے خلاف متحد ہو کر حملہ کر رہے تھے۔ ہزاروں مرتبہ آپ کو صلیب دینے اور نیست و نابود کرنے کا ارادہ کیا۔ اس پچاس سال کے عرصہ میں آپ ہمیشہ معرضِ خطر میں رہے۔

ایران کے بارے میں جو اس وقت اس قدر ویرانی اور تنزّل کی حالت میں ہے۔ ایرانی و اجنبی سب عقلاء جو حقیقتِ حال سے آگاہ ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ ایران کی ترقی و تعمیر اور تمدن و آبادی اِس شخص بزرگوار کی تعلیمات کو عام کرنے اور آپ کے اُصولوں کو جاری کرنے پر ہے۔

حضرتِ مسیح نے اپنے زمانہ میں صرف گیارہ آدمیوں کو تربیت دی تھی۔ اور اُن میں سب سے بڑا پطرس تھا جس نے بوقتِ امتحان تین مرتبہ حضرت مسیح کا انکار کیا۔ پھر بھی آپ کا امرِ مُبارک تمام اطرافِ عالم میں پھیل گیا۔ حضرت جمالِ مُبارک نے ہزاروں نفوس کو تربیت فرمایا۔ جنھوں نے تہِ خنجر

نعرۂ یا بہآء الابہیٰ کو اَوجِ اعلیٰ تک پہنچایا۔ اور آتشِ امتحان میں سُرخ سونے کی طرح چمک اُٹھے۔
اَب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آئندہ کیا ہوگا۔

غرض یہ کہ ہمیں انصاف کرنا چاہئے کہ یہ شخص بزرگوار عالمِ انسانی کا کیسا بڑا مُربّی تھا۔ کیسے عجیب و غریب اور روشن نشان آپ سے نمودار ہوئے۔ اور کہ عالمِ وجود میں کیسی بڑی قوّت و قدرت آپ سے ظاہر ہوئی۔

(ی)

دلائلِ نقلی

کُتبِ مقدّسہ اور کتابِ دانیال کی تین فصلوں سے

آج سر سفرہ ہم بُرہان پر کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ظہورِ نورِ مُبین (حضرت بہآء اللہ) کے دِنوں میں اِس بُقعۂ مُبارکہ (عکّہ) میں آتے اور پیشگاہِ حضور میں حاضر ہوتے اور اُس جمالِ نورانی کو دیکھ لیتے تو آپ جان جاتے کہ آپ کا بیان اور آپ کا جمال کسی اور بُرہان کی حاجت نہیں رکھتا۔ بہت سے نفوس حضور میں مُشرّف ہوتے ہی مؤمن و موقن ہوگئے۔ وہ کسی اور دلیل کے محتاج ہی نہیں رہے۔ حتّیٰ کہ وہ اشخاص جو حد درجہ کی دشمنی اور سخت انکار کی حالت میں تھے مُلاقات کرتے ہی آپ کی عظمت پر شہادت دیتے اور کہا کرتے کہ یہ شخص بہت بڑی ہستی ہے۔ مگر افسوس کہ ایسا دعویٰ کرتا ہے۔ اِس دعوے کے علاوہ جو آپ فرماتے تھے لوگ قبول کرتے تھے۔ مگر اب چونکہ وہ نورِ حقیقت غائب ہوگیا ہے۔ سب براہین کے محتاج ہیں۔ اِس لئے ہم نے عقلی دلائل پیش کئے۔ یہاں ایک اور عقلی دلیل دیتے ہیں جو اکیلی اہلِ انصاف کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ اِس جلیل القدر شخص (حضرت بہآء اللہ) نے قید خانہ سے اپنا امر بلند فرمایا۔ اُس کا نور چمکا اور آوازہ جہانگیر ہوا۔ اُس کی عظمت کی صدا مشرق و مغرب میں گونج اُٹھی۔ آج تک ایسا امرِ عجیب دنیا میں واقع نہیں ہوا۔ مُنصف کے لئے یہ بس ہے۔ مگر بعض لوگ ہیں جو تمام دُنیا کے دلائل سُن کر انصاف نہیں کرتے۔ حکومتیں اور قومیں کمال قوّت کے ہوتے ہوئے بھی اُس کا مقابلہ

نہ کر سکیں۔ بلکہ تنِ تنہا اور قید و ظلم کے پنجہ میں گرفتار ہوتے ہوئے۔ بھی جو آپ نے چاہا اُسے جاری فرمایا۔ ہم حضرت جمالِ مُبارک کے معجزے لکھنے نہیں چاہتے۔ کیونکہ سُننے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ محض روایت ہے۔ اور اُس کے سچ جھوٹ ہونے میں احتمال ہے۔ جیسے انجیل میں حواریوں سے معجزاتِ مسیح منقول ہیں۔ دوسرے لوگوں سے نہیں۔ مگر یہودی اُن کے مُنکر ہیں۔

اگر ہم حضرت جمالِ مُبارک کے معجزے بیان کرنا چاہیں تو بہت ہیں۔ اغیار تک میں یہ معجزے مُسلّم ہیں۔ مگر معجزات کی روایات سب کے لئے حجّت و بُرہان نہیں ہوسکتیں۔ سُننے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ کے مطابق نہیں۔ کیونکہ سب مذاہب کے لوگ معجزات کی ایسی روایات اپنے مقتداؤں کی نسبت بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ہندو برھما کے لئے کچھ معجزات بیان کرتے ہیں۔ پس کیسے جان سکتے ہیں کہ یہ سچ ہیں اور وہ جھوٹے۔ اگر یہ روایت ہے تو وہ بھی روایت ہے۔ اگر یہ عام طور سے مانے جاتے ہیں تو وہ بھی عام طور سے مانے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ روایات تسلّی بخش دلائل نہیں۔ ہاں اُس شخص کے لئے دلیل ہو سکتے ہیں جو اُس وقت حاضر تھا۔ مگر وہ بھی شک کر سکتا ہے کہ یہ معجزہ نہیں جادو ہے۔ بعض جادوگروں سے بھی عجیب عجیب واقعات کی روایات چلی آتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ حضرت جمالِ مُبارک سے بے شمار معجزات ظاہر ہوئے۔ مگر ہم اُنھیں بطور دلیل بیان کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ زمین کے سب رہنے والوں پر حجّت نہیں ہوسکتے۔ بلکہ اُن لوگوں کے لئے بھی جنھوں نے دیکھا ہے بُرہانِ قاطع نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ وہ گمان کر سکتے ہیں کہ یہ جادو ہے۔ اسی طرح بہت سے معجزات جو انبیاء کی طرف منسوب ہیں اُن کے معنی کچھ اور ہیں۔ مثلاً انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح کی شہادت کے وقت دُنیا پر تاریکی چھا گئی۔ زلزلہ آیا۔ ہیکل کا پردہ پھٹ گیا۔ اور مُردے قبروں سے اُٹھے۔ اگر جیسا یہ لکھا ہے ویسا ہی واقع ہوا تو یہ بہت بڑا واقعہ ہے۔ ان دنوں کی تاریخ میں لازماً درج ہوتا۔ لوگوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیتا۔ کم از کم یہ تو ہوتا کہ سپاہی فوراً حضرت مسیح کو صلیب سے اُتار لیتے یا بھاگ جاتے۔ مگر یہ واقعہ کسی تاریخ میں ثبت نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اِس کا مطلب یہ نہیں جو ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اِس کے معنی کچھ اور ہیں۔

ہم انکار نہیں کرتے۔ ہماری مُراد یہ ہے کہ روایات بُرہانِ قاطع نہیں ہوسکتیں۔ مقصد یہ کہ اِن کے معنے کچھ اور ہیں۔

اِس لئے آج ہم بر سرِ سفرہ مقدّس کتابوں سے نقلی دلائل بیان کرتے ہیں۔ جو کچھ اب تک بیان ہوا وہ عقلی دلائل تھے۔ اور چونکہ یہ مقام تلاشِ حقیقت اور جستجوئے واقعہ کا مقام ہے۔ جہاں تشنہ اور پیاسا آبِ حیات کی آرزو کرتا ہے اور ماہیِ بے آب مضطرب ہو کر دریا میں جاتی ہے۔ مریض طبیبِ حقیقی کو ڈھونڈھتا ہے اور شفائے الٰہی سے فائز ہوتا ہے۔ گُم شدہ قافلہ راہِ حق پر آجاتا ہے اور بھولی بھٹکی کشتی

ساحلِ نجات پر پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا طالب کے لئے چند صفات سے مُتّصف ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ ہے کہ وہ منصف ہو۔ اور ماسوی اللہ سے منقطع ہو۔ اُس کا دل بالکل اُفقِ اعلیٰ کی طرف لگا ہوا ہو۔ نفس و ہوی کی قید سے آزاد ہو۔ کیونکہ یہ سب رُکاوٹیں ہیں۔ علاوہ ازیں ہر بات کا متحمّل ہو۔ اور نہایت تنزیہہ اور تقدیس کی حالت پیدا کرے۔ تمام دنیا کے لوگوں کی محبت و دشمنی سے الگ رہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص یا چیز کی محبت اُسے دوسری چیز کی تحقیق سے روکے۔ اِسی طرح ممکن ہے کہ ایک چیز کی دشمنی اُسے اُس چیز کی حقیقت معلوم کرنے سے روکے۔

یہ مقامِ طلب ہے۔ طالب میں ان اخلاق و اطوار کا ہونا لازمی ہے۔ جب تک اس مقام تک رسائی نہ پائے گا ممکن نہیں کہ شمس حقیقت تک پہنچے۔

اَب ہم اصل مضمون پر آتے ہیں۔ دُنیا کی تمام اقوام دو ظہوروں کی مُنتظر ہیں۔ کہ یہ دو ظہور باہم ہونگے۔ سب کو اِن کا وعدہ دیا گیا ہے۔ تورات میں یہودیوں کو ربّ الجنود اور مسیح کا وعدہ دیا گیا ہے۔ انجیل میں حضرت مسیح کے دوبارہ آنے اور حضرت ایلیا کے پھر ظاہر ہونے کی بشارت ہے۔ دینِ محمدی میں مہدی و مسیح کے آنے کا انتظار ہے۔ اِسی طرح زرتشتی وغیرہ۔ مزید تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔ مقصد یہ ہے کہ سب دو ظہوروں کے مُنتظر ہیں۔ جو پے درپے ظاہر ہونگے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اِن دو ظہوروں کے زمانہ میں جہان ایک نیا جہان بن جائے گا۔ عالمِ وجود پھر سے سنوریگا۔ دُنیا ایک نیا چولہ بدلیگی۔ عدل اور سچائی جہان میں پھیل جائیگی۔ عداوت و دشمنی زائل ہو جائے گی۔ اقوام و قبائل کے درمیان جو کچھ باعثِ جدائی ہے وہ اُٹھ جائے گا۔ اور جو کچھ اتّفاق و اتّحاد و یگانگت کا سبب ہے وہ قائم ہوگا۔ غافل بیدار ہونگے۔ اندھے دیکھنے لگیں گے۔ بہرے سُننے لگیں گے۔ گونگے باتیں کرینگے۔ مریض شفا پائیں گے۔ مُردے زندہ ہونگے۔ جنگ صُلح سے بدل جائے گی۔ عداوت کی جگہ محبت جلوہ گر ہوگی۔ نزاع و جدال کے اسباب بالکل اُٹھ جائیں گے اور انسان کو حقیقی سعادت حاصل ہوگی۔ دُنیا ملکوت کا آئینہ اور ناسوت، لاہوت کا جلوہ گاہ بن جائے گا۔ کُل اقوام، قومِ واحد اور کُل مذاہب ایک مذہب بن جائیں گے۔ سب نوعِ انسان ایک خاندان اور ایک گھرانہ ہو جائینگے۔ دُنیا کے کُل قطعات ایک قطعہ نظر آئینگے۔ کُل جنسی و وطنی و سیاسی و شخصی و لسانی تعصبات محو و نابود ہو جائیں گے۔ سب ربّ الافواج کے زیرِ سایہ ہمیشہ کی زندگی سے بہرہ مند ہونگے۔ اَب کُتبِ مقدسہ کے اِن دو ظہوروں کے ظاہر ہونے پر استدلال کرنا چاہئے۔ اور انبیاء کے اقوال سے استنباط کرنا چاہئے۔ کیونکہ اَب ہم چاہتے ہیں کہ کُتبِ مقدسہ سے استدلال کریں۔ چند روز قبل سر سفرہ اِن دو ظہوروں کو ہم نے عقلی دلائل سے ثابت کیا تھا۔

خُلاصہ یہ کہ دانیال کی کتاب میں عمارتِ بیت المقدس کی از سرِ نو تعمیر سے لیکر حضرت مسیح کی شہادت کے

دن تک ستر ہفتے مقرر کیئے گئے ہیں کہ حضرت مسیح کی شہادت سے قربانی ختم ہوگی۔ اور مذبحہ خراب ہوجائیگا
یہ خبر حضرت مسیح کے ظہور کی ہے۔ اور ان ۷۰ ہفتوں کی تاریخ کی ابتدا بیت المقدس کی تجدید و تعمیر سے ہے۔
بیت المقدس کی تعمیر کے بارے میں چار حکم تین بادشاہوں کے صادر ہوئے تھے۔ اول کورش (سائرس) کا
جو ۵۳۶ قبل از ولادت مسیح صادر ہوا تھا۔ یہ عزرا کی کتاب کے پہلے باب میں مذکور ہے۔ دوسرا حکم دارا
(داریوس) فارسی کا ہے۔ جو ۵۱۹ قبل از مسیح ہوا تھا۔ یہ عزرا کی کتاب کے چھٹے باب میں درج ہے۔ تیسرا حکم
ارتحشستا (آرٹازگیرس) کی طرف سے ہے۔ جو اس کی حکومت کے ساتویں سال یعنی ۴۵۷ قبل از مسیح
صادر ہوا تھا۔ یہ عزرا کی کتاب کے ساتویں باب میں لکھا ہے۔ چوتھا حکم اسی ارتحشستا کی طرف سے ۴۴۴
قبل از مسیح صادر ہوا تھا۔ یہ نحمیاہ کے دوسرے باب میں مذکور ہے۔ لیکن حضرت دانیال کی مراد تیسرے حکم سے
ہے۔ جو ۴۵۷ قبل از مسیح صادر ہوا تھا۔ ۷۰ ہفتے ۴۹۰ دن ہوتے ہیں۔ ہر دن کتاب مقدس کی تصریح
کے مطابق ایک سال کے برابر ہے (توریت میں فرمایا ہے کہ خدا کا ایک دن تمھارے ایک سال کے برابر ہے)
پس ۴۹۰ دن ۴۹۰ سال ہوئے۔ تیسرا حکم ارتحشستا کی طرف سے مسیح کے پیدا ہونے سے ۴۵۷ سال پہلے
ہوا تھا۔ اور حضرت مسیح شہادت و صعود کے وقت ۳۳ سال کے تھے۔ ان ۳۳ سال کو اگر ۴۵۷ میں
جمع کر دیا جاوے تو ۴۹۰ سال ہوتے ہیں۔ اور یہ وقت دانیال نے حضرت مسیح کے ظہور کا دیا ہے۔
لیکن نویں باب کی آیت ۲۵ میں دانیال دوسری طرح بیان کرتے ہیں۔ یعنی ۷ ہفتے اور ۶۲ ہفتے
لکھتے ہیں۔ ظاہراً یہ پہلے قول سے مختلف ہے۔ بہت سے لوگ ان دونوں بیانات کی مطابقت کرنے میں
سرگردان رہے ہیں کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ ۷۰ ہفتے اور دوسری جگہ ۷ ہفتے اور ۶۲ ہفتے ذکر کیئے ہیں
یہ قول کس طرح اس قول سے مطابق ہو سکتا ہے۔ حالانکہ دانیال دو تاریخیں بیان کرتے ہیں۔ ایک
تاریخ ارتحشستا کے حکم کے صادر ہونے کے وقت سے ہے جو عزرا کے یورشلیم بنانے کے لئے ہوا تھا۔
یہ ۷۰ ہفتے ہیں جو حضرت مسیح کے صعود پر ختم ہوتے ہیں۔ اور جن کے اختتام پر ذبیحہ و قربانی حضرت
مسیح کے قربان ہونے سے ختم ہو گئی۔ دوسری تاریخ جو آیت ۲۵ میں ہے وہ بیت المقدس کے تعمیر ہونے
کے بعد سے گنی جاتی ہے۔ اور صعود مسیح تک ۶۲ ہفتے ہوتی ہے۔ بیت المقدس ۷ ہفتے یا ۴۹ سال تک
بنتا رہا۔ اب اگر ان ۷ ہفتوں کو ۶۲ ہفتوں میں جمع کر دیا جائے تو ۶۹ ہفتے ہوتے ہیں۔ ہفتۂ اخیر
میں حضرت مسیح کا صعود واقع ہوا تھا۔ اس طرح یہ ستر ہفتے پورے ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں کوئی
فرق نہیں رہتا۔ جس طرح ہم نے حضرت مسیح کا ظہور دانیال کی پیشینگوئی سے ثابت کیا ہے اسی طرح
اب ہم حضرت بہاء اللہ اور حضرت اعلیٰ (باب) کے ظہور کو ثابت کرتے ہیں۔ اس وقت تک ہم نے

عقلی دلیلیں دی تھیں۔ اَب ہم نقلی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

دانیال کی کتاب کے ۸ باب کی ۱۳ آیت میں فرمایا ہے :-

"اور میں نے ایک مقدس مُتکلم کو بولتے سُنا۔ اور دوسرے مقدس نے اس متکلم سے پوچھا کہ وہ روایت دائمی قربانی کی بابت اور اُس اجاڑنے والے کی شرارت کی بابت جسے مقدس اور لشکر دونوں دیئے گئے کہ پامال ہوویں کب تک رہے گی۔ اُس نے کہا (۵:۱۴) دو ہزار تین سو دن تک۔ پھر قدس پاک کیا جائے گا (۵:۱۷)" یہاں تک کہ فرماتے ہیں کہ............ "یہ رویا آخری زمانہ سے تعلق رکھتا ہے"۔

یعنی یہ فلاکت و خرابی و اہانت کب تک رہے گی۔ اور صبحِ ظہور کب ظاہر ہوگی۔ کہا دو ہزار تین سو دن تک۔ پھر قدس پاک کیا جائے گا۔ مختصر یہ ہے کہ دو ہزار تین سو سال مقرر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ نصِ تورات کے مطابق ایک دن ایک سال کے برابر ہے۔ پس تعمیر بیت المقدس کے بارے میں ارتخشستا کے حکم کے صادر ہونے کی تاریخ سے لیکر حضرت مسیح کی ولادت کے دن تک ۴۵۶ سال ہوتے ہیں۔ اور حضرت مسیح کے پیدا ہونے کے دن سے ظہورِ حضرتِ اعلیٰ (باب) تک ۱۸۴۴ سال ہوتے ہیں۔ ۱۸۴۴ اور ۴۵۶ مل کر ۲۳۰۰ ہوتے ہیں۔ یعنی دانیال کے رویا کی تعبیر ۱۸۴۴ء میں واقع ہوئی۔ یہی حضرت اعلیٰ (باب) کے ظہور کا سال ہے۔ مُلاحظہ فرمائیں کہ دانیال نے کس صراحت سے سنِ ظہور مقرر کیا ہے۔ کسی ظہور کے لئے اِس سے صریح تر پیشنگوئی نہیں ہوسکتی۔

حضرت مسیح بھی انجیل متی کے ۲۴ باب کی آیت ۳ میں تصریح فرماتے ہیں کہ دانیال کی اِس پیشگوئی سے مُراد ظہور کا وقت ہے۔ اور وہ آیات یہ ہیں :-

"اور جب وہ زیتون کے پہاڑ پر بیٹھا تھا اُس کے شاگردوں نے خلوت میں اُس کے پاس آکے کہا کہ ہم سے کہہ کہ یہ کب ہوگا؟ اور تیرے آنے کا اور زمانے کے آخر ہونے کا نشان کیا ہے"

جملہ بیانات میں سے جو حضرت مسیح نے اُن کے جواب میں فرمائے ایک یہ ہے :-

"جب تم مکروہ ویرانی کو جو دانیال نبی کی زبانی کہی گئی تھی مقامِ مقدس میں کھڑا دیکھو (جو پڑھے وہ سمجھ لے)"

یہ جواب دانیال کی کتاب کے باب ۸ کا حوالہ ہے کہ جو کوئی اِس باب کو پڑھے گا معلوم کرے گا۔ مُلاحظہ فرمائیں کہ حضرت اعلیٰ کا ظہور تورات و انجیل سے کس قدر صریح ہے۔

اَب اِسی طرح ظہورِ جمالِ مُبارک (بہاء اللہ) کی تاریخ کو ہم تورات سے بیان کرتے ہیں۔
جمالِ مُبارک کے ظہور کی تاریخ سنۂ قمری کے مطابق حضرت محمدؐ کی بعثت و ہجرت سے لی گئی ہے۔ کیونکہ شریعتِ محمدی میں سنۂ قمری معتبر و معمول ہے۔ اِس شریعت کے احکام عبادات میں بھی سنۂ قمری ہی جاری ہے۔
کتاب دانیال کے باب ۱۲ کی آیت ۶ میں فرماتا ہے :-

اور ایک نے اُس شخص سے جو کتان کا لباس پہنے تھا۔ اور دریا کے پانیوں پر تھا یہ پوچھا کہ یہ عجائبات کب آخر ہوں گی۔ اور میں نے سُنا اُس شخص نے جو کتانی پوشاک پہنے تھا اور جو دریا کے پانیوں پر کھڑا تھا۔ اپنا داہنا ہاتھ اور اپنا بایاں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر اُس کی جو ہمیشہ جیتا ہے قسم کھائی۔ اور کہا کہ ایک زمان دو زمان اور نصف زمان تک رہینگی۔ اور جب وہ قوم قدس کی قوت کی پراگندگی کو پورا کر چکے گی تو یہ سب باتیں پوری ہونگی "

اِن کے معنوں کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس لئے یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ایک دِن سے مُراد ایکسال ہے۔ اور ہر سال سے مُراد بارہ مہینے ہیں۔ پس تین سال اور آدھا سال ۴۲ مہینے ہوئے اور ۴۲ مہینے ۱۲۶۰ دن ہوتے ہیں۔ ہر دن کتاب مقدس کے مطابق ایکسال کے برابر ہے۔ اور ہجرت حضرت محمدؐ کے ۱۲۶۰ سال بعد (بتاریخِ اسلامی) حضرت اعلیٰ مبشر حضرت جمالِ مُبارک ظاہر ہوئے تھے۔ پھر آیۂ ۱۱ میں فرماتا ہے :-

" اور جس وقت سے دائمی قربانی موقوف کی جائے گی اور وہ مکروہ چیز جو خراب کرتی ہے قائم کی جائے گی ایک ہزار دوسو نوّے سال ہونگے۔ خوشا حال اُس کے جو انتظار کرتا ہے اور ۱۳۳۵ دن تک پہنچتا ہے۔ "

اِس تاریخ قمری کا شروع اُس وقت سے ہے جب حضرت محمد نے اپنی نبوّت کا اعلان عام طور سے مُلکِ حجاز میں کیا۔ اور یہ آپ کی بعثت سے تین سال بعد واقع ہوا تھا۔ کیونکہ تین سال تک آنحضرت کی نبوّت پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ اور خدیجہ اور ابن نوفل کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ تین سال کے بعد عام اعلان کیا۔
جمالِ مُبارک نے حضرت محمد کے اِس اعلانِ نبوت سے سنہ ۱۲۹۰ سال بعد اپنے ظہور کا اعلان فرمایا۔

نوٹ :- سنہ ۱۲۹۰ اعلانِ نبوت محمدی سنہ ۱۲۸۰ھ کے مطابق ہے۔ اسی سال حضرت بہاء اللہ نے بغداد سے اسلامبول جاتے ہوئے سنہ ۱۸۶۳ء باغِ رضوان میں جو شہر سے باہر واقع ہے بارہ دن قیام کیا۔ اور وہاں اپنے ظہور کا اعلان اپنے ساتھیوں میں فرمایا۔

(۱۱)

مُکاشفاتِ یوحنّا کے گیارہویں باب کی تفسیر

مکاشفاتِ یوحنا کے گیارھویں باب کی پہلی آیت میں فرماتا ہے :-

"اور ایک سرکنڈا جریب کی مانند مجھے دیا گیا۔ اور وہ فرشتہ کھڑا ہو کے کہتا تھا کہ اُٹھ اور خدا کی ہیکل اور قربانگاہ اور اُن کو جو اُس میں عبادت کرتے ہیں ناپ اور اُس صحن کو جو مقدس کے باہر ہے خارج کر دے اور اُسے نہ ناپ۔ کیونکہ وہ غیر قوموں کو دیا گیا ہے۔ اور وہ مقدس شہر کو ۴۲ مہینے تک پامال کریں گی۔"

اِس سرکنڈے یا نَے سے مُراد انسانِ کامل ہے۔ یعنی انسان کامل کو سرکنڈے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکنڈا جب اندر سے خالی اور ہر چیز سے صاف ہو جاتا ہے تو نئے نئے نغمات حاصل کرتا ہے۔ اُس کی آواز و آہنگ خود اُس سے نہیں ہوتی۔ بلکہ فی الحقیقت وہ بانسری بجانے والے کا الحان ہوتا ہے جو اُس میں پھونک مارتا ہے۔ اسی طرح اُس نفسِ مُبارک کا قلبِ مقدس ماسوی اللہ سے فارغ و خالی اور تمام نفسانی برائیوں سے پاک و بَری ہو کر نفسِ رحمانی کا دمساز ہوتا ہے۔ پس جو کچھ وہ بیان فرماتا ہے وہ اُس سے نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقی بانسری بجانے والے اور وحیِ الٰہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اِس لئے نَے سے تشبیہ دی ہے۔ اور وہ نَے جریب یا عصا کی مانند ہے یعنی ہر عاجز کا مددگار اور تمام عالَمِ امکان کی پناہ ہے۔ شبانِ حقیقی کا عصا ہے جس سے وہ اپنی بھیڑوں کی چوپانی کرتا ہے۔ اور اُنھیں اپنی ملکوت کے چمن زار میں سیر کراتا ہے اور پھراتا ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ اس شخص نے مجھے کہا۔ "اُٹھ اور قدسِ خدا اور اُن کو جو اُس میں عبادت کرتے ہیں ماپ یعنی موازنہ کر۔ اندازہ لگا۔ اندازہ لگانا کسی چیز کی مقدار کو معلوم کرنا ہے۔ یعنی اس شخص نے کہا کہ قدس الاقداس اور مذبحہ اور اُن کا جو اس میں عبادت کرتے ہیں موازنہ کر یعنی اُن کی حقیقتِ حال کا پتہ لگا اور ظاہر کر کہ کس رُتبہ اور کس مقام میں ہیں۔ اور کن حالات و کمالات اور سلوک و صفات میں ہیں۔ اور اُن مقدس نفوس کے اسرار سے جو قدُس الاقداس کے مقامِ تقدیس و تنزیہہ میں مقیم ہیں آگاہ ہو۔ اور قدُس کے بیرونی صحن کو چھوڑ دے۔ اور اُسے مت ماپ۔ کیونکہ وہ اور اُمتوں کو دیا گیا ہے۔"

ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب یروشلیم پر چڑھائی ہوئی تو قدس الاقداس ظاہری طور پر بھی محفوظ رہا۔ یعنی وہ گھر جو حضرت سلیمان نے بنایا تھا بچا رہا۔ لیکن قدس الاقداس سے علیحدہ باہر کا صحن ضبط ہوگیا۔ اور اُمتوں کو دیا گیا۔ اور "وہ شہر مقدس کو ۴۲ مہینوں تک پامال کرینگے۔" اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُمتیں ۴۲ ماہ تک یعنی ۱۲۶۰ روز تک کتاب مقدس کی اصطلاح کے مطابق ۱۲۶۰ سال تک یروشلیم پر قابض و حاکم رہینگی۔ یہ ۱۲۶۰ سال دورِ قرآن کی مُدت ہے کیونکہ نصِ کتاب مقدس کے مطابق ہر دن سے مُراد ایک سال ہے۔ چنانچہ حزقیل نبی کے چوتھے باب کی آیت ۶ میں فرماتا ہے۔ "پس چالیس دن تک خاندان یہودا کے گناہوں کا متحمل ہو۔ ہر دن کو تیرے لئے ایک سال مقرر کیا ہے۔"

یہ پیشینگوئیاں ظہورِ اسلام کے شروع سے ہیں۔ جس وقت یوروشلیم پامال ہوا۔ یعنی اُس کی عزت نہ رہی مگر قدس الاقداس محفوظ و محترم رہا۔ یہ حالت ۱۲۶۰ سال تک رہی۔ یہ ۱۲۶۰ سال حضرتِ اعلیٰ کے ظہور کی پیشینگوئی ہیں۔ جو جمالِ مُبارک کے لئے باب یعنی دروازہ تھے اور جن کا ظہور ۱۲۶۰ ہجری میں ہوا تھا۔

چونکہ ۱۲۶۰ روز کی مُدت ختم ہوگئی اورشلیم شہر مقدس دوبارہ معمور و آباد ہونا شروع ہوگیا ہے جس کسی نے یوروشلیم کو ۶۰ سال پہلے دیکھا تھا اور اب پھر دیکھتا ہے کہ وہ کس قدر معمور و آباد اور دوبارہ محترم ہوگیا ہے تو وہ اُس کی معموریت اور آبادی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ یہ تو رویائے یوحنا کے ظاہر معنی ہیں۔ لیکن اس آیت کے ایک اور معنی اور ایک دوسری رمز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

شریعت اللہ دو حصوں میں منقسم ہے

ایک حصہ جو اصل ہے۔ وہ روحانیت ہے۔ یعنی وہ فضائے رُوحانی اور اخلاقِ رحمانی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کبھی متغیر و متبدل نہیں ہوتا۔ یہ قُدس الاقداس ہے جو شریعتِ آدم۔ نوح۔ ابراہیم۔ موسیٰ عیسیٰ محمد۔ ربِ اعلیٰ اور شریعتِ جمالِ مُبارک کا جوہر و لبِ لُباب ہے۔ یہ سب انبیاء کے دورے میں باقی و برقرار رہتی ہے۔ اور کبھی منسوخ نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ حقیقتِ رُوحانی ہے۔ جسمانی نہیں۔ اسی کا نام ایمان ہے۔ ایقان ہے۔ عرفان ہے۔ عدالت ہے۔ دیانت ہے۔ مروت ہے۔ امانت ہے۔ محبت اللہ ہے۔ ہر حال میں خوش رہنا ہے۔ فقیروں پر رحم کرنا ہے۔ مظلوموں کی فریادرسی کرنا ہے۔ بیکسوں کو کچھ دینا ہے۔ گرے ہوؤں کی دستگیری کرنا ہے۔ پاکی۔ آزادی وغیرہ ہے۔ حلم و صبر و استقامت ہے۔ یہ خدائی

اخلاق ہیں۔ یہ کبھی منسوخ نہیں ہوتے۔ بلکہ ابدالآباد تک جاری و برقرار رہینگے۔ یہ عالمِ انسانی کے فضائل ہر دور میں تازہ کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہر دور کے آخر میں خدا کی روحانی شریعت یعنی فضائلِ انسانی درمیان سے اٹھ جاتے ہیں۔ اور ظاہری صورت ہی باقی رہ جاتی ہے مثلاً دورِ موسوی کے آخر اور ظہورِ عیسوی کے نزدیک شریعت اللہ یہودیوں کے بیچ سے اٹھ گئی تھی۔ صرف ایک بے جان صورت باقی رہ گئی تھی۔ اور قدس الاقداس درمیان سے اٹھ گیا تھا۔ صرف ہیکل کے باہر کا صحن جس سے شریعت کی صورت مراد ہے اُمتوں کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اسی طرح حضرت مسیح کی اصل شریعت عالمِ انسانی کے فضائل ہیں یہ مسیحیوں میں سے اٹھ گئی تھی۔ اور اس کی صورت پادریوں اور راہبوں کے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ اسی طرح حضرت محمد کی شریعت کی اصل مسلمانوں میں سے اٹھ گئی ہے۔ اور صرف اس کی صورت رسوم پرست علماء کے ہاتھ میں رہ گئی ہے۔ شریعت اللہ کی اصل جو عالمِ انسانی کے فضائل ہیں غیر منسوخ ہے اور ہمیشہ باقی و برقرار رہتی ہے۔ ہر پیغمبر کے دور میں اس کی تجدید ہوتی ہے۔ شریعتِ الٰہی کا دوسرا حصہ جو عالمِ جسمانی سے تعلق رکھتا ہے وہ ہر نبی کے عہد میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً روزہ۔ نماز۔ عبادات۔ نکاح۔ طلاق۔ غلاموں کی آزادی۔ قوانین معاملات قتل و مارپیٹ۔ چوری۔ زخموں اور چوٹوں پر بدلہ اور سزائیں۔ شریعت کا یہ حصہ جسمانیات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ہر نبی کے دور میں تغیر و تبدل پاتا ہے۔ اور منسوخ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سیاسی معاملات۔ لین دین کے تعلقات اور سزا و جزا کے احکام وغیرہ میں زمانہ کی مقتضیات کے مطابق تبدیلی ضروری اور لازمی ہے۔

المختصر قدس الاقداس کے معنی وہ شریعتِ روحانیہ ہے جو کبھی متغیر و متبدل اور منسوخ نہیں ہوتی۔ اور شہرِ مقدس سے مراد شریعتِ جسمانیہ ہے جو منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور یہ شریعتِ جسمانیہ جس کو شہرِ مقدس کہا گیا ہے ۱۲۶۰ سال تک پائمال ہوگی۔

"اور اپنے دوگواہوں کو دوں گا جو ٹاٹ پہن کر ایک ہزار دو سو ساٹھ دن تک نبوت کرینگے"۔

ان دوگواہوں سے مراد حضرت رسول اللہ اور حضرت علی ابن ابو طالب ہیں۔ قرآن میں خدا محمد رسول اللہ کو خطاب فرماتا ہے۔ "انا ارسلناك شاهداً ومبشراً ونذيرا" یعنی ہم نے تجھکو گواہی دینے والا۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ٹھہرایا ہے۔" گواہ اُسے کہتے ہیں جس کی تصدیق سے معاملات ثابت ہوتے ہیں۔ اِن دوگواہوں کے احکام ۱۲۶۰ روز یعنی ۱۲۶۰ سال تک جاری رہینگے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع کی مانند حضرت محمد اصل تھے اور حضرت علی شاخ۔ پھر فرماتا ہے۔ "یہ دوگواہ ٹاٹ پہن کر" یعنی بظاہر کوئی نیا لباس پہنے نہ ہونگے۔ اور ان کا امر نیا امر نظر نہ آئے گا۔ کیونکہ ان کی شریعت کے روحانی احکام انجیل کے مطابق ہیں۔ اور جسمانی احکام زیادہ تر احکامِ توریت کے مطابق ہیں۔ پرانے لباس میں یہی کنایہ ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ "یہ دو زیتون کے درخت اور دو چراغدان ہیں جو خداوند زمین کے سامنے کھڑے ہیں۔"
اِن دو بزرگوں کو زیتون کے دو درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں رات کو تمام چراغ زیتون کے تیل سے روشن ہوتے تھے۔ یعنی اِن دو نفوس سے حکمتِ الٰہیہ کا تیل جو دُنیا کو روشن کرتا ہے ظاہر ہوگا۔ اور انوارِ الٰہی روشن اور ضیاپاش ہونگے۔ اس لئے چراغدان بھی کہا ہے۔ چراغدان روشنی کی جگہ ہے۔ اِس سے روشنی نکلتی ہے۔ اسی طرح اِن دو نورانی بزرگوں سے نورِ وحدانیت روشن و تاباں ہوگا۔ پھر فرماتا ہے کہ "خداوند کے حضور کھڑے ہیں"۔ یعنی خدا کی خدمت میں کمربستہ ہیں۔ اور خدا کی مخلوق کی تربیت کر رہے ہیں۔ وحشی و خانہ بدوش قبائلِ عرب کی ایسی تربیت کی کہ اِس زمانہ میں مسلمان معارجِ ترقی کے اَوجِ اعلیٰ پر پہنچ گئے۔ اور اُن کی شہرت تمام جہان میں پھیل گئی۔ "اور اگر کوئی چاہے کہ اُنھیں اذیت پہنچائے تو اُن کے مُنہ سے آگ نکل کر اُن کے دشمنوں کو جلا دیگی"۔
مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص اُن کا مقابلہ نہ کرسکے گا۔ یعنی اگر کوئی چاہیگا کہ اُن کی تعلیم یا اُن کی شریعت میں رخنہ ڈالے تو وہ شریعت جو اُن کے مُنہ سے اجمالاً و تفصیلاً ظاہر ہوگی، اُسے گھیرے گی اور اُس کا کام تمام کردے گی۔ اگر کوئی شخص اُن سے بُغض و عداوت کرے گا یا اُنھیں اذیت پہنچانا چاہے گا تو اُن کے مُنہ سے ایک حکم صادر ہوگا جو اُسے بھسم کردے گا۔ چنانچہ ایسا ہی واقع ہوا کہ اُن کے سب دشمن مغلوب و برباد و معدوم ہوگئے۔ اور خدا نے کھُلم کھُلا اُن کی مدد فرمائی۔ پھر فرماتا ہے "وہ آسمان کے بند کرنے کی قوت رکھتے ہیں تاکہ اُن کی نبوت کے دِنوں میں بارش نہ برسے۔" یعنی وہ اپنے دَور میں سُلطان ہیں۔ یعنی شریعت و تعالیم حضرت محمدؐ اور بیان و تفاسیر حضرت علیؑ آسمانِ فیض ہیں۔ اگر وہ اِس فیض کو دینا چاہیں تو اس کے دینے پر قادر ہیں۔ اور اگر نہ چاہیں تو بارش نہ برسے گی۔ بارش سے اس جگہ فیض مُراد ہے۔ پھر فرماتا ہے۔ "اور پانیوں پر بھی قدرت رکھتے ہیں کہ اُنھیں خون بنا دیں۔" یعنی حضرت محمد کی نبوت حضرت موسیٰ کی نبوت کی مانند ہے اور حضرت علی کی قوت حضرت یوشع کی قوت جیسی ہے۔ اگر چاہتے تو نیل کے پانی کو قبطیوں اور منکروں کے لئے خون بنا دیتے۔ یعنی جو کچھ اُن مُنکروں کی زندگی کا سبب ہے وہی اُن کے تکبر و جہل کے سبب اُن کی موت کا باعث بنا دیتے۔ مثلاً فرعون اور اہلِ فرعون کی سلطنت و ثروت و قدرت جو اس قوم کی زندگی کا باعث تھی انکار و مخالفت اور تکبر کے سبب موت و ہلاکت و کمزوری و ذلت و بیکسی کا باعث ہوئی۔ لہٰذا وہ دو گواہ قوموں کو ہلاک کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ پھر فرمایا ہے۔ "جب کبھی چاہینگے دُنیا کو قسم قسم کی بلاؤں میں مبتلا کرینگے۔" یعنی ظاہری قدرت و غلبہ بھی رکھتے ہونگے کہ سخت دلوں اور ظالموں کی تربیت کریں۔ کیونکہ خدا نے اِن دو گواہوں کو ظاہری اور باطنی قوت عنایت فرمائی تھی تاکہ سخت دل۔ وحشی اور خونخوار و ظالم عربوں کو جو بھیڑیئے اور پھاڑنے والے درندوں کی مانند تھے،

اُدب سکھائیں اور اُن کی تربیت کریں۔ پھر فرماتا ہے "اور جب اپنی گواہی کو پورا کر چکینگے" یعنی جب اِس کام کو جس پر مامور ہیں جاری کر چکیں گے۔ پیغاماتِ الٰہی کو پہنچا چکیں گے۔ شریعت خداوندی کو رائج کر چکینگے۔ اور تعالیم آسمانی کو پھیلا دینگے۔ تاکہ روحانی زندگی کے آثار لوگوں میں ظاہر ہوں اور عالمِ انسانی کے فضائل چمک اُٹھیں۔ اور وحشی اقوام پوری پوری ترقی حاصل کریں۔ تو پھر فرماتا ہے۔ "وہ حیوان جو غار سے نکلتا ہے اُن سے جنگ کرکے اُن پر غلبہ پائے گا اور اُنھیں مار ڈالے گا" اِس حیوان سے مُراد بنی اُمیّہ ہیں۔ جو غارِ ضلالت سے نکلے تھے اور جنھوں نے شریعتِ محمدی اور حقیقتِ عُلوی پر جو محبّت اللہ ہے ہجوم کیا۔ پھر فرماتا ہے۔ "اُن دو گواہوں سے جنگ کرے گا" جنگ سے مُراد رُوحانی جنگ ہے یعنی بالکل اُن دو گواہوں کے چال چلن اور تعلیمات کے خلاف چلیگا۔ اور اُن فضائل اور خوبیوں کو جو اُن دو گواہوں کی قوّت سے لوگوں میں پھیلی ہونگی۔ مٹا دے گا۔ اور حیوانی عادات اور نفسانی شہوات کو جاری کرے گا۔ یعنی اُس حیوان کی ضلالت کی تاریکی کُل دُنیا پر چھا جائے گی اور اِن دو گواہوں کو مار دیگی یعنی اُن کی روحانی زندگی کو قوم کے درمیان سے محو کر دے گا۔ اور اُن کے خُدائی قوانین اور آسمانی تعلیمات کو بالکل درمیان سے اُٹھا دے گا۔ اور خُدا کے دین کو پاؤں تلے روندے گا اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ مگر ایک جسدِ مُردہ۔ بے روح۔ پھر فرماتا ہے۔ "اور اُن کے لاشے شہرِ عظیم کے شارعِ عام میں جو رُوحانی معنوں میں سدوم و مصر کے نام سے مشہور ہے اُس جگہ جہاں اُن کا خداوند بھی مصلوب ہوا پڑے رہینگے۔" اُن کے لاشوں سے مُراد شریعت اللہ ہے۔ اور شارعِ عام کے معنے عموم کے سامنے ہیں۔ اور سدوم و مصر اور وہ جگہ جہاں اُن کا خداوند بھی مصلوب ہوا۔ اِس سے مُراد یہ قلعۂ شام ہے۔ خاصکر یوروشلیم۔ کیونکہ بنی اُمیّہ اِس جگہ حکومت رکھتے تھے۔ اور خدائی شریعت اور الٰہی تعالیم پہلے اِس جگہ کے درمیان سے اُٹھ گئیں۔ اور ایک جسم بے رُوح باقی رہ گیا تھا۔ اُن کے لاشوں سے مُراد شریعت اللہ ہے جو ایک مُردہ بے رُوح جسم کی مانند رہ گئی تھی۔ پھر فرماتا ہے کہ :-

"لوگوں اور فرقوں اور زبانوں اور قوموں کے بعض اشخاص اِن لاشوں کو ساڑھے تین دن تک دیکھا کرینگے۔ مگر اجازت نہ دینگے کہ اُنھیں دفن کر دیا جائے۔"

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کُتبِ مقدّسہ کی اصطلاح کے مطابق ۳½ دن ساڑھے تین سال ہیں اور ساڑھے تین سال ۴۲ مہینے ہوتے ہیں۔ ۴۲ مہینے ۱۲۶۰ دن ہیں۔ اور ہر دن کتابِ مقدّس کی عبارت کے مطابق ایک سال ہے۔ پس مطلب ۱۲۶۰ سال ہے۔ جو دورِ قرآن کا زمانہ ہے۔ لوگ۔ فرقے اور قومیں اُن کی لاشوں کو دیکھینگے یعنی شریعت اللہ کا تماشہ دیکھیں گے۔ پر اُس کے بموجب عمل نہ کرینگے اور

اجازت نہ دینگے کہ اُن کی لاشوں یعنی شریعت اللہ کو قبر میں رکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بظاہر تو شریعۃ اللہ کے پابند ہونگے۔ اسے اپنے میں سے بالکل جانے نہ دینگے اور اس کے جسم کو بالکل نابود نہ ہونے دینگے۔ مگر حقیقت کو ترک کر دیں گے۔ صرف ظاہری شریعت اللہ کے ذکر و نام کو باقی رہنے دینگے۔ ان لوگوں، قوموں اور فرقوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن کے زیر سایہ جمع ہوئے ہیں جو اس بات کی اجازت نہیں دینگے کہ بظاہر بھی امر اللہ اور شریعت خدا محو و نابود ہو جائے۔ چنانچہ نماز و روزہ تو ہیں۔ مگر دین اللہ کے اصل اصول یعنی اخلاق حسنہ اور نیک چال چلن۔ خدائی اسرار کی آگاہی اور روحانیت درمیان سے جا چکی ہیں۔ عالم انسانی کے انوار فضائل جو محبت اللہ اور معرفت خدا سے پیدا ہوتے ہیں گم ہو چکے ہیں اور ظلم و بیداد اور شہوات نفسانی و رذائل شیطانی کی تاریکی غالب ہو رہی ہے۔ شریعت اللہ کا جسم تن مردہ کی طرح سب کے سامنے موجود ہے۔ اور ۱۲۶۰ دن یا ۱۲۶۰ سال کی مدت میں جو دور محمدی کا زمانہ ہے جو کچھ ان دو بزرگوں نے بنایا اُسے اُمت نے گنوا دیا اور شریعت اللہ کے اصول کو بھلا دیا۔ فضائل عالم انسانی جو خدائی عنایات اور اس شریعت کی جان تھے انھیں محو کر دیا۔ یہانتک کہ صداقت و عدل، محبت و اُلفت، پاکیزگی و انقطاع کُل خدائی صفات اُٹھ گئی ہیں۔ شریعت اللہ میں صرف ایک نماز و روزہ باقی رہ گیا ہے۔ ۱۲۰۰ سال تک جس سے دورۂ قرآن مراد ہے یہ حال رہا گویا کہ یہ دو بزرگ فوت ہو چکے ہیں۔ اور اُن کے بے جان جسم باقی پڑے ہیں۔ پھر فرماتا ہے۔ "اور زمین کے رہنے والے اُن پر خوشی اور شادمانی کرینگے اور ایک دوسرے کے پاس ہدیئے بھیجینگے۔ کیونکہ ان دو نبیوں نے زمین کے رہنے والوں کو ستایا تھا۔" زمین کے رہنے والوں سے مراد دوسری اقوام اور فرقے ہیں۔ مثلاً اہل یورپ اور ایشیا کے مقامات بعیدہ کے رہنے والے لوگ۔ ان سب نے جب دیکھا کہ اسلام کے اخلاق بگڑ چکے ہیں اور یہ لوگ شریعت اللہ کو ترک کر چکے ہیں اور حمیت و غیرت ان میں سے اُٹھ گئی ہے تو خوش و خرم ہوئے۔ کہ اب یہ قوم دوسری اقوام سے مغلوب ہوگی۔ کیونکہ اس کے اخلاق بگڑ گئے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بالکل وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیں کہ یہ قوم جو اقتدار کے اوج پر تھی آج کیسی اسیر و ذلیل ہے۔ دوسری قوموں نے ایک دوسرے کے پاس ہدیئے بھیجے یعنی ایک دوسرے کی مدد کی کیونکہ ان دو نبیوں نے زمین کے رہنے والوں کو ستایا تھا۔ یعنی دُنیا کی تمام قوموں اور ملتوں پر غالب ہوئے تھے اور انھیں مغلوب کیا تھا۔ پھر فرماتا ہے:-

"ساڑھے تین دن کے بعد زندگی کی روح خداوند کی طرف سے اُن میں در آئی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ اور اُن کے دیکھنے والوں پر ایک بھاری خوف طاری ہوا۔"

۳½ دِن جیسا کہ پہلے بیان ہوا ۱۲۶۰ سال ہیں۔ اِن دونوں بزرگوں سے جن کے جسم بے روح پڑے تھے مُراد وہ تعالیم و شریعت ہیں جن کی حضرت محمدؐ نے بنیاد ڈالی اور جنھیں حضرت علی نے رائج کیا۔ جن کی حقیقت اندر سے نکل گئی تھی اور صِرف صورت باقی رہ گئی تھی۔ دوبارہ اِن جسموں میں ایک روح آئی وہ اُصول و تعالیم پھر جاری ہوئیں یعنی شریعت اللہ کے کلماتِ روحانی جو جسمانیات میں بدل گئے تھے۔ اور فضائل جو رذائل بن گئے تھے۔ محبت اللہ جو عداوت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ نورانیت جو ظلمت میں بدل گئی تھی اخلاقِ رحمانی جو اعمالِ شیطانی کی صورت میں رونما ہو گئے تھے۔ عدل جو ظلم میں بدل گیا تھا۔ رحمت جو بغض میں تبدیل ہوگئی تھی۔ سچ جو جھوٹ بن گیا تھا۔ ہدایت جو گمراہی ہوگئی تھی اور پاکیزگی جو شہواتِ نفسانی میں بدل گئی تھی۔ ۳½ روز کے بعد جو باصطلاحِ کُتبِ مقدسہ ۱۲۶۰ سال ہوتے ہیں دوبارہ جلوہ نما ہوئے یعنی تعالیم الٰہی اور اور فضائل و کمالاتِ خدائی اور فیوضاتِ رُوحانی حضرت اعلیٰ (باب) کے ظہور اور حضرتِ قدّوس کی متابعت سے پھر تازہ ہوئے۔ نسائمِ پاک چلیں۔ انوارِ حقیقت روشن ہوئے۔ بہارِ جاں پرور آئی۔ ہدایت کی صبح روشن ہوئی اور وہ دو بے جان جسم پھر زندہ ہوئے۔ یہ دو بزرگوار ایک بانی (حضرت باب) اور دوسرے مروّج (حضرتِ قدّوس) کھڑے ہوئے۔ یہ دو چراغ دانوں کی مانند تھے۔ کیونکہ انھوں نے نورِ حقیقت سے جہان کو روشن کیا۔ پھر فرماتا ہے :۔

"آسمان سے اُنھوں نے ایک آواز سُنی جو کہتی تھی اِس طرف اوپر آؤ۔ پس وہ آسمان کو چڑھ گئے۔"

اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُنھوں نے آسمانِ پنہاں سے خدا کی آواز کو سُنا کہ جو کچھ میری تعلیم و بشارت میں سے واجب و لازم تھا تم نے جاری کیا اور میرے پیغام کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ ندای حق کو بلند کیا اور اپنے فرائض کو کما حقہ، پورا کیا۔ اب مسیح کی مانند تم کو چاہیئے کہ جان کو جاناں پر فدا کرو اور جامِ شہادت نوش کرو۔ چنانچہ وہ آفتابِ حقیقت اور قمرِ ہدایت دونوں حضرت مسیح کی مانند شہادتِ کبریٰ کے اُفق میں غروب ہو کر آسمانِ ملکوت کی طرف چڑھ گئے۔ پھر فرماتا ہے :۔

اور اُن کے دشمنوں نے اُنھیں دیکھا

اِس کے معنے یہ ہیں کہ ان کے بہت سے دشمنوں نے اُن کی شہادت کے بعد اُن کے درجہ کی شان اور اُن کی نیکی کی شوکت کو پہچانا۔ اور اُن کی بزرگی اور اُن کے کمالات کی گواہی دی۔

پھر فرماتا ہے :۔

"اور اُس گھڑی ایک بڑا بھونچال آیا اور شہر کا دسواں حصہ گر گیا
اور اُس بھونچال میں سات ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔"

یہ بھونچال شیراز میں حضرت اعلیٰ (باب) کی شہادت کے بعد آیا تھا۔ جس سے شہر تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اور بہت سے آدمی ہلاک ہوئے تھے۔ ایسے ہی بیماریوں۔ وباؤں۔ قحط اور کال اور بھوک اور وبال سے ایسی سخت کھلبلی پڑی تھی کہ پہلے اس جیسی نہ کبھی دیکھی نہ سُنی تھی۔

پھر کہتا ہے:۔

"اور باقی بچے ہوؤں نے ڈر کر آسمان کے خُدا کی تعریف کی"

جب یہ بھونچال فارس میں آیا تو سب جو زندہ رہے رات دن نالہ و فغاں کرتے تھے اور خدا کی تمجید و تسبیح میں مشغول رہتے تھے۔ لوگ اس قدر خوف زدہ اور بے چین رہتے تھے کہ رات کو آرام کی نیند نہ سو سکتے تھے۔

پھر فرماتا ہے:۔

"دوسرا رنج گذر گیا اور تیسرا رنج چلا آتا ہے"

پہلا رنج حضرت محمدؐ بن عبداللہ علیہ السّلام کا ظہور تھا۔ دوسرا رنج حضرت اعلیٰ (المجد والثّناء) کا ظہور تھا۔ تیسرا رنج یوم عظیم ہے جو ربّ الافواج کے ظہور کا زمانہ اور جمال موعود کی تجلّی کا دن ہے۔ اس مطلب کا اشارہ حزقیل کی کتاب کے تیسویں باب میں مذکور ہے (دیکھو باب ۳۰۔ آیت ۲ و ۳)

چنانچہ فرمایا ہے:۔

"اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا اور کہا اَی فرزندِ انسان نبوّت کر اور کہہ کہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے۔ چلّا کر کہہ کہ رنج کا دن نزدیک ہے اور خداوند کا دن قریب ہے۔"

پس معلوم ہوا رنج کا دن خداوند کا دن ہے۔ کیونکہ اُس دن غافلوں کے لئے رنج ہوگا۔ گنہگاروں کے لئے رنج ہوگا۔ اور جاہلوں کے لئے رنج ہوگا۔ اس لئے کہتا ہے کہ دوسرا رنج گذر گیا۔ اور دیکھو تیسرا رنج چلا آتا ہے۔ یہ تیسرا رنج جمالِ مُبارک کے ظہور کا دن ہے۔ یوم خدا ہے جو حضرتِ اعلیٰ کے ظہور کے دن کے نزدیک ہے۔

پھر فرماتا ہے:۔

"اور ساتویں فرشتے نے پھونکا اور آسمان پر بڑی آوازیں یہ کہتی ہوئی سُنائی دیں کہ دُنیا کی بادشاہتیں ہمارے خداوند اور اُس کے مسیح کی ہوگئیں اور وہ ابد تک بادشاہت کریگا۔"

یہاں ساتویں فرشتے سے مُراد وہ انسان ہے جو صفاتِ ملکوتی سے متّصف فرشتوں کی خُلق و خُو کے ساتھ اُٹھے گا۔ اور آوازیں بلند ہونگی۔ تاکہ مظہر الٰہی کے ظہور کی خبر مشہور ہو اور پھیل جائے کہ (آج) ربّ الافواج کے ظہور کا دن ہے۔ اور یہ دَور حضرت پروردگار کا دَورِ رحمانی ہے۔ نبیوں کی کُل کتابوں

اور صحیفوں میں ایک موعود کا ذکر ہے کہ اُس خداوند کے دن خدائی سلطنت قائم ہوگی۔ اور جہان از سرِ نو بنایا جائے گا۔ دُنیا کے جسم میں ایک نئی روح پھونکی جائے گی۔ بہارِ الٰہی کا موسم آئیگا۔ ابرِ رحمت برسے گا۔ اور آفتابِ حقیقت چمکیگا۔ نسیم رُوح پرور چلے گی۔ اور عالمِ انسانی ایک نیا چولہ بدلے گا۔ روئے زمین بہشت بریں بن جائے گی۔ عالمِ بشر تربیت پائے گا۔ جنگ و جدال۔ جھگڑے اور فساد اُٹھ جائینگے۔ اور راستی و درستی۔ آشتی و خداپرستی جلوہ نما ہوگی۔ اُلفت و محبت و یگانگت جہان کو گھیرے گی۔ اور خداوند ابدالآباد تک حکمرانی کرے گا۔ یعنی ہمیشہ رہنے والی رُوحانی سلطنت قائم ہوگی۔ آج کا دن خدا کا دن ہے۔ آجتک جو دن آئے اور گئے وہ نبیوں کے دن تھے۔ مثلاً موسیٰ کا دن۔ مسیح کا دن۔ ابراہیم کا دن۔ اِسی طرح سب نبیوں کے دن تھے۔ مگر آج کا دن خُدا کا دن ہے۔ کیونکہ آج کے دن آفتابِ حقیقت نہایت آب وتاب سے چمک رہا ہے۔

پھر فرماتا ہے :-

"اور وہ ۲۴ بزرگ جو خداوند کے حضور اپنے تخت پر بیٹھے تھے، مُنہ کے بَل گرے اور خدا کو سجدہ کیا اور کہا اے خداوند خُدای قادرِ مطلق جو ہے اور تھا اور رہے گا ہم تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے اپنی بڑی قدرت ہاتھ میں لی اور سلطنت کرنے لگا۔

ہر دَور میں اوصیا و اصفیا، بارہ شخص ہوئے ہیں۔ حضرت یعقوب کے بارہ فرزند تھے۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بارہ قبیلوں کے بارہ نقیب رئیس تھے۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں بارہ حواری اور حضرت محمدؐ کے ایّام میں بارہ امام تھے۔ لیکن اِس ظہورِ اعظم میں دوسرے ظہورات کے دِنوں سے دُوگنے یعنی ۲۴ نفوس ہیں۔ کیونکہ اِس ظہور کی عظمت کا تقاضا یہی ہے۔ یہ مقدّس نفوس خدا کے حضور اپنے تختوں پر بیٹھے ہیں۔ یعنی سلطنتِ ابدی کر رہے ہیں۔ یہ ۲۴ بزرگوار اگرچہ سلطنتِ ابدی کے تخت پر متمکن ہیں تو بھی اِس مظہرِ ظہورِ کُلّی کے سامنے ساجد و خاضع و خاشع ہیں۔ کہتے ہیں کہ "شکر کرتے ہیں اے خداوند قادرِ مطلق جو تھا اور ہے اور رہیگا اِس لئے کہ تو نے اپنی بڑی قوّت کو ہاتھ میں لیا اور خود سلطنت کرنے لگا"۔ یعنی تو اپنی تعلیمات کو پوری طرح جاری کرے گا اور زمین کے سب رہنے والوں کو اپنے سایہ تلے لائے گا۔ اور سب انسانوں کو ایک خیمہ میں جمع کرے گا۔

اگرچہ سلطنت ہمیشہ خدا ہی کی ہے۔ اور وہ ہمیشہ سلطنت کرتا رہے گا۔ مگر یہاں مسکن سلطنت اُس کا مظہرِ نفس ہے۔ جو تمام ان تعالیم و احکام کو جو عالمِ انسانی کی جان اور ہمیشہ کی زندگی ہیں جاری کرے گا۔ یہ مظہرِ کُلّی دُنیا کو رُوحانی طاقتوں سے فتح کرے گا۔ جنگ و جدال سے نہیں۔ جہان میں تیر و تلوار نہیں بلکہ صُلح و سلامتی پھیلائے گا۔ آسمانی بادشاہت کو جنگ کی طاقت سے نہیں بلکہ سچّی محبت سے قائم کرے گا۔ خدائی تعلیم کو

سختی اور ہتھیاروں سے نہیں بلکہ مہربانی اور راستبازی سے جاری کرے گا۔ ایسی تربیت کرے گا کہ وہ اقوام جو حالات کے فرق۔ عادات و اخلاق کے اختلاف اور مذاہب کے گوناگون ہونے کے سبب بھیڑئے اور برّے سانپ اور شیر خوار بچّے اور شیر و بکری کی طرح ہونگی آپس میں ہمدم و ہمراز اور ہم آغوش ہو جائیں گی۔ جنسی فرق دینی مخالفت اور قومی امتیاز بالکل مٹ جائینگے۔ اور سب شجرۂ مُبارکہ کے سایہ تلے نہایت اُلفت و التیام سے رہیں گے۔

پھر فرماتا ہے :۔

"قومیں ناراض ہوئیں۔ کیونکہ تیری تعالیم کُل اقوام کی نفسانی خواہش کے خلاف تھیں۔ تیرا غضب ظاہر ہوا۔"

یعنی سب صریح نقصان میں مُبتلا ہوئے۔ کیونکہ اُنھوں نے تیری وصایا اور نصائح و تعالیم کی پیروی نہ کی۔ اور تیرے فیضِ ابدی سے محروم اور انوارِ شمسِ حقیقت سے محجوب رہے۔

پھر فرماتا ہے :۔

"مُردوں کا وقت آیا کہ اُن کا انصاف ہو۔"

مُردوں سے مُراد وہ لوگ ہیں جو محبّت اللہ کی روح سے محروم اور پاک حیاتِ ابدیہ سے بے نصیب ہیں۔ ایسے لوگوں کی عدالت کا وقت آیا۔ یعنی یہ لوگ اپنی استعداد و استحقاق کے مطابق ظاہر ہونگے۔ اور اِن اسرار کی حقیقت واضح کر دی جائے گی۔ کہ یہ لوگ دُنیا میں ایسے پست درجہ میں ہیں کہ فی الحقیقت مُردہ کہلانے کے قابل ہیں۔

پھر فرماتا ہے :۔

"تاکہ بندگان یعنی نبیوں اور پاک لوگوں اور خدا سے ڈرنے والے انسانوں کو خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے اُجرت دے گا۔"

یعنی نیکوں کو اپنے لا انتہا فضل سے برگزیدہ کرے گا اور آسمانی ستاروں کی طرح عزّتِ قدیمہ کے آسمان میں روشن فرمائے گا۔ اور اُنھیں ایسا چال چلن عطا کرے گا جو عالمِ انسانی کو منوّر کرے گا۔ ہدایت کا سبب ہوگا۔ اور ملکوتِ خداوندی میں ہمیشہ کی زندگی کا باعث ہوگا۔

پھر فرماتا ہے :۔

"اور مفسدانِ زمین کو برباد کرے گا۔"

یعنی غافل لوگوں کو بالکل محروم کر دے گا۔ اندھوں کا اندھاپن اور بیناؤں کی بینائی ظاہر ہوگی۔ گمراہوں کی جہالت و نادانی اور اہلِ ہدایت کا علم و دانائی ظاہر ہو جائے گی۔ اِسی طرح زمین کے مفسد برباد کر دیئے جائینگے

اِس مقام کے بعد فرماتا ہے :-

"اور قدسِ خدا آسمان میں کھولی جائے گی"

یعنی یوروشلیم الٰہی پیدا ہوگا اور قدس الاقداس ظاہر ہوگا۔ اہلِ عرفان کی اصطلاح میں قدس الاقداس شریعتِ الٰہی کا جوہر یعنی حقیقی تعالیم ربانی ہیں جو کسی نبی کے زمانے میں تبدیل نہیں ہوتیں۔ جیساکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ قدسِ یوروشلیم کو شریعت اللہ کی حقیقت سے جو قدس الاقداس ہے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور جسمانی احکام۔ دُنیوی معاملات۔ رسم و رواجات اور قوانین و عبادات کو شہر یورشلیم کہا ہے۔ اسی لئے اسے یوروشلیم آسمانی کہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اِس شمسِ حقیقت کے زمانے میں انوارِ الٰہی چمک و دمک سے ضیا افشانی کرینگے اس لئے تعالیم الٰہی کا جوہر عالمِ امکان میں جلوہ افروز ہوگا۔ اور جہل و نادانی کی تاریکی زائل ہو جائے گی۔ جہان ایک دوسرا جہان بن جائے گا۔ اور زمین سراپا نور ہو جائے گی۔ اِسی لئے فرمایا ہے کہ قدس الاقداس ظاہر ہوگا۔

پھر فرماتا ہے :-

"قدسِ خدا آسمان میں کھولا جائے گا"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اِن تعالیم الٰہی کے پھیلنے۔ اِن اسرار ربانی کے ظاہر ہونے اور شمسِ حقیقت کی ضیاباری کے سبب امن و کامرانی کے دروازے ہر طرف کھُل جائیں گے اور سماوی خیر و برکت کے آثار ظاہر ہونگے۔ پھر فرماتا ہے :-

"اُس کے عہد نامے کا صندوق اُس کے قُدس میں ظاہر ہوگا"

یعنی کتابِ[1] عہدی اُس قُدس میں کھولی جائے گی اور لوحِ میثاق ثبت ہوگی۔ عہد و پیمان کے معنی ظاہر ہونگے۔ ندای الٰہی شرق و غرب کو گھیر لے گی اور امراللہ کا آوازہ جہانگیر ہوگا۔ اہلِ نقض خوار و ذلیل ہونگے اور اہلِ ثبوت عزیز و جلیل۔ کیونکہ وہ کتابِ عہد کے مطیع اور خدا کے میثاق پر ثابت و مستقیم ہونگے۔

پھر فرماتا ہے :-

"بجلی اور گرج۔ آواز و زلزلہ اور سخت اولوں کی بارش نازل ہوئی"

یعنی کتابِ عہد کے ظہور کے بعد ایک بڑا طوفان برپا ہوگا اور قہر و غضب الٰہی کی بجلی چمکے گی۔ نقضِ میثاق کے رعد کی گرج بلند ہوگی۔ شبہات کا زلزلہ آئے گا اور عذاب کے اولے ناقضین پر برسیں گے اور مدعیانِ ایمان فتنہ و امتحان میں پڑینگے

---

[1] حضرت بہاءاللہ کی ایک کتاب جسمیں آپ صریح الفاظ میں حضرت عبدالبہاء کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آپ کے بعد سب اُن کی طرف رجوع کریں۔

(یسعیاہ)

اشعیا کے گیارھویں باب کی تفسیر

اشعیا کے گیارھویں باب کی ابتدائی آیات میں فرماتا ہے۔

"یسیؔ کے تنے سے ایک کونپل نکلے گی اور اُس کی جڑوں سے ایک شاخ برآمد ہوگی اور خُداوند کی رُوح اُس پر ٹھیرے گی۔ یعنی حکمت وفہم کی رُوح۔ مشورت و قوت کی رُوح۔ معرفت اور خوفِ خُدا کی رُوح۔ اُس کی خوشی خُدا کے خوف میں ہوگی۔ وہ اپنے آنکھوں کے دیکھنے کے مطابق حکم نہ کرے گا اور نہ اپنے کانوں کے سُننے کے مطابق فیصل کرے گا بلکہ وہ راستی سے مسکینوں کا انصاف کرے گا اور انصاف سے زمین کے خاکساروں کے لئے انفصال کرے گا۔ اور وہ اپنے مُنہ کی لاٹھی سے زمین کو ماریگا اور اپنے لبوں کے دَم سے شریروں کو فنا کر ڈالے گا۔ اُس کی کمر کا پٹکا راستبازی ہوگی۔ اور اُس کے پہلو امانت کے پٹکے سے کسے ہونگے۔ اُس وقت بھیڑیا برّے کے ساتھ رہے گا اور چیتا حلوان کے ساتھ بیٹھے گا۔ اور بچھیا اور شیر بچّہ اور پالا ہوا بیل مِلے جُلے رہینگے اور ایک ننھّا بچّہ اُن کی پیش روی کرے گا۔ گائے اور ریچھنی مِل کر چریں گی۔ اُن کے بچّے ملے جُلے بیٹھیں گے اور شیر ببر بیل کی طرح پوال کھائے گا اور دودھ پیتا بچّہ سانپ کی بِل کے پاس کھیلے گا۔ اور وہ لڑکا جس کا دودھ چھڑایا گیا ہوگا کالے کی بانبھنی میں ہاتھ ڈالے گا۔ وہ میرے مقدس کوہ کے اطراف میں کسی کو دُکھ نہ دیں گے۔ اور ضرر نہ پہنچائیں گے۔ کیونکہ جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہوا ہے اُسی طرح زمین خُدا کے عرفان سے معمور ہوگی"۔

انتہیٰ

یسیؔ کے تنے سے شاخ کا نکلنا حضرت مسیح پر صادق آ سکتا تھا۔ کیونکہ یوسف حضرت داوٗد کے والد یسیؔ کے خاندان سے تھا۔ مگر چونکہ حضرت مسیح روح الٰہی سے موجود ہوئے تھے اِس لئے اپنے آپ کو ابن اللہ کا نام دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ تفسیر اُن پر درست آتی۔ علاوہ ازیں وہ واقعات

جن کا اُس نہال کے زمانہ میں ظاہر ہونا بیان کیا گیا ہے اگر استعارةً لئے جائیں تو اُن میں سے بعض حضرت مسیح کے زمانہ میں واقع ہوئے تھے نہ کہ سب۔ اگر استعارةً نہ لئے جائیں تو ایک بھی اُن میں سے آنحضرت کے زمانے میں ظہور پذیر نہیں ہوا۔ جیسے چیتا اور حلوان۔ بچھیا اور شیر۔ سانپ اور دودھ پیتا بچہ۔ اِس بات کی رمز و کنا یہ ہے کہ مختلف اقوام وامم۔ جنگجو طوائف اور حریف فرقے جو دشمنی اور عداوت میں بھیڑئے اور برے کی طرح تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کے دمِ رُوحانی سے اُلفت واتحاد کی زندگی پاکر آپس میں شیر و شکر ہوگئے۔ لیکن

"وہ میرے کوہِ مقدس کے اطراف میں کسی کو دُکھ نہ دینگے اور ضرر نہ پہنچا ئینگے۔ کیونکہ جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہوا ہے اسی طرح زمین معرفتِ خدا سے معمور ہوگی۔"

یہ کیفیت حضرت مسیح کے ظہور میں واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ اَب تک حریف اور جنگجو اقوام دُنیا میں موجود ہیں۔ اسرائیل کے خدا کو ماننے والے بہت کم ہیں اور اکثر لوگ معرفت اللہ سے بے بہرہ ہیں۔

اِسی طرح صُلح عمومی حضرت مسیح کے وقت میں واقع نہیں ہوئی۔ یعنی حریف و عداوت گزیں اقوام کے درمیان صُلح وصلاح نہیں ہوئی۔ نزاع و جدال نہیں اُٹھا۔ خلُوص ومحبت جلوہ گر نہیں ہوئی۔ حتّٰی کہ خود مسیحی فرقوں اور قوموں میں عداوت وبغض وجنگ وجدال نہایت سختی کے ساتھ جاری ہے۔

لیکن حضرت جمالِ مُبارک کے حق میں یہ پیشینگوئی حرف بحرف مطابق آتی ہے۔ اور اِس دَورِ بدیع میں جہان ایک نیا جہان بن جائے گا۔ اور عالمِ انسانی کمال آسائش اور زینت سے جلوہ نما ہوگا۔ جنگ و جدال، جھگڑے اور فساد سب امن وامان اور آشتی سے بدل جائیں گے۔ طوائف و اقوام۔ قبائل وممالک میں اُلفت ومحبت جلوہ نما ہوگی۔ اور التیام و ارتباط استحکام حاصل کرے گا۔ حتّٰی کہ انجامِ کار جنگ بالکل اُٹھ جائے گی اور جب کتاب اقدس کے احکام جاری ہونگے تو حکومتوں اور قوموں کی لڑائیاں اور جھگڑے محکمۂ عمومیہ میں نہایت انصاف سے فیصل ہونگے اور روزمرّہ کی مُشکلات حل ہوجایا کرینگی دُنیا کے پانچوں برِاعظم ایک ہو جائینگے اور متعدد قومیں ایک قوم بن جائیں گی۔ روئے زمین ایک وطن اور نوعِ انسان ایک قوم ہوجائے گی۔ ممالک کا ارتباط اور قوموں کا میل مِلاپ اور اُلفت والتیام اِس حدتک پہنچ جائے گا کہ نوعِ انسان ایک قبیلہ اور ایک خاندان بن جائے گی۔ محبتِ آسمانی کا نور ضیا پاشی کرے گا اور بُغض وعداوت کی تاریکی دُنیا سے بہت حد تک دور ہو جائے گی۔ صُلحِ عمومی مرکزِ جہان میں خیمہ زن ہوگی۔ شجرۂ مُبارکۂ حیات ایسا نشو ونما پائے گا کہ مشرق ومغرب اس کے سایہ تلے ہوں گے۔ قوی اور کمزور۔ امیر وفقیر۔ جنگجو طوائف اور عداوت گزیں قومیں جو بھیڑئے اور برے۔ چیتے اور حلوان۔

بچھیا اور شیر کی طرح ہیں نہایت محبّت و اُلفت اور عدالت و انصاف سے آپس میں مل جل کر رہینگی جہاں علوم و معارف، اسرارِ کائنات اور معرفتِ خدا سے معمور ہو جائے گا۔

اَب مُلاحظہ فرمائیں کہ اِس عصرِ عظیم میں جو حضرت جمالِ مُبارک کا زمانہ ہے علوم و معارف نے کس قدر ترقی کی ہے اور اسرارِ کائنات کس قدر مُنکشف ہو چکے ہیں۔ کتنی بڑی بڑی ایجادیں ظاہر ہو چکی ہیں اور روز مرّہ ہوتی جاتی ہیں۔ جلد ہی مادّی علوم و معارف اور خدائی عرفان ایسی ترقی پائینگے اور معجزے دکھلائینگے کہ آنکھیں حیران ہونگی اور اشعیا کی اِس آیۂ مُبارکہ کی رمز کہ "جہان معرفت اللّٰہ سے معمور ہو جائے گا" پوری طرح ظاہر ہو جائے گی۔ اِسی طرح مُلاحظہ فرمائیں کہ ظہورِ جمالِ مُبارک کے تھوڑے عرصہ میں تمام اقوام و طوائف سے کس قدر لوگ اس امر کے سایہ تلے داخل ہو چکے ہیں۔ مسیحی، یہودی، زرتشتی، ہندو، بودھائی اور مُسلمان سب آپس میں ایسی اُلفت و محبّت سے ملتے جُلتے ہیں گویا کہ یہ لوگ ہزار سال سے ایکدوسرے کے خویش و اقارب ہیں، باپ بیٹے ہیں، ماں بیٹی ہیں، بہن بھائی ہیں۔ بھیڑئے اور برّے، چیتے اور حلوان، بچھیا اور شیر کے مل کر رہنے کے ایک معنی یہ ہیں۔ ایک سب سے بڑا واقعہ جو اس نہالِ بے مثال کے زمانۂ ظہور میں واقع ہو گا یہ ہے کہ عَلَمِ الٰہی تمام اقوام میں بلند ہو گا۔ یعنی تمام اقوام اور قبیلے اس عَلَمِ الٰہی کے سایہ تلے جو اُس نہالِ ربّانی کا نفسِ مُبارک ہے آئینگے اور ایک ملّتِ واحد بن جائینگے۔ دینی و مذہبی عداوت، جنسی اور نوعی امتیازات اور وطنی اختلافات اُٹھ جائینگے۔ سب ایک دین، ایک مذہب، ایک جنس اور ایک قوم بن جائینگے اور ایک وطن میں جو کُرۂ ارض ہے رہینگے۔ تمام حکومتوں کے درمیان صُلح و آشتی عمومی جلوہ گر ہوگی۔ وہ نہالِ بے مثال سب اسرائیل کو جمع کرے گا۔ یعنی اسرائیل اُس کے زمانہ میں پھر ارضِ مقدّس میں جمع ہونگے اور اُمّتِ یہود جو مشرق و مغرب اور جنوب و شمال میں بکھری ہوئی ہے اُس جگہ جمع ہوگی۔ اَب مُلاحظہ فرمائیے کہ یہ واقعات دَورِ مسیح میں واقع نہیں ہوئے۔ کیونکہ اُمّتیں عَلَمِ واحد کے تلے جو وہ نہالِ الٰہی ہے نہ آئی تھیں۔ مگر اِس دَورۂ ربّ الجنود میں کُل قومیں اور اُمّتیں اِس عَلَم کے سایہ تلے وارد ہو رہی ہیں۔ اِسی طرح تمام دنیا میں بکھرے ہوئے یہودی دورۂ مسیح کے اندر ارضِ مقدّس میں جمع نہ ہوئے تھے مگر جمالِ مُبارک کے دَور کے شروع ہی میں یہ خدائی وعدہ جو تمام انبیاء کی کتابوں میں درج ہے ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مُلاحظہ فرمائیں کہ تمام اطرافِ عالَم سے یہودیوں کے گروہ کے گروہ ارضِ مقدّس میں آ کر گاؤں اور زمینیں مول لے کر آباد ہو رہے ہیں۔ اور روز مرّہ زیادہ آباد ہوتے جائینگے، حتّٰی کہ تمام فلسطین اِن کا مسکن بن جائے گا۔

(یحیٰ)

مُکاشفاتِ یوحنا کے بارھویں باب کی تفسیر

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مقدس کتابوں میں شہرِ مقدس یورشلیم الٰہی سے مُراد اکثر مقامات پر شریعت اللہ ہے۔ جسے کبھی تو دُلھن سے تشبیہ دی گئی ہے اور کبھی اورشلیم سے تعبیر کی گئی ہے کبھی نئی زمین اور نیا آسمان کہا گیا ہے۔ چنانچہ مکاشفاتِ یوحنا کے اکیسویں باب میں فرماتا ہے:-

"پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا۔ کیونکہ اگلا آسمان اور اگلی زمین جاتی رہی تھی اور سمندر بھی مطلق نہ رہا تھا۔ اور میں نے شہرِ مقدس اورشلیم کو آسمان سے دُلھن کی مانند جس نے اپنے شوہر کے لئے سنگار کیا ہو آراستہ کئے ہوئے خُدا کے پاس سے اُترتے دیکھا اور میں نے ایک بڑی آواز یہ کہتے ہوئے آسمان سے سُنی کہ دیکھ خُدا کا خیمہ آدمیوں کے ساتھ ہے اور وہ اُن کے ساتھ سکونت کریگا اور اُس کے لوگ ہونگے اور خود خدا اُن کے ساتھ اُن کا خُدا ہوگا۔"

دیکھئے کس قدر ظاہر اور واضح ہے کہ پہلے آسمان اور پہلی زمین سے مقصد پہلی شریعت ہے۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ "اگلا آسمان اور اگلی زمین جاتی رہی تھی" اور سمندر بھی مطلق نہ رہا، یعنی یہ یہ زمینِ محشر (آنے والے ظہور) کی زمین ہے۔ اور اِس زمینِ محشر پر کوئی سمندر نہیں ہے۔ جس سے مُراد یہ ہے کہ تعالیم و شریعت اللہ سب روئے زمین پر پھیل جائے گی اور سب انسان دینِ حق میں داخل ہو جائینگے اور کرّۂ ارض سب کا سب مومن انسانوں کا مسکن ہوگا۔ "سمندر مطلق نہ رہا" اِس سے مُراد ہے کہ انسانوں کے بسنے اور رہنے کی جگہ خشک زمین ہے۔ یعنی اُس شریعت کا میدان انسان کا جولانگاہ ہوگا۔ یہ زمین مضبوط ہوگی۔ پاؤں اُس پر نہ پھسلیں گے۔

شریعت اللہ کو نئے شہرِ مقدس اور یوروشلیم سے تعبیر کرتا ہے جو آسمان سے نازل ہوگا۔ پتھر، چونے، اینٹ، مٹی اور لکڑی کا شہر نہیں بلکہ شریعت اللہ ہے جو آسمان سے اُترے گی۔ اور اُسے نیا کہتا ہے۔ شریعت ہی آسمان سے اُترتی ہے اور ہمیشہ تجدید ہوتی ہے۔ پھر شریعت اللہ کو دُلھن سے

جو اپنے شوہر کے لئے سنگار کئے ہوئے ہو تشبیہ دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ وہ نہایت آراستگی سے جلوہ نما ہوگی۔ چنانچہ مکاشفات یوحنّا کے اکیسویں باب کی اوپر لکھی ہوئی آیات میں ذکر ہو چکا ہے کہ "میں نے شہر مقدس یورشلیم کو دیکھا کہ خدا کی طرف سے اُس دلہن کی مانند سنگار کر کے جو اپنے شوہر کے لئے آراستہ ہو آسمان سے اُتر رہا ہے" اور رویای یوحنّا کی بارھویں فصل میں مذکور ہے کہ:-

"ایک بڑی علامت آسمان پر ظاہر ہوئی۔ ایک عورت سورج کو اوڑھے ہوئے چاند کو پاؤں تلے لئے تھی۔ اِس کے سر پر بارہ ستاروں کا تاج تھا۔"

یہ عورت وہ دلہن ہے جو شریعت اللہ ہے اور حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی تھی، اور سورج اور چاند جنھیں اوڑھے اور پاؤں تلے لئے ہے۔ دو حکومتیں ہیں جو اِس شریعت کے زیر سایہ ہیں۔ دولتِ ایران جس کی حکومت کا نشان سورج اور دولتِ عثمان جس کی سلطنت کا نشان چاند ہے۔ یہ سورج اور چاند اِن دو حکومتوں کی طرف اشارہ ہے جو شریعت اللہ کے زیر سایہ ہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ اس کے سر پر بارہ ستاروں کا تاج تھا۔ یہ بارہ ستارے بارہ امام ہیں جو شریعتِ محمدیہ کو جاری کرنے والے اور ملّت کے مربّی تھے، اور وہ ستاروں کی مانند اُفقِ ہدایت میں چمک رہے ہیں۔ پھر فرماتا ہے:-

"وہ عورت حاملہ تھی اور درد سے چلّاتی اور جننے کے لئے اینٹھتی تھی۔"

یعنی یہ شریعت بڑی بڑی مشکلات میں پڑے گی اور سخت زحمتیں اور مشقتیں اُٹھائے گی تاکہ ایک کامل فرزند اِس شریعت سے حاصل ہو یعنی ظہورِ بعد اور موعود جو اِس شریعت کا فرزند کامل ہوگا اِس شریعت کی گود میں جو ماں کی مانند ہے پرورش پائے گا۔ اِس فرزند سے مُراد حضرت اعلیٰ نقطہ اولیٰ (حضرت باب) ہیں۔ جو فی الحقیقت شریعتِ محمدیہ سے پیدا ہوئے تھے۔ یعنی حقیقتِ مقدسہ جو اِس شریعت کا بچہ یا نتیجہ ہے اور اُس شریعت کا موعود ہے اِس شریعت کی ملکوت میں تحقق پائے گا۔ لیکن اژدہا کے تسلّط کے سبب خدا کے پاس اُٹھا لیا جائے گا۔ ۱۲۶۰ دن کے بعد جب وہ اژدہا نابود ہو جائے گا تو وہ شریعت اللہ کا فرزند یعنی موعود ظاہر ہوگا۔

"پھر ایک اور نشان آسمان پر دکھائی دیا اور دیکھو ایک بڑا سُرخ اژدہا جس کے سات سر اور دس سینگ تھے اور اُس کے سروں پر سات تاج تھے ظاہر ہوا اور اُس کی دُم نے آسمان کے تہائی ستارے کھینچ لئے اور اُنھیں زمین پر لا ڈالا۔"

یہ اژدہا بنی اُمیہ ہیں جو شریعتِ محمدیہ پر مستولی ہوئے تھے۔ اور سات سر اور سات تاجوں سے مُراد سات مُلک اور سات سلطنتیں ہیں جن پر بنی اُمیہ قابض تھے۔ یعنی مملکتِ شام مملکتِ ایران۔ مملکتِ عرب۔ مملکتِ مصر، مملکتِ افریقہ (ٹیونس، الجزائر اور مراکش) مملکت اندلس جو ہسپانیہ کہلاتی ہے اور مملکتِ ترک ماوراء النہر۔ اِن ممالک پر بنی اُمیہ قابض تھے۔ اور دس سینگ سے مُراد بادشاہانِ بنی اُمیہ کے بغیر دُہرائے دس نام ہیں یعنی دس نام ہیں جنھوں نے ریاست و سلطنت کی۔ اوّل ابی سفیان اور آخر مروان۔ مگر ان میں سے بعض کے نام دوبارہ آئے ہیں مثلاً دو معاویہ۔ تین یزید۔ دو ولید اور دو مروان ہیں۔ یہ دُہرائے گئے ہیں۔ اگر ان کے ناموں کو دُہرائے بغیر گنا جائے تو دس ہوتے ہیں۔ اور اِن بنی اُمیہ نے جن کا اوّل ابی سفیان (جو ایک وقت امیرِ مکہ تھا اور سرسلسلۂ امویان ہے) اور جن کا آخر مروان ہے، آلِ پاک رسول کے مقدس و مُبارک نفوس کی جو آسمان کے ستاروں کی طرح تھے ایک تہائی کو محو کر دیا اور

"وہ اژدہا اُس عورت کے آگے جو جننے کو تھی جا کر کھڑا ہوا۔ تا کہ جب وہ جنے تو اُس کے بچّے کو نگل جائے۔"

یہ عورت جیسا کہ بیان ہوا شریعت اللہ ہے۔ اژدہے کا اُس کے سامنے کھڑے ہونے سے مُراد یہ ہے کہ وہ اژدہا تیار کھڑا تھا کہ جب وہ بیٹا جنے تو وہ اُس کے بیٹے کو نگل جائے۔ یہ بیٹا وہ مظہرِ موعود ہے جو شریعتِ محمدی سے پیدا ہوا۔ بنی اُمیہ ہمیشہ اِس بات کے منتظر رہتے تھے کہ وہ شخص جو آلِ محمد سے آئے گا اور جو موعود ہے اُسے اپنے قابو میں لائیں اور نیست و نابود کر دیں کیونکہ وہ مظہرِ موعود کے ظہور سے بہت ڈرتے تھے اور جہاں کہیں حضرت محمدؐ کی اولاد میں کسی شخص کو دیکھتے جو لوگوں کی نظروں میں محترم ہوتا اُسے ہلاک کر ڈالتے

"اور وہ فرزندِ نرینہ جنی جو لوہے کا عصا لے کر سب قوموں پر حکومت کرے گا۔"

یہ پسرِ بزرگوار مظہرِ موعود ہے جو شریعت اللہ سے پیدا ہوا تھا اور تعالیمِ الٰہیہ کی گود میں پلا تھا اور لوہے کے عصا سے مُراد قدرت و قوت ہے تلوار نہیں۔ یعنی قوت و قدرتِ الٰہیہ سے سب زمین کے لوگوں کی چوپانی کرے گا۔ اِس فرزند سے مُراد حضرت اعلیٰ (حضرت باب) ہیں۔

"اور اُس کا لڑکا خدا اور اُس کے تخت کے آگے اُٹھا یا گیا"

یہ پیشینگوئی حقیقت میں حضرت اعلیٰ (حضرت باب) کے بارے میں ہے جو ملکوتِ عرشِ الٰہی اور مرکزِ سلطنتِ خدائی کی طرف صعود فرما گئے تھے۔ مُلاحظہ فرمائیں کہ واقعہ کس قدر مطابق ہے۔

"اور وہ عورت بیابان کی طرف بھاگ گئی"

جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وسیع صحرائے حجاز کی طرف چلی گئی۔

"اور وہاں ایک جگہ اُس کے لئے خدا کی طرف سے مہیا تھی"

یعنی جزیرۃ العرب شریعت اللہ کا ماویٰ و مسکن و مرکز ہوا۔

"تاکہ اُسے ۱۲۶۰ روز تک پرورش کرے"

جیساکہ پہلے ذکر ہوا یہ ۱۲۶۰ روز کتاب مقدس کی اصطلاح کے بموجب ۱۲۶۰ سال ہیں۔ پس شریعت اللہ ۱۲۶۰ سال تک عرب کے صحرائے عظیم میں پرورش پاتی رہی۔ حتیٰ کہ مظہر موعود اس کے پیدا ہوا۔ ۱۲۶۰ سال کے بعد اِس شریعت کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ کیونکہ اُس شجر کا ثمر اور نتیجہ حاصل ہوگیا ملاحظہ فرمائیں کہ پیشینگوئیاں کس قدر آپس میں ملتی جُلتی ہیں۔ مکاشفات میں ظہورِ موعود کے لئے ۴۲ مہینے مقرر کئے ہیں اور دانیال میں ۳½ دن لکھا ہے۔ یہ بھی ۴۲ مہینے ہوتے ہیں اور ۴۲ مہینے ۱۲۶۰ دن ہوتے ہیں۔ اِسی لئے مکاشفاتِ یوحنا میں دوسری جگہ صراحت سے ۱۲۶۰ دن بیان کرتا ہے۔ کتاب مقدس کی نص ہے کہ ایک دن ایک سال کے برابر ہے۔ اِس سے صریح تر ممکن نہیں۔ حضرت بابؑ حضرت محمدؐ کی ہجرت سے جو اسلام کی عام تقویم ہے۔ ۱۲۶۰ سال بعد ظاہر ہوئے۔ کتاب مقدس میں کسی ظہور کے لئے بھی اس سے واضح تر پیشینگوئی نہیں۔ اگر انصاف کیا جائے تو اِن وقتوں کا آپس میں ملنا جو بزرگواروں کی زبان سے مذکور ہوئے ہیں ایک بڑی بھاری دلیل ہے اور کسی طرح بھی اِس کے اور معنی ممکن نہیں۔ مُبارک ہیں وہ انصاف پسند اشخاص جو حقیقت کی تلاش کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ انصاف نہیں کرتے وہ حُجت کرتے اور لڑتے ہیں۔ اور صاف و صریح باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اُن فریسیوں کی مانند جنھوں نے ظہورِ مسیح میں نہایت لجاجت کے ساتھ حضرت مسیح اور آپ کے حواریوں کے بیان اور اُن کی تفاسیر کا انکار کیا تھا۔ اور عام جاہل لوگوں کے سامنے دینِ مسیحی کو یہ کہکر مشتبہ کر دیا تھا کہ یہ پیشینگوئیاں اِس یسوع کے بارے میں نہیں ہیں۔ بلکہ اس موعود کے بارے میں ہیں جو تورات کی بیان کردہ شرطوں کے ساتھ بعد میں آئے گا۔ اِن شرطوں میں سے داؤد کے تخت پر بیٹھنا اور حکومت کرنا۔ شریعتِ تورات کو جاری کرنا، عدلِ عظیم کا ظاہر ہونا، بھیڑیئے اور بکری کا ایک ہی چشمہ پر جمع ہونا، چند شرطیں تھیں۔ اِسی طرح اُنھوں نے لوگوں کو حضرت مسیح سے محتجب رکھا۔

(یہ)

براہینِ رُوحانیہ

اِس عالَمِ جسمانی میں زمانہ کے لئے اَدوار اَور ہر جگہ کے لئے جُداگانہ اطوار ہیں۔ فصلوں کے لئے تبدیلی اور نفوس کے لئے ترقّی و تدنّی اور تربیت ہے۔ کبھی فصلِ بہار ہے۔ کبھی موسمِ خزاں۔ کبھی گرمیاں ہیں کبھی سردیاں۔ موسمِ برسات میں موتی برسانے والے بادل آتے ہیں۔ نسیمِ جاں بخش مُشک بکھیرتی ہے۔ ہوا نہایت معتدل ہوتی ہے۔ مینہ برستا ہے۔ سورج چمکتا ہے۔ بار آور ہوائیں چلتی ہیں دُنیا نیا چولہ بدلتی ہے۔ نباتات و حیوانات اور انسانوں میں زندگی کی رُوح پھونکی جاتی ہے۔ زمینی کائنات ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جاتی ہے۔ تمام چیزیں نئی پوشاک سے مزیّن ہو جاتی ہیں۔ سیاہ خاک سبزہ پوش اور شاداب ہو جاتی ہے۔ کوہ و صحرا ہرے ہی ہرے نظر آتے ہیں۔ درختوں میں برگ و شگوفے پھوٹتے ہیں۔ باغ میں پھول اور خوشبودار بیل بوٹے اُگتے ہیں۔ جہان ایک دوسرا جہان بن جاتا ہے اور حیاتِ جاں پرور پاتا ہے۔ زمین جو ایک بے جان جسم کی طرح تھی زندگی پاکر لطافت و حُسن و تازگی سے جلوہ پیرا ہوتی ہے۔ پس بہار نئی زندگی اور تازہ روح عطا کرتی ہے۔

اِس کے بعد گرمی آتی ہے۔ حرارت بڑھتی ہے۔ نشو و نما میں قوت آتی ہے۔ عالَمِ نبات میں زندگی کی قوّت درجۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اور پھل دینے کا وقت آجاتا ہے۔ دانہ ایک خرمن بن جاتا ہے۔ اور سردیوں کے لئے غذا مہیّا ہوتی ہے۔

پھر موسمِ خزانِ بے امان کا وقت آتا ہے۔ نسیمِ ناگوار اور ہوائے عقیم چلتی ہے۔ یہ بیماری کا وقت ہے سب چیزیں مُرجھا جاتی ہیں۔ لطیف ہوائیں افسردہ ہو جاتی ہیں۔ نسیمِ بہار کی جگہ بادِ خزاں چلتی ہے۔ ہرے بھرے درخت افسردہ اور عریاں ہو جاتے ہیں۔ پھول اور خوشبودار بیل بوٹے مُرجھا جاتے ہیں۔ وہ پیارا پیارا گلشن ایک اندھیرا گھر سا معلوم ہوتا ہے۔

پھر سردی کا موسم آتا ہے۔ ایک طوفان بپا ہوتا ہے۔ برف اور بارش۔ اولے اور یخ۔ گرج اور بجلی۔ جمودت اور حمودت اپنا سکہ جماتی ہیں۔ تمام کائناتِ نباتی پر موت کی حالت طاری ہوتی ہے۔ حیوانات پژمردہ اور افسردہ نظر آتے ہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچتی ہے تو پھر بہارِ جاں پرور شروع

ہوتی ہے۔ نیا دَور آغاز ہوتا ہے یفصلِ بہار نہایت حشمت اور عظمت کے ساتھ طراوت اور لطافت کی افواج لئے ہوئے کوہ و میدان میں خیمہ زن ہوتی ہے۔ ہیکلِ موجودات پھر تازہ ہوتی ہے۔ اجسام نشو و نما پاتے ہیں۔ دشت و صحرا ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ درخت شگوفے نکالتے ہیں اور وہ پارسال کی بہار نہایت عظمت و جلال کے ساتھ لوٹ آتی ہے۔

وجودِ کائنات کا یہی دَور و تسلسل ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ جس طرح عالمِ جسمانی کے لئے دَور اور گردش ہے اِسی طرح انبیا کے ادوارِ رُوحانی ہیں یعنی مظاہرِ مقدسہ (انبیا) کے ظہور کا دن بہارِ رُوحانی کا وقت اور تجلیاتِ رحمانی و فیضِ آسمانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ نسیمِ حیات چلتی ہے اور شمسِ حقیقت ضو فشاں ہوتا ہے ارواح زندہ ہوتی ہیں اور قلوب تر و تازگی پاتے ہیں۔ نفوس پاکیزہ بنتے ہیں۔ عالَمِ وجود حرکت میں آتا ہے۔ حقائقِ انسانی بشارت پاتے ہیں اور مراتب و کمالات میں بڑھتے ہیں۔ عالمگیر ترقی کی بُنیاد پڑتی ہے۔ حشر و نشر واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ دِن قیامت کا دن اور جوش و خروش کا زمانہ ہوتا ہے۔ فرحت و سرور اور جذب و انجذاب کا دور دَورہ ہوتا ہے۔

اِس کے بعد یہ بہارِ جاں پرور تابستانِ پُر ثمر سے معمور ہو جاتی ہے۔ کلمۃ اللہ بلند اور شریعت اللہ جاری و ساری ہوتی ہے۔ تمام اشیاء درجۂ کمال تک پہنچ جاتی ہیں۔ آسمانی دسترخوان بچھایا جاتا ہے اور پاک نفحات مشرق و مغرب کو معطر کرتے ہیں۔ تعالیمِ الٰہی تمام جہان میں پھیل جاتی ہیں۔ نفوس تربیت پاتے ہیں اور احسن نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ کامل اور عالمگیر ترقیاں عالمِ انسانی میں جلوہ نما ہوتی ہیں۔ خدائی فیوضات عام ہو جاتے ہیں۔ شمسِ حقیقت اُفقِ ملکوت سے نہایت آب و تاب اور قوت و حرارت کے ساتھ چمکتا ہے اور جب دائرۂ نصف النہار میں آتا ہے زوال و غروب کی طرف ڈھلتا ہے۔ پس اُس بہارِ رُوحانی کے پیچھے خزاں آتی ہے اور نشو و نما بند ہو جاتی ہے۔ نسیم بدل کر بادِ عقیم بن جاتی ہے اور بیماری کا موسم رونما ہوتا ہے۔ باغ و صحرا کی سبزی و خرمی مٹ جاتی ہے۔ یعنی جذباتِ وجدانی مٹ جاتے ہیں۔ اخلاقِ رحمانی نہیں رہتے دِلوں کی نورانیت تیرہ و تار ہو جاتی ہے۔ اور نفوس کی رُوحانیت زائل ہو جاتی ہے۔ نیکیاں بدیاں بن جاتی ہیں اور پاکی و پاکیزگی اُڑ جاتی ہے۔ شریعت اللہ کا صِرف نام اور تعالیمِ الٰہی کی صرف رسم باقی رہ جاتی ہے۔ دین اللہ کے اصل الاصول محو و نابود ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی جگہ رسوم و تکلفات جاری ہو جاتے ہیں۔ تفرقہ اپنا ڈیرہ جماتا ہے اور استقامت کی جگہ بے قراری لے لیتی ہے۔ جانیں مُردہ اور قلوب پژمردہ اور نفوس افسردہ ہو جاتے ہیں۔ پھر سردی کے دن آتے ہیں یعنی جہل و نادانی کی سردی اُن پر چڑھتی ہے اور نفسانی گمراہی کی تاریکی اُنھیں گھیر لیتی ہے۔ پس پھر جمودت اور نافرمانی۔ حماقت اور کاہلی۔ حیوانیت اور کمینگی، پتھروں کی سی

سردی اور سرد مہری اپنا تسلط جماتی ہے۔ بعینہٖ اِس طرح جس طرح سردی کے موسم میں آفتاب کی گرمی کی تاثیر نہ پاکر زمین سنسان اور اُجاڑ ہو جاتی ہے۔

جب عقول و افکار کا جہان اِس درجے تک پہنچ جاتا ہے تو یہ ہمیشہ کی موت اور ابدی فنا کا عالم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب سردی کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو پھر بہارِ رُوحانی آتی ہے اور دَورِ جدید جلوہ نما ہوتا ہے۔ نسیمِ رُوحانی چلتی ہے۔ صبحِ نورانی نمودار ہوتی ہے۔ ابرِ رحمانی برستا ہے۔ شمسِ حقیقت کا نور ضیا پاشی کرتا ہے دُنیا نئی زندگی پاکر ایک نئی پوشاک زیبِ تن کرتی ہے۔ پہلی بہار کے تمام آثار و تحائف دوبارہ اور شاید اُن سے بڑھکر جلوہ نما ہوتے ہیں۔ شمسِ حقیقت کے اَدوار بھی شمسِ ظاہری کے اَدوار کی طرح ہمیشہ گردش اور تجدید میں رہتے ہیں۔ شمسِ حقیقت بعینہٖ آفتاب کی طرح ہے۔ آفتابِ ظاہری کے لئے مختلف مشارق و مطالع ہیں۔ کبھی برجِ سرطان سے نکلتا ہے کبھی برجِ نیران سے۔ کبھی بُرجِ دلو سے چمکتا ہے۔ کبھی برجِ حمل سے پرتوفشانی کرتا ہے۔ مگر آفتاب وُہی آفتاب اور وہی حقیقتِ واحد ہے۔ اہلِ عقل آفتاب کے عاشق ہوتے ہیں۔ مشارق و مطالع کے مفتون نہیں ہوتے اہلِ بصیرت حقیقت کے طالب ہوتے ہیں۔ مظاہر و مصادر کے فریفتہ نہیں ہوتے۔ اِس لئے آفتاب خواہ کسی بُرج و مشرق سے بھی نکلے وہ اس کی پرستش کرتے ہیں۔ حقیقت خواہ کسی نفسِ پاک سے بھی نمایاں ہو وہ اس کی پرستاری کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہمیشہ حقیقت کو پاتے ہیں اور آفتابِ الٰہی سے پسِ پردہ نہیں ہوتے۔ آفتاب کا عاشق و اَنوار کا طالب ہمیشہ آفتاب کی طرف آنکھیں لگائے رکھیگا خواہ وہ بُرجِ حمل سے چمکے یا بُرجِ سرطان سے فیض دے یا بُرجِ جوز سے ضیا پاشی کرے۔ مگر جاہل و نادان لوگ بُرجوں کے عاشق اور مشارق کے والا و شیدا ہیں آفتاب کے نہیں۔ جب بُرجِ سرطان سے ظاہر ہوا تو اُس کی طرف متوجہ تھے مگر پھر جب بُرجِ میزان سے چمکا تو چونکہ بُرج کے عاشق تھے اِس لئے برج ہی کی طرف متوجہ اور اُس سے متمسک رہے۔ آفتاب کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ کیونکہ آفتاب بُرج بدل چکا تھا۔ مثلاً ایک وقت آفتابِ حقیقت بُرجِ ابراہیمی سے پرتوفشاں تھا۔ پھر بُرجِ موسوی سے طلوع ہوکر نورا فروز ہوا۔ پھر بُرجِ مسیحی سے نہایت قوت و حرارت کے ساتھ ضیا پاش ہوا۔ جو لوگ حقیقت کے طالب تھے۔ جہاں بھی اُنھوں نے اِس حقیقت کو پایا، اُس کی پرستش کی۔ لیکن وہ جو ابراہیم کی محبّت رکھتے تھے جب طور پر تجلّی فرمائی اور حقیقتِ موسوی کو روشن کیا تو اُس سے انکار کیا۔ اسی طرح جب حقیقتِ مسیحی سے نہایت چمک اور دمک کے ساتھ جلوہ نما ہوا تو اُس سے پسِ پردہ رہے۔ وقس علیٰ ذٰلک پس انسان کو لازم ہے کہ وہ حقیقت کا طالب رہے حقیقت جس ذاتِ مقدس میں بھی ہو اُس کا والہ و شیدا ہو جائے۔ اور فیضِ خدا کا فریفتہ بنے۔ پروانے کی طرح نور کا عاشق خواہ وہ کسی بھی چراغ سے چمکے۔ بُلبل کی طرح گُل کا شیدا ہو خواہ کسی باغ میں کھِلے۔ اگر آفتاب مغرب سے نکلے تو ہمیں نہ چاہئے کہ ہم اُس کے نکلنے کی جگہ کے سبب اُس کا انکار کریں۔ اور نہ ہی

مغرب کو ہم ہمیشہ غروب ہونے کی جگہ سمجھیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم فیوضاتِ الٰہی کی تلاش اور اشراقاتِ خدائی کے تجسس رہیں اور حسن حقیقت میں بھی واضح و آشکار پائیں اس کے والہ و شیدا ہو جائیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ اگر یہودی افقِ موسوی سے متمسک نہ ہوتے بلکہ شمسِ حقیقت کے امیدوار رہتے تو بلا شک و شبہ وہ اس آفتاب کو مسیحی مشرقِ حقیقی سے نہایت جلوۂ رحمانی کے ساتھ درخشاں پاتے لیکن ہزار افسوس کہ نقطۂ موسوی سے متمسک ہو کر اس فیضِ الٰہی اور جلوۂ ربانی سے بے نصیب رہے۔

---

(۱۷)

غنائے حقیقی

موجودات کے ہر کائن کی بزرگی و شرافت کا انحصار حالات و وجوہات پر ہے۔ زمین کی زینت اور جمال و کمال اس میں ہے کہ ابرِ بہار کا فیض پاکر ہری بھری ہو۔ سبزی اُگے۔ پھول اور بوٹے پیدا ہوں۔ درخت تر و تازہ میوہ سے لد جائیں۔ باغ بنے اور چمن مزین ہو۔ میدان کوہسار سبزی سبز ہو جائیں۔ باغ اور کھیت، شہر اور گاؤں زینت پائیں۔ یہ تو عالمِ جماد کی بزرگی اور شرافت ہے۔ عالمِ نبات کی بزرگی و کمال یہ ہے کہ ایک درخت میٹھے پانی کی نہر کے کنارے بلند ہو۔ خوشگوار ہوائیں اُسے جھونکے دیں۔ آفتاب کی حرارت اُس پر چمکے۔ باغبان اُس کی خدمت کرے اور وہ روزمرہ بڑھتا جائے اور پھل لائے۔ اُس کی اصلی شرافت اس میں ہے کہ وہ عالمِ انسانی کی طرف ترقی کرے اور جسمِ حیوان و انسان میں جو قوتیں گھٹ جائیں اُن کو پورا کرے۔ عالمِ حیوان کی بزرگی یہ ہے کہ اُس کا بدن اور اس کے اعضا مضبوط و مکمل ہوں۔ اپنی ضروریات کو حاصل کر سکے۔ یہ ہی اُن کی عزت و شرافت و بزرگی کی انتہا ہے۔ مثلاً حیوان کی خوشی اس میں ہے کہ ایک ہرا بھرا میدان ہو جس میں ایک میٹھے پانی کی ندی نہایت لطافت سے جاری ہو۔ اگر یہ اُسے مل جائے تو اس سے بڑھ کر اُس کے لئے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ ایک پرندے کی کامل خوشی یہ ہے کہ ایک ہرے بھرے جنگل میں ایک سر بلند درخت کی اونچی شاخ پر اُس کا گھونسلا ہو۔ دانہ اور پانی جو چاہے اُس کے لئے حاضر رہے لیکن اُس کی اصلی سعادت یہ ہے کہ عالمِ حیوانی سے عالمِ انسانی میں انتقال کرے۔ اُن چھوٹے چھوٹے حیوانوں کی مانند جو ہوا

اور پانی میں مِل کر جسمِ انسان میں حلول کرتے ہیں اور تحلیل ہوکر بدلِ ماتحلّل بنتے ہیں۔ یہ اُن کی عزّت اور سعادت کی حد ہے۔ اِس سے بڑھ کر اُن کے لئے کوئی عزّت خیال میں نہیں آسکتی۔
پس معلوم ہوگیا کہ یہ جسمانی نعمت اور راحت اور ثروت، جمادات و نباتات و حیوانات کی کامل سعادت ہے۔ عالمِ جسمانی میں کوئی غِنا اور راحت و آسائش اِس پرندے کی غِنا کی مانند نہیں۔ کیونکہ سب صحرا و کوہسار اُس کے آشیانے کی جگہ ہیں۔ اور تمام دانے اور خرمن اُس کی ثروت و غذا ہیں۔ سب زمینیں اور قریتے، باغ اور باغیچے، جنگل اور صحرا اُس کی ملکیت ہیں۔ اَب فرمائیے کون غنی تر ہے؟ یہ پرندہ یا دولت مند انسان؟ پرندہ کتنے بھی دانے چُنے یا بخشے اس کی دولت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی عزّت و شرافت صرف جسمانی لذّتوں اور دُنیوی نعمتوں میں ہی نہیں۔ بلکہ یہ جسمانی کامرانی فرع ہے۔ انسانی بزرگی کی اصل وہ خصلتیں اور فضیلتیں ہیں جو انسانی حقیقت کا سنگار ہیں۔ یہ خدائی سنوحات۔ آسمانی فیوضات اور شریف جذبات ہیں۔ محبّتِ الٰہی معرفتِ خدائی۔ عالمگیر دانائی، عقلی ادراکات اور علمی انکشافات ہیں۔ عدل و انصاف ہیں۔ صدق و الطاف ہیں۔ قدرتی شہامت و فطری محبّت ہیں۔ حقوق کی حفاظت ہیں۔ عہد و میثاق کی پاسداری ہیں۔ سب اُمور میں راستی اور سب حالتوں میں حقیقت پرستی ہیں۔ خیرِ عموم کے لئے جانفشانی کرنی اور تمام انسانی جماعتوں سے عنایت و مہربانی سے پیش آنا ہیں۔ تعالیمِ الٰہی کی متابعت اور ملکوتِ رحمانی کی خدمت کرنا ہیں۔ لوگوں کی ہدایت اور قوموں و ملّتوں کی تربیت کرنا ہیں۔ یہ ہے اِس دُنیا میں انسان کی سعادت و بزرگی۔ یہی اُس کے لئے ہمیشہ کی زندگی اور عزّتِ آسمانی ہیں۔ یہ وصف حقیقتِ انسانی میں سے خدائی قوّت اور آسمانی تعالیم کے بغیر جلوہ نما نہیں ہوتے۔ کیونکہ اُن کے ظہور کے لئے ایک ایسی قوّت کی ضرورت ہے جو ماوراء الطبیعت ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ان کمالات کا نمونہ ایک نمونہ سا عالمِ طبیعت میں ظاہر ہو۔ لیکن یہ بے ثبات اور بے بقا ہوتا ہے۔ جس طرح آفتاب کی کرنیں دیوار پر گرتی ہیں۔ خداوندِ مہربان نے انسان کے سر کو ایسے مرصّع تاج سے سجایا ہے۔ پس کوشش لازم ہے کہ اس کے آبدار موتی جہان میں روشن ہوں

قسمِ دوّم

مذہبِ عیسوی کے مسائل کے مُتعلّق بعض مقالات

گفتگو برسرِ نامہار

(۱)

معقولات صِرف جامۂ محسوسات ہی میں بیان کئے جاسکتے ہیں

(۲۶)

معقولات صرف جامہ محسوسات ہی میں بیان کئے جاسکتے ہیں

ایک مسئلہ جس پر ہمارے ذکر کردہ دوسرے مسائل کے سمجھنے کا اور اُن کی تہ تک پہنچنے کا دار و مدار ہے، یہ ہے کہ انسانی معلومات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو معلومات محسوسہ ہیں یعنی وہ چیزیں جنھیں آنکھ۔ کان۔ شامّہ۔ ذائقہ یا لامسہ احساس کر سکتے ہیں۔ انھیں محسوسات کہتے ہیں مثلاً آفتاب محسوس ہے کیونکہ دکھائی دیتا ہے۔ آوازیں محسوس ہیں۔ کیونکہ انھیں سُنتے ہیں۔ روائح محسوس ہیں کیونکہ شامّہ انھیں محسوس کرتی ہے۔ طعام محسوس ہے کیونکہ زبان اُن کی مٹھاس یا کڑواہٹ یا نمکینی کا احساس کرتی ہے۔ گرمی و سردی محسوس ہیں۔ کیونکہ لامسہ ان کو محسوس کرتی ہے۔ یہ حقائق محسوسہ کہلاتے ہیں۔

انسانی معلومات کی **دوسری قسم** معقولات یا حقائقِ معقولہ ہیں یعنی وہ حقائق جن کی کوئی ظاہری صورت یا حلیہ نہیں۔ اور حواس انھیں محسوس نہیں کر سکتے۔ مثلاً قوتِ عقل اور دیگر انسانی صفات محسوساتِ حسّی نہیں ہیں۔ محبت بھی حقیقتِ معقولہ ہے۔ اس قسم کے حقائق غیر محسوسہ ہیں۔ کیونکہ کان انھیں سُن نہیں سکتے۔ آنکھ انھیں دیکھ نہیں سکتی۔ شامّہ انھیں سونگھ نہیں سکتی۔ زبان اُن کا مزہ نہیں چکھ سکتی اور لامسہ انھیں چھو نہیں سکتی۔ حتیٰ کہ مادۂ اثیریہ (ایتھر) بھی جس کے قویٰ کو حکمتِ طبیعیہ میں حرارت۔ روشنی کہربا مقناطیس کہتے ہیں وہ بھی حقیقتِ معقولہ ہے۔ محسوسہ نہیں۔ خود طبیعت یا نیچر بھی حقیقتِ معقولہ ہے اسی طرح روحِ انسان بھی حقیقتِ معقولہ ہے۔ محسوسہ نہیں۔ ان حقائقِ معقولہ کو بیان کرنے کے لئے مجبوراً انھیں قالبِ محسوسات میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ظاہر میں سوائے محسوسات اور کچھ نہیں۔ پس روح اور اُس کے حالات و درجات کا اگر بیان کرنا چاہیں تو مجبوراً انھیں محسوسات کی صورت میں بیان کرنا پڑے گا۔ مثلاً غم اور خوشی اُمور معقولہ ہیں۔ پس کیفیتِ روحانی کو بیان کرنے کے لئے کہا جاتا ہے "میرا دل تنگ ہو گیا" یا "میرا دل کھل گیا" حالانکہ روح و قلبِ انسان میں نہ تنگی ہے نہ کشادگی۔ یہ روحانی و معقولہ کیفیتیں ہیں۔ مجبوراً انھیں صورتِ محسوس میں بیان کرنا پڑتا ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے بہت ترقی کی۔ حالانکہ وہ اپنے مقام اور اپنی جگہ پر باقی و برقرار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا مقام بہت اونچا ہو گیا۔ حالانکہ وہ شخص دوسروں کی طرح

زمین پر چلتا پھرتا ہے ۔ یہ غلوؔ و ترقی ایک رُوحانی کیفیت اور معقولہ حقیقت ہے جسے مجبوراً صورت محسوس میں بیان کرنے کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ ظاہر میں بجز محسوسات اور کچھ نہیں ہے ۔ علم کو نور اور جہل کو تاریکی کہتے ہیں ۔ مُلاحظہ فرمائیں کیا علم ایسا نور ہے جو محسوس ہوتا ہے ۔ یا جہل ایسی تاریکی ہے جو محسوس ہوتی ہے ؟ ہرگز نہیں ! یہ ایک باطنی کیفیت ہے ۔ جب اُسے ظاہر میں بیان کرنا چاہتے ہیں تو علم کو نور اور جہل کو تاریکی کہتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ میرا دل تاریک تھا اب روشن ہوگیا ۔ حالانکہ علم کی روشنی اور جہل کی تاریکی حقیقتِ معقولہ ہیں محسوسہ نہیں ۔ ظاہر میں بیان کرنے کے لئے صورتہائے محسوسہ میں ہی بیان کرنا پڑتا ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ وہ کبوتر جو مسیح میں داخل ہوا تھا یہ ظاہری کبوتر نہ تھا ۔ بلکہ ایک کیفیتِ رُوحانی تھی ۔ جسے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے صورتِ محسوسہ میں بیان کیا گیا ہے ۔ مثلاً تورات میں ذکر ہے کہ خدا آگ کے ایک ستون کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا ۔ اس سے صورتِ محسوسہ مُراد نہیں ہے ۔ ایک حقیقتِ معقولہ ہے جسے صورتِ محسوسہ میں بیان فرمایا ہے ۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ " باپ بیٹے میں ہے اور بیٹا باپ میں ہے " کیا حضرت مسیح خدا کے اندر تھے اور خدا حضرت مسیح کے اندر تھا ؟ لَا وَاللّٰہ ! یہ تو ایک کیفیتِ معقولہ ہے ۔ جو بصورتِ محسوسہ بیان کی گئی ہے ۔ اب ہم اس عبارتِ مبارکہ کا بیان کرتے ہیں جس میں حضرت بہاءاللہ فرماتے ہیں :-

" یا سُلطان اِنّی کُنتُ کاحدٍ مّن العباد وراقداً علی المھاد مرّت علیّ نسائمُ السُّبحان وعلّمنی عِلمُ ما کان لیسَ ھذا من عندی بل من لّدن عزیزٍ علیم ۔ "

ترجمہ

" اُے سُلطان ! میں بھی خدائے تعالےٰ کے معمولی بندوں کی طرح ایک بندہ بستر استراحت پر سویا ہوا تھا کہ یکایک خدا کی نسیم لُطف مجھ پر ہو کر گذری اور جو کچھ ابتدائے آفرینش سے اب تک ظہور میں آیا اُس کا اُس نے مجھے علم دیا ۔ یہ بات میری طرف سے نہیں ہے بلکہ اُسی غالب باخبر کی طرف سے ہے ۔ "

(لوحِ السُّلطان)

یہ تجلّی کا مقام ہے ۔ محسوس نہیں معقول ہے ۔ یہ ماضی حال مستقبل سے مبرّا و منزّہ ہے تعبیر و تمثیل ہے ۔ مجازِ باطنی ہے نہ کہ حقیقتِ ظاہری ۔ اس حالت کو انسان سمجھ نہیں سکتا ۔ ایک حالت سے دوسری حالت میں آنے کو اس طرح بیان فرمایا ہے ۔ خواب حالتِ سکون ہے اور بیداری حالتِ حرکت

خواب حالتِ خاموشی ہے۔ بیداری حالتِ گفتار۔ خواب حالتِ خفا ہے اور بیداری حالتِ ظہور۔ مثلاً فارسی اور عربی میں استعارۃً کہتے ہیں کہ زمین سو رہی تھی۔ بہار آئی تو بیدار ہوئی، زمین مُردہ تھی بہار آئی تو زندہ ہوئی۔ یہ عبارت عالمِ معانی میں تمثیل و تشبیہ و تاویل ہے۔ المختصر مظاہر مقدسہ شروع ہی سے حقائقِ نورانیہ تھے اور ہیں۔ تغیر و تبدل کو اُن کی ذات میں دخل نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ظہور سے پہلے چونکہ سکون و خاموشی میں ہوتے ہیں تو گویا سوئے والے کی مانند ہیں اور ظہور کے بعد جاگنے والے کی طرح ناطق و شارق ہوتے ہیں ؛

(۱۶)

ولادتِ حضرت مسیح

سوال

حضرت مسیح کی ولادت کس طرح ہوئی

جواب

اس مسئلہ میں ماہرینِ الٰہیات اور مادّیون (منکرینِ روح) کے درمیان اختلاف ہے۔ الٰہیون کہتے ہیں کہ حضرت مسیح رُوح القدس سے پیدا ہوئے تھے۔ مادّیون کہتے ہیں کہ ایسا ہونا ناممکن اور خلافِ عقل ہے۔ یقیناً وہ باپ سے پیدا ہوئے تھے۔

قرآن میں فرمایا ہے فارسلنا الیھا روحنا فتمثّل لھا بشراً سویّا (سورۂ مریم) یعنی روح القدس نے انسان کی صورت اِس طرح اختیار کی کہ جس طرح آئینہ میں صورت پیدا ہوتی ہے اور مریم سے مخاطب ہو کر گفتگو کی۔

مادّیون کا خیال ہے کہ ازدواج ہونا ضروری ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ایک زندہ جسم ایک مردہ جسم سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور پھر تعلق نر و مادہ کے بغیر تولید ناممکن ہے۔ اُن کا قول ہے کہ نہ صرف انسانوں

میں ہی بلکہ حیوانات و نباتات میں بھی یہ بات ممکن نہیں۔ کیونکہ نر و مادہ تمام زندہ کائنات و نباتات میں پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن سے بھی زوجیتِ اشیاء کی دلیل دیتے ہیں۔ سُبحان الّذی خلق الازواج کلّھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون ۝ (سورۂ یٰسین) یعنی "پاک ذات ہے وہ جس نے بنائے جوڑے سب چیزوں کے اس قسم سے جو اُگتا ہے زمین میں اور خود اِن میں اور اُن چیزوں میں جن کی انھیں خبر نہیں۔" یعنی انسان وحیوان و نبات سب جوڑے جوڑے ہیں۔ "ومن کل شیءٍ خلقنا زوجین" ہم نے سب کائنات کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔"

لیکن الٰہیون کہتے ہیں کہ یہ بات محال و ممتنع نہیں ہے۔ ہاں! دیکھی نہیں گئی۔ اَن دیکھی چیز اور ناممکن چیز میں بہت فرق ہے۔ مثلاً پہلے زمانہ میں ایک آنِ واحد میں مشرق و مغرب سے بذریعہ ٹیلیگراف باتیں کرنا دیکھا نہ گیا تھا۔ ناممکن نہ تھا۔ فوٹوگراف غیر مرئی تھا۔ مستحیل نہ تھا۔ فوٹوگراف غیر مرئی تھا۔ ناممکن نہ تھا۔ مادّیون اپنی بات پر اصرار کرتے ہیں۔ الٰہیون جواب میں کہتے ہیں کہ یہ کرۂ ارض قدیم ہے یا حادث؟ مادّیون کہتے ہیں کہ سائنس اور کامل انکشافات سے ثابت ہے کہ حادث ہے۔ شروع میں ایک آتشیں گنبد تھا۔ آہستہ آہستہ اعتدال حاصل کرتا گیا۔ اور اِس پر پپڑی جم گئی۔ اس پپڑی پر سبزی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد حیوان بنے۔ پھر انسان پیدا ہوئے۔

الٰہیون کہتے ہیں تمھاری تقریر سے پتہ لگتا ہے کہ نوعِ انسان کرۂ ارض پر حادث ہے۔ قدیم نہیں۔ پس پہلا انسان یقیناً باپ اور ماں نہ رکھتا تھا۔ کیونکہ نوعِ انسان کا وجود حادث ہے۔ کیا انسان کا بے باپ اور بے ماں پیدا ہونا خواہ آہستہ آہستہ ہی ہو زیادہ مشکل ہے یا صرف بے باپ کے پیدا ہونا۔ جب تم اِس بات کو مانتے ہو کہ پہلا انسان آہستہ آہستہ یا ایک ہی دفعہ بے باپ اور بے ماں کے وجود میں آیا تھا تو پھر بلاشبہ انسان کا بے باپ کے پیدا ہونا بھی ممکن و جائز ہے۔ اسے مستحیل نہیں کہہ سکتے۔ اگر آپ مستحیل کہیں تو بے انصافی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ اس بات کو تو مانیں کہ یہ چراغ ایک وقت بغیر بتی اور تیل کے روشن تھا۔ اور پھر کہیں کہ بغیر بتی کے جلنا مشکل ہے۔ یہ تو سراسر بے انصافی ہے۔ حضرت مسیح کی تو ماں تھی۔ مگر مادّیون کے اعتقاد کے مطابق پہلے انسان کی نہ ماں تھی اور نہ باپ۔

(یح)

سوال از فضیلتِ بے پدری

بے باپ ہونے کی بزرگی اور اُس کے نتائج کیا ہیں؟

مسیح کی بزرگی اُس کے کمالات سے ہے!

ایک بزرگوار انسان بزرگوار ہے خواہ وہ بے باپ کے ہو یا باپ سے پیدا ہو۔ اگر بے باپ کے پیدا ہونا بزرگواری کی نشانی ہے تو آدم کُل انبیا، و رُسل سے بڑے ہیں۔ اور برتر ہیں۔ کیونکہ آپ کا نہ باپ تھا نہ ماں۔ عزت اور بزرگی کا سبب کمالاتِ الٰہیّہ کی تجلیات اور فیوضات ہیں۔ آفتاب مادہ اور صورت سے پیدا ہوا ہے۔ یہ دونوں اس کے لئے ماں باپ کے مانند ہیں۔ تاہم آفتاب کمالِ محض ہے۔ تاریکی نہ مادہ ہی رکھتی ہے نہ صورت ہی۔ نہ اُس کا باپ ہے نہ ماں مگر نقصِ صرف ہے۔ حضرت آدم کی جسمانی زندگی کا مادّہ خاک ہے۔ حضرت ابراہیم کی جسمانی زندگی کا مادہ نطفۂ پاک ہے۔ باپ کا طاہر نطفہ خاک و جماد سے البتہ بڑھ کر ہے۔ علاوہ ازیں انجیل یوحنا کے پہلے باب کی تیرھویں آیت میں فرماتا ہے:-

"لیکن جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنھیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا یعنی وہ جو اُس کے نام پر ایمان لائے وہ نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے نہ انسان کے ارادے سے بلکہ خدا سے پیدا ہوئے۔"

یوحنا کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حواریون کے وجود بھی قوّۂ جسمانی سے نہیں۔ بلکہ حقیقتِ روحانیہ سے متولد ہوئے تھے۔ حضرت مسیح اس لئے بزرگ نہیں کہ آپ بے پدر تھے۔ آپ کی بزرگی و شرافت خدائی تجلیات فیوض ربانی اور رُوحانی خوبیاں ہیں۔ اگر حضرت مسیح کی بزرگی آپ کے بے باپ ہونے کے سبب ہو تو آدم کو مسیح سے بزرگ تر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اُن کے باپ اور ماں دونوں ہی نہ تھے۔ تورات میں فرماتا ہے:-

"خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اُس کے نتھنوں میں زندگی کا دَم پھونکا۔ تو آدم جیتی جان ہوا۔"

مُلاحظہ فرمائیں۔ فرماتا ہے کہ آدم زندگی کی روح سے پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں عبارتِ یوحنا سے تو

یہ ثابت ہوتا ہے کہ حواری بھی آسمانی باپ سے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ حقیقت مقدسہ یعنی ہر بزرگوار کا وجود حقیقی خدا اور نفخۂ روح القدس سے موجود ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر بے باپ کے ہونا انسان کیلئے سب سے بڑی عزت ہے تو آدم سب سے بڑھ کر تھے۔ کیونکہ آپ کا نہ باپ تھا نہ ماں تھی۔ انسان کا ایک زندہ مادہ سے پیدا ہونا بہتر ہے یا خاک سے؟ البتہ زندہ مادہ سے پیدا ہونا بہتر ہے۔ مگر حضرت مسیح روح القدس سے پیدا ہوئے تھے۔ خلاصہ یہ کہ نفوس مقدسہ اور مظاہر الٰہیہ کی بزرگی و عزت خدائی تجلّیات اور ربانی کمالات اور روحانی فیوضات سے ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں۔

(یط)

حضرت مسیح کا بپتسمہ

سوال

انجیل متی کے تیسرے باب کی تیرھویں آیت میں فرماتا ہے:۔

"اسوقت یسوع گلیل سے یردن کے کنارے یوحنا کے پاس بپتسمہ لینے آیا۔ مگر یوحنا یہ کہکر اُسے منع کرنے لگا کہ میں تجھ سے بپتسمہ لینے کا محتاج ہوں اور تو میرے پاس آیا ہے؟ یسوع نے جواب میں اُس سے کہا اب تو ہونے ہی دے۔ کیونکہ ہمیں اسی طرح ساری راستبازی پوری کرنی مناسب ہے۔ اِس پر اُس نے ہونے دیا۔"

حضرت مسیح کو ذاتی کمال کے ہوتے ہوئے بپتسمہ کی کیا ضرورت تھی؟ اِس میں کیا حکمت ہے؟

جواب

بپتسمہ کی اصل توبہ ہے۔ حضرت یوحنا لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے اور توبہ کراتے تھے۔ پھر بپتسمہ دیتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ بپتسمہ تمام گناہوں سے توبہ کرنے کی رمز ہے۔ یعنی اے خدا جس طرح کہ میرا جسم جسمانی ناپاکیوں سے پاک ہو گیا ہے، اسی طرح میری روح کو عالم طبیعت کی اُن آلائشوں سے پاک کر جو تیری بارگاہِ احدیت کے قابل نہیں۔ توبہ نافرمانی سے مُنہ موڑ کر اطاعت کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ انسان خدا سے دوری و محرومی کے بعد توبہ کر کے غسل کرتا ہے پس یہ غسل اس بات کا اشارہ ہے کہ اے خدا میرے دل کو پاک و طاہر کر اور اپنے سوا دوسرے کی محبت سے پاک و صاف بنا۔

حضرت مسیح چاہتے تھے کہ جناب یوحنا کی اِس سُنّت کو لوگوں کے درمیان جاری کریں۔ لہذا آپ نے خود اُسے جاری فرمایا۔ تاکہ لوگ خبردار ہوں اور پہلی شریعت پوری ہو۔ یہ غسل توبہ اگرچہ یوحنا دیتے تھے مگر شریعت الٰہی میں پہلے سے موجود تھا۔ حضرت مسیح بپتسمہ کے محتاج نہ تھے۔ آپ نے اسلئے جاری فرمایا کہ اُس زمانہ میں یہ عمل ممدوح اور ملکوتِ الٰہی کی بشارت کا نشان تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ بپتسمہ آبِ عنصری سے نہیں بلکہ رُوح اور پانی سے ہونا چاہیئے۔ اِس جگہ پانی سے مُراد آبِ عنصری نہیں۔ کیونکہ دوسری جگہ تصریح فرماتے ہیں کہ بپتسمہ رُوح اور آگ سے ہونا چاہیئے۔ اِس آگ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ اور پانی سے مُراد معمولی آگ اور پانی نہیں۔ کیونکہ آگ سے بپتسمہ ہونا محال ہے۔ پس رُوح سے مُراد فیضِ الٰہی ہے۔ پانی سے علم و زندگی اور آگ سے محبت اللہ یعنے آبِ عنصری انسان کے دل کو پاک نہیں کر سکتا۔ اِس سے صرف بدن پاک و صاف ہو سکتا ہے۔ مگر آبِ آسمانی اور رُوح جو علم و زندگی ہیں۔ انسان کے دِل کو پاک و طاہر بناتے ہیں یعنی وہ دِل جو فیضِ رُوح القدس سے بہرہ ور ہوتا ہے پاک و صاف اور مقدس ہو جاتا ہے یعنی رُوحِ انسان عالمِ طبیعت کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہو جاتی ہے۔ عالمِ طبیعت کی آلودگیاں۔ بُری عادتیں یعنی غضب و شہوت۔ حبِ دُنیا۔ تکبر۔ جھوٹ۔ نفاق۔ تزویر۔ خود پرستی وغیرہ وغیرہ ہیں۔ انسان بفیضِ رُوح القدس کی تائیدات کے بغیر غلبۂ نفس و ہوئی سے چھوٹ نہیں سکتا۔ اِسی لئے فرماتے ہیں کہ رُوح اور پانی اور آگ سے بپتسمہ لینا لازم اور واجب ہے یعنی فیضِ الٰہی کی رُوح اور علم و زندگی کے پانی اور محبتِ خدا کی آگ سے بپتسمہ پائے تاکہ فیضِ ابدی سے فائدہ اٹھائے۔ ورنہ آبِ عنصری سے بپتسمہ پانے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو صرف گناہوں سے توبہ و استغفار کی رمز تھی۔ دورِ جمال مبارک میں اِس رمز کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ اب اِس رمز کی حقیقت یعنی رُوح اور محبت اللہ سے بپتسمہ پانا سب پہ ظاہر و باہر ہے۔

(ل)

بپتسمہ کی ضرورت

سوال

بپتسمہ موافق و لازم ہے یا نا موافق و غیر لازم؟ اگر لازم تھا تو کیوں منسوخ ہوا۔ اور اگر غیر لازم تھا تو یوحنا نے کیوں جاری کیا؟

جواب

حالات کا بدلنا اور زمانے کا انقلاب، ممکنات کے لوازم ذاتیہ میں سے ہے۔ لزومِ ذاتی حقیقتِ شیٔ سے جدا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آگ سے گرمی، پانی سے نمی، سورج سے روشنی کا جدا ہونا ناممکن اور محال ہے

کیونکہ یہ ان کے لزومِ ذاتی ہیں۔ پس چونکہ حالت کا تغیّر و تبدّل لوازمِ ممکنات سے ہے۔ اس لئے زمانے کے تغیّر و تبدّل کے سبب احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ کے زمانے میں شریعتِ موسوی حالت کے مناسب اور زمانہ کے مطابق تھی۔ مگر حضرت مسیح کے زمانہ میں حالات بدل جانے کے سبب یہی شریعتِ موسوی عالمِ انسانی کے مناسب اور موافق نہ رہی۔ اِس لئے منسوخ ہوگئی۔

چنانچہ حضرتِ رُوح اللہ نے سبت کو توڑ دیا۔ اور طلاق کو حرام فرمایا۔ اور حضرت مسیح کے بعد چاروں حواریوں نے جن میں پطرس اور پولوس بھی تھے، سوائے گلا گھونٹے ہوئے اور بتوں پر چڑھائے ہوئے حیوانوں اور خون کے اُن سب حیوانوں کا کھانا حلال کر دیا جن کا کھانا تورات میں حرام تھا۔ زنا کو بھی حرام رکھا۔ بعد ازاں پولوس نے گلا گھونٹے ہوئے اور بتوں پر چڑھائے ہوئے حیوانوں اور خون کو بھی حلال کر دیا۔ اور صرف زنا کو حرام رکھا۔ چنانچہ رومیوں کے نام اپنے خط کی چودھویں فصل کی چودھویں آیت میں لکھا ہے:-

مجھے معلوم ہے بلکہ خداوند یسوع میں مجھے یقین ہے کہ کوئی چیز بذاتہٖ حرام نہیں۔ لیکن جو اُس کو حرام سمجھتا ہے اُس کے لئے حرام ہے۔"

اِسی طرح ططس کے نام پولوس کے خط کی پہلی فصل کی پندرھویں آیت میں لکھا ہے:-

"پاک لوگوں کے لئے سب چیزیں پاک ہیں لیکن گناہ سے آلودہ اور بے ایمان لوگوں کے لئے کچھ بھی پاک نہیں بلکہ اُن کی عقل اور اُن کا دِل دونوں گناہ آلودہ ہیں"

یہ تغیّر و تبدّل اور تنسیخ اِس لئے ہوا کہ حضرت مسیح کا زمانہ حضرت موسیٰ کے زمانے سے بالکل جُدا تھا۔ اس کی حالت اور اس کی ضروریات بالکل بدل گئی تھیں۔ اس لئے وہ احکام منسوخ ہوگئے۔

وجودِ عالَم ایک انسان کی مانند ہے۔ انبیاء و رسل حاذق اطباء کی طرح ہیں۔ انسان ایک ہی حالت پر نہیں رہتا۔ مختلف امراض میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور ہر مرض کا علاج مخصوص ہوتا ہے۔ طبیب حاذق ہر مرض اور ہر بیماری کا ایک ہی علاج نہیں کرتا۔ بلکہ امراض و احوال کے اختلاف کی اقتضاء کے مطابق اَدویہ اور علاج بدلتا رہتا ہے۔ جب ایک شخص گرمی کے سبب بیمار ہوتا ہے تو طبیبِ حاذق اُسے بارد ادویہ دیتا ہے۔ مگر دوسرے وقت اُس شخص کا مزاج بدل جاتا ہے اور حرارت برودت سے تبدیل ہو جاتی ہے تو طبیبِ حاذق ادویۂ باردہ کو منسوخ کر کے اُن کی جگہ اَدویۂ حارّہ تجویز کرتا ہے۔ تغیّر و تبدّل مریض کی حالت کا اقتضا اور طبیب کی حذاقت کی ایک بڑی دلیل ہے۔ مثلاً مُلاحظہ فرمایئے کیا شریعتِ تورات اِس زمانے میں جاری ہو سکتی ہے۔ لا و اللہ۔ بلکہ مستحیل و محال ہے۔ پس خداوند تعالیٰ نے حضرت مسیح کے زمانے میں شریعتِ تورات کو منسوخ فرمایا۔ اِسی طرح بپتسمہ بھی یوحنا بپتسمہ دینے والے کے زمانے میں لوگوں کے لئے تنبیہ اور خوف کا سبب ہوتا تھا۔

کہ وہ سب گناہوں سے توبہ کر کے ملکوتِ مسیح کے ظہور کے منتظر رہتے تھے۔ لیکن آجکل ایشیا میں کیتھولک اور ارتھوڈکس لوگ شیر خوار بچوں کو روغنِ زیتون سے ملے ہوئے پانی میں غوطہ دیتے ہیں جس سے بعض بچے بیمار ہو جاتے ہیں۔ اور بپتسمہ کے وقت لرزتے اور تڑپتے ہیں۔

بعض دوسرے مقاموں میں پادری بپتسمہ کے وقت پیشانی پر پانی چھڑکتا ہے۔ مگر نہ ہی اول صورت میں اور نہ ہی دوسری حالت میں بچے کسی طرح کا روحانی احساس رکھتے ہیں۔ پس اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسری اقوام تعجب کرتی ہیں کہ اس دودھ پیتے بچے کو کیوں پانی میں غوطہ دیتے ہیں۔ اس سے نہ تو بچے کو تنبیہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے ایمان و ایقان کا سبب ہوتا ہے۔ صرف ایک رسم ہے جسے جاری رکھا ہوا ہے۔ یوحنا بپتسمہ دینے والے کے وقت ایسا نہ تھا۔ حضرت یوحنا لوگوں کو پہلے نصیحت فرماتے تھے اور گناہوں سے توبہ کرا کے ظہور مسیح کے انتظار کا شوق بڑھاتے تھے۔ جو شخص بپتسمہ پاتا تھا وہ نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ گناہوں سے توبہ کرتا تھا اور اپنے بدن کو بھی ظاہری آلودگیوں سے پاک و صاف رکھتا تھا۔ اور رات دن کمالِ اشتیاق سے ظہور مسیح کا اور ملکوتِ روح اللہ میں داخل ہونے کا منتظر رہتا تھا۔ الغرض مقصود یہ ہے کہ حالت کا تغیر و تبدل اور زمانہ و وقت کی ضروریات کا انقلاب شرائع کے منسوخ ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا وقت آتا ہے جب پہلے احکام حالات کے مطابق و موافق نہیں رہتے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں کہ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ اور آخری زمانہ کی مقتضیات میں کس قدر تفاوت ہے کیا یہ ممکن ہے کہ قرونِ اولیٰ کے احکام آج زمانۂ آخر میں جاری کئے جائیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ناممکن و محال ہے۔ اسی طرح بہت صدیاں گذرنے کے بعد زمانۂ حال کی مقتضیات زمانہ آئندہ کی ضروریات کے موافق نہ رہینگی۔ لابد تغیر و تبدل کا سبب ہونگی۔

تمھارے یورپ میں بھی احکام ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ کتنے ہی احکام پہلے یورپ کے قوانین و نظامات میں موجود تھے مگر آجکل منسوخ ہیں۔ یہ تغیر و تبدل خیالات و حالات و اطوار کے تغیر و تبدل کے سبب ہے۔ اور اس کے بغیر عالمِ بشر کی خوش حالی پُر خلل رہتی ہے۔ مثلاً تورات کا حکم ہے کہ سبت کا توڑنے والا قتل کر دیا جائے۔ اور ایسے ہی قتل کے دس حکم تورات میں ہیں۔ کیا آجکل کے زمانے میں ان احکام کا جاری کرنا ممکن ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ ناممکن و محال ہے اس لئے بدل دیئے گئے احکام کا یہ تغیر و تبدل حکمتِ بالغۂ الٰہیہ کی ایک پوری پوری دلیل ہے۔ اس مسئلہ میں گہرے غور و خوض کی ضرورت ہے۔ تب اس تغیر و تبدل کا سبب واضح و آشکار ہو جائے گا۔ مبارک ہیں وہ جو سوچتے اور سمجھتے ہیں۔

(۲۷)

روٹی اور شراب سے کیا مراد ہے؟

سوال

حضرت مسیح فرماتے ہیں "میں وہ روٹی ہوں جو آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ جو اس روٹی سے کھاتا ہے کبھی نہیں مرتا" اس بیان سے کیا مطلب ہے؟

جواب

اس روٹی سے مراد مائدۂ آسمانی اور کمالاتِ الٰہی ہیں۔ جو کوئی اس غذا کو کھاتا ہے یعنی فیض الٰہی کو حاصل کرتا ہے وہ ہمیشہ کی زندگی پالیتا ہے۔ خون سے بھی زندگی کی روح مراد ہے۔ اور یہ زندگی کی رُوح کمالاتِ الٰہی وجلوۂ ربانی وفیض صمدانی ہے۔ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ بدنِ انسان کے تمام اجزاء خون کے دَوران ہی سے مادۂ حیات حاصل کرتے ہیں۔ انجیل یوحنا کے چھٹے باب کی آیت ۲۶ میں فرماتا ہے:۔ "میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم مجھے اس لئے نہیں ڈھونڈھتے کہ (تم نے) معجزے دیکھے۔ بلکہ اس لئے کہ تم روٹیاں کھا کر سیر ہوئے۔"

یہ معلوم ہی ہے کہ وہ روٹی جسے حواری کھا کر سیر ہوئے تھے وہ فیوضاتِ آسمانی تھے۔ کیونکہ اسی باب کی تیئیسویں آیت میں فرماتا ہے:۔

"کیونکہ خدا کی روٹی وہ ہے جو آسمان سے اُتر کر دنیا کو زندگی بخشتی ہے۔"

یہ معلوم ہی ہے کہ حضرت مسیح کا جسم آسمان سے نازل نہ ہوا تھا۔ حضرت مریم کے رحم سے آیا تھا۔ آسمان سے جو نازل ہوا تھا وہ حضرت مسیح کی روح تھی۔ اس لئے یہودیوں نے یہ گمان کر کے کہ آنحضرت کا مطلب جسم ہے اعتراض کیا۔ جو اسی باب کی بیالیسویں آیت میں درج ہے۔

"اور اُنھوں نے کہا کیا یہ یوسف کا بیٹا یسوع نہیں جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے ہیں۔ اب کیونکر کہتا ہے کہ میں آسمان سے اترا ہوں۔"

ملاحظہ کریں کہ کس قدر واضح ہے کہ آسمانی روٹی سے آنحضرت کی مراد آنحضرت کی رُوح اور آپ کے فیوضات وکمالات وتعلیمات ہیں۔ جیسا کہ اسی باب کی ترسیٹھویں آیت میں فرماتے ہیں:۔

"زندہ کرنے والی تو رُوح ہے۔ جسم سے کچھ فائدہ نہیں"

پس واضح ہوا کہ رُوح مسیح نعمت آسمانی تھی جو آسمان سے نازل ہوئی۔ اور جس کسی نے اُس رُوح سے فیض پایا یعنی تعلیم آسمانی کو اختیار کیا اُس نے ہمیشہ کی زندگی پائی۔ اِس لئے اِسی باب کی آیت ۳۵ میں فرماتا ہے:۔ "یسوع نے ان سے کہا زندگی کی روٹی میں ہوں۔ جو میرے پاس آئیگا وہ ہرگز بھوکا نہ ہوگا۔ اور جو مجھ پہ ایمان لائے گا وہ بھی کبھی پیاسا نہ ہوگا۔"

مُلاحظہ فرمائیے کہ کھانے کو اقبال اور پینے کو ایمان سے توضیح فرماتے ہیں۔ پس واضح و محقق ہوگیا کہ غذائے آسمانی سے مُراد فیوضاتِ رحمانیہ و تجلیات روحانیہ و تعالیم سمائیہ و معانی کُلیہ حضرت مسیح ہیں۔ اور کھانے کا مطلب اقبال کرنا اور پینے سے مُراد ایمان لانا ہے۔ کیونکہ آنحضرت کے لئے ایک جسم عنصری اور ایک جسم آسمانی تھا۔ جسم عنصری مصلوب ہوا۔ اور جسدِ آسمانی زندہ اور باقی اور ہمیشہ کی زندگی کا سبب بنا۔ جسدِ عنصری طبیعتِ بشری تھی اور جسدِ آسمانی طبیعت رُوحانی۔ سبحان اللہ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ قربانی کی روٹی حقیقتِ مسیح ہے اور لاہوت اور رُوح القدس اس میں حلول کئے ہوئے موجود ہیں۔ حالانکہ یہ قربانی کی روٹی کھانے کے چند منٹ بعد بالکل بدل جاتی ہے۔ پھر کس طرح ایسے وہم کا تصوّر ممکن ہے؟ استغفر اللہ من ھذا الوھم العظیم (ایسے بھاری وہم سے خدا کی پناہ)

خُلاصہ یہ کہ حضرت مسیح کے ظہور سے تعالیم مقدسہ جو فیض ابدی ہیں منتشر ہوئیں۔ ہدایت کے انوار چمک اُٹھے۔ حقائق انسانی کو زندگی کی رُوح بخشی گئی۔ جس نے ہدایت پائی وہ زندہ ہوا۔ اور جو گمراہ رہا ہمیشہ کی موت میں گرفتار ہوا۔ وہ روٹی جو آسمان سے نازل ہوئی تھی وہ حضرت مسیح کا جسد ملکوتی اور اُس کا عنصر رُوحانی تھا۔ جسے حواریون نے تناول کیا۔ اور ہمیشہ کی زندگی پائی۔ حواریوں نے تو حضرت مسیح کے ساتھ بہت سی دفعہ غذا کھائی تھی۔ عشاء ربانی مخصوص کیوں کی گئی۔ پس معلوم ہوا کہ آسمانی روٹی سے مُراد یہ عنصری روٹی نہیں۔ بلکہ غذائے خدائی سے مُراد حضرت مسیح کا جسد رُوحانی تھا۔ اور وہ فیوضاتِ ربانیہ اور کمالاتِ رحمانیہ تھے جو حواریون نے حاصل کئے۔ اور اُن سے سیر حاصل ہوئے۔ یہ بھی مُلاحظہ فرمائیں کہ جس وقت حضرت مسیح نے روٹی کو برکت دی اور یہ فرمایا کہ یہ میرا جسم ہے۔ حواریوں کو دی۔ اُس وقت آنحضرت حواریون کے پاس مشخص و معین و مجسم موجود تھے۔ آپ روٹی اور شراب نہ بن گئے تھے۔ اگر روٹی اور شراب ہوگئے ہوتے تو اُس وقت حضرت مسیح حواریوں کے پاس مجسم و معین و مشخص بیٹھے نہ ہوتے۔ پس معلوم ہوا کہ روٹی اور شراب ایک رمز تھی۔ جس سے یہ مُراد تھی کہ میرے فیوضات و کمالات تم کو دیئے گئے۔ اور جب تم اس فیض کو حاصل کرو گے تو ہمیشہ کی زندگی پاؤ گے اور مائدہ آسمانی تمھیں نصیب ہوگا۔

(کب)

معجزات

سوال

حضرت مسیح کے بہت سے معجزے بیان کئے جاتے ہیں۔ کیا یہ روایات لفظی طور سے صحیح ہیں یا اِن کے کچھ اور معنے ہیں۔ کیونکہ صحیح علم سے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اشیاء کی ماہیت نہیں بدلتی اور کُل کائنات ایک عالمگیر قانون کے ماتحت منظم ہے۔ جس میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ پس اس عالمگیر قانون کو توڑنا کس طرح ممکن ہے؟

جواب

خدا کے مظاہر مقدسہ معجزات کے مصدر اور عجیب عجیب آثار کے مظہر ہوتے ہیں۔ ہر مشکل اور غیر ممکن کام اُن کے لئے ممکن و جائز ہے۔ کیونکہ وہ خارق العادہ قوۃ کے مالک ہوتے ہیں۔ اور اُن سے غیر معمولی باتیں صادر ہوتی ہیں۔ اور طبیعت سے بلند و بالا قدرت کے ساتھ عالم طبیعت میں حیرت انگیز تاثیر دکھاتے ہیں۔ سب سے عجیب عجیب اُمور صادر ہوئے۔ مگر مقدس کتابوں میں مخصوص اصطلاح موجود ہے اُن کے روبرو یہ معجزات اور عجیب عجیب آثار کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ ان کے ذکر کے خواہشمند بھی نہیں ہوتے۔ کیونکہ اگر معجزات کو ہم سب سے بڑی بُرہان مان لیں تو یہ نہ تو اُن کے لئے کوئی دلیل و حجت ہیں جن کے سامنے یہ ظاہر ہوں اور نہ اُن کے لئے جو اُسوقت وہاں نہ ہوں۔ مثلاً اگر ایک شخص طالب کو جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو نہ جانتا ہو، اُن کے معجزات بتائے جائیں تو وہ انکار کرے گا اور کہیگا کہ بتوں کے لئے بھی بہت سے لوگوں نے تواتر کے ساتھ ایسی عجیب روایتیں اور ایسے عجیب معجزات بیان کئے ہیں اور کتابوں میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔ برھمنوں نے برھما کے معجزات کی ایک کتاب لکھی ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔ کس طرح معلوم ہو کہ یہودی اور عیسائی سچ کہتے ہیں اور برہمن جھوٹ کہتے ہیں۔ دونوں مشہور روایتیں اور دونوں تواتر کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں اور دونوں کتاب میں لکھی ہوئی ہیں۔ دونوں کو سچا یا جھوٹا سمجھا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح دوسرے مذاہب کے لئے بھی۔ اگر سچ ہیں تو سب سچ ہیں اور قبول کرنا ہے تو سب کو قبول کرنا پڑیگا۔ پس معجزات دلیل نہیں ہوسکتے۔ اگر انھیں مان بھی لیا جائے تو یہ اُن کے لئے دلیل ہوسکتے ہیں جو وہاں موجود ہوں۔ جو وہاں نہ ہوں اُن کے لئے دلیل نہیں ہوسکتے۔

ظہور کے دنوں میں اہلِ نظر مظہرِ ظہور کی ہر شان کو معجزہ دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی ہر شان دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ جو بات دوسروں میں نہ پائی جائے وہ سراسر معجزہ ہے۔ مُلاحظہ فرمائیں کہ حضرت مسیح نے تن تنہا، بغیر یار و مددگار، بلا سپاہ و لشکر نہایت مظلومیت کے ساتھ تمام اہلِ زمین کے مقابل خدائی جھنڈا بلند کیا اور سب کا مقابلہ کیا۔ آخر کار سب پر غالب آئے۔ اگرچہ بظاہر اُنھیں سولی پر چڑھایا گیا۔ اب یہ واقعہ سراسر معجزہ ہے۔ اور کوئی اِس کا انکار نہیں کرسکتا۔ اِس کے بعد حضرت مسیح کی سچائی کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ معجزاتِ ظاہرہ اہلِ حقیقت کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ مثلاً اگر ایک اندھا بینا کر دیا جائے تو آخر کار وہ پھر اندھا ہو جاتا ہے۔ یعنی مرجاتا ہے اور سب حواس اور قوّتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اندھے کو بینا کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ قوت آخر کار ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر مُردہ زندہ ہو جائے تو اِس کا کیا نتیجہ؟ وہ تو پھر مر جاتا ہے۔ ہاں اگر اہمیت ہے تو بصیرت اور ہمیشہ کی زندگی عطا کرنے میں ہے۔ یعنی رُوحانی زندگی دینے میں۔ کیونکہ جسم کی زندگی کو بقا نہیں اور اِس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے جیسا کہ حضرت مسیح نے ایک شاگرد کو جواب دیا تھا۔ کہ :-

"جانے دے کہ مُردے مُردہ کو دفن کریں۔ کیونکہ جو جسد سے پیدا
ہوا وہ جسد ہے اور جو روح سے پیدا ہوا وہ رُوح ہے۔"

آپ دیکھیں کہ اُن لوگوں کو جو بظاہر زندہ تھے حضرت مسیح مردہ سمجھتے ہیں۔ اگر زندگی قابلِ ذکر ہے تو وہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔ اور اگر کوئی وجود ہے تو وہ وجودِ حقیقی ہے۔ پس اگر مقدّس کتابوں میں مُردوں کو زندہ کرنے کا ذکر پایا جاتا ہے تو اُس سے مطلب یہ ہے کہ اُن لوگوں نے ہمیشہ کی زندگی پائی۔ اندھے کے بینا ہونے کا ذکر اگر ہے تو اِس بینائی کا مطلب حقیقی بصیرت پانا ہے۔ اگر بہرے سُننے لگے لکھا ہوا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے روحانی کان پائے اور سماعت ملکوتی سے بہرہ ور ہوئے۔ یہ بات نصِ انجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا ہے کہ یہ اُن کی مانند ہیں جن کے بارے میں اشعیا کہتا ہے "یہ آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ کان رکھتے ہیں لیکن سُنتے نہیں"۔ میں انھیں شفا دیتا ہوں۔

ہمارا مقصد یہ نہیں کہ مظاہر ظہور معجزات دکھانے سے عاجز ہیں۔ نہیں۔ ضرور قادر ہیں۔ لیکن اُن کے نزدیک باطنی بینائی رُوحانی کان اور ہمیشہ کی زندگی مقبول و اہم ہے۔ پس جہاں کہیں بھی مقدّس کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اندھا بینا ہوا اُس کا مطلب یہ ہے کہ کور باطن تھا روحانی بینائی سے بہرہ ور ہوا۔ یا یہ کہ جاہل تھا عالم بن گیا۔ غافل تھا ہُشیار ہو گیا۔ ناسوتی تھا ملکوتی بن گیا۔ چونکہ یہ بصیرت و سماعت و حیات و شفا ابدی ہیں اس لئے اہمیت رکھتی ہے۔ حیات و قوائے حیوانی کی بھلا کیا اہمیت و قدر و حیثیت ہے۔ وہ تو اوہام کی مانند ہیں

جو گنتی کے چند دنوں کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ ایک بجھا ہوا چراغ روشن کیا جاتا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد وہ پھر بجھ جاتا ہے۔ مگر چراغِ آفتاب ہمیشہ روشن ہے اور اہمیت رکھتا ہے۔

(بیج)

حضرت مسیح کا دوبارہ جی اُٹھنا

سوال

حضرت مسیح کے تین روز کے بعد جی اُٹھنے کا مطلب کیا ہے؟

جواب

مظاہر الٰہیہ کا قیام جسد سے تعلق نہیں رکھتا۔ اُن کی تمام شئونات و حالات و اعمال و اُصول و تعلیم۔ اُن کے بیانات۔ اُن کی تمثیلات۔ اُن کی ہدایات سب کی سب امورِ روحانی سے متعلق ہوتی ہیں۔ جسمانیات سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً مسیح کے آسمان سے آنے کا مسئلہ جو انجیل میں کئی جگہ صراحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ ابن الانسان آسمان سے آیا۔ ابنِ الانسان آسمان میں ہے اور آسمان کو چلا جائے گا۔ یوحنا کی انجیل کے چھٹے باب کی آٹھویں آیت میں فرماتا ہے۔ "کیونکہ میں آسمان سے آیا ہوں" پھر بیالیسویں آیت میں فرماتا ہے "کہتے تھے کہ کیا یہ شخص یوسف کا بیٹا یسوع نہیں جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے ہیں۔ پھر یہ شخص کس طرح کہتا ہے کہ میں آسمان سے آیا ہوں" پھر یوحنا کی انجیل کے تیسرے باب کی تیرھویں آیت میں فرماتا ہے۔ "کوئی آسمان کو نہیں گیا مگر وہ جو آسمان سے آیا ہے۔ حتیٰ کہ ابنِ الانسان جو آسمان میں ہے۔" غور فرمائیں۔ فرماتے ہیں "ابنِ الانسان آسمان میں ہے" حالانکہ آپ اُس وقت زمین پر تھے۔ اسی طرح ملاحظہ فرمائیں کہ مسیح آسمان سے آیا ہے۔ حالانکہ آپ مریم کے پیٹ سے آئے تھے اور آپ کا جسم مریم سے تولد ہوا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اس عبارت کا مقصد کہ "ابنِ الانسان آسمان سے آیا ہے" معنوی ہے نہ کہ ظاہری۔ روحانی ہے نہ کہ جسمانی۔ یعنی اگرچہ حضرت مسیح بظاہر مریم کے پیٹ سے تولد ہوئے تھے مگر آسمان یعنی مرکزِ آفتابِ حقیقت، عالمِ روحانی، ملکوتِ الٰہی سے آئے تھے۔

پس جب یہ واضح ہو گیا کہ مسیح آسمانِ روحانی یا ملکوتِ الٰہی سے آئے تھے، اسی طرح آپ کا

زیرِ زمین تین دن تک رہنا بھی ایک معنوی حقیقت ہے۔ ظاہری صورت نہیں۔ اور آپ کا زمین کے اندر سے اُٹھنا بھی ایک امرِ معنوی اور کیفیتِ رُوحانی ہے نہ کہ جسمانی۔ اِسی طرح مسیح کا آسمان کو چڑھنا بھی ایک امرِ معنوی ہے نہ کہ جسمانی۔

علاوہ ازیں سائنس کی رُو سے یہ بات ثابت و محقق ہوگئی ہے کہ یہ ظاہری آسمان ایک فضائے نامتناہی ہے۔ جو فارغ و خالی ہے اور جس میں ستارے و سیارے گھومتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ مسیح کے جی اُٹھنے سے مُراد یہ ہے کہ حضرت مسیح کی شہادت کے بعد آپ کے حواری بے چین و پریشان ہوگئے تھے۔ مسیحی حقیقت جو آپ کی تعلیمات و فیوضات و کمالات اور مسیحی قوتِ روحانی تھی۔ شہادت کے بعد دو تین روز تک مخفی و مستور رہی۔ اِس کا جلوہ و ظہور نہ رہا۔ بلکہ بالکل گُم ہوگئی تھی کیونکہ آپ کے ماننے والے گنتی کے چند شخص تھے۔ وہ بھی بے چین و پریشان ہوگئے تھے۔ آپ کا امر جو کہ رُوح اللہ تھا بے جان جسم کی طرح ہوگیا۔ پھر جب تین روز کے بعد آپ کے حواری ثابت و راسخ اور امرِ مسیح کی خدمت پر کمربستہ ہوئے اور اُنھوں نے تعالیمِ الٰہی کو جاری کرنے کا پکّا ارادہ کر لیا کہ مسیح کی وصیتوں کو جاری کریں اور آپ کی خدمت کے لئے کھڑے ہو جائیں تو حقیقتِ مسیح جلوہ گر ہوئی آپ کا فیض ظاہر ہوا۔ آپ کی شریعت نے جان پائی اور آپ کی تعالیم و ہدایات آشکار ہوئیں۔ یعنی حضرت مسیح کا امر ایک جسم بے جان کی طرح تھا۔ اِس میں جان پڑی اور رُوح القدس کے فیض نے اُس کی حمایت کی۔ یہ ہیں مسیح کے جی اُٹھنے کے معنی۔ اور یہ جی اُٹھنا حقیقی تھا۔ مگر پادریوں نے انجیل کے معنوں کو نہ سمجھکر اور اِس رمز کو نہ جان کر یہ کہنا شروع کیا کہ دین علم کے مخالف اور علم دین کا دشمن ہے مثلاً مسیح کا جسم عنصری کے ساتھ اس آسمانِ ظاہری پر چڑھ جانے کا مسئلہ علم ریاضی کے مخالف ہے۔ مگر جب اِس مسئلہ کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اور یہ رمز بیان کر دی جاتی ہے تو علم بالکل اس کا مخالف نہیں ہوتا۔ بلکہ علم و عقل اس کی تصدیق کرتے ہیں ؀

(۱۷)

حلولِ رُوح القدس حواریوں میں

سوال :۔ انجیل میں لکھا ہے کہ رُوح القدس نے حواریوں میں حلول کیا۔ یہ کس طرح ہوا۔ اور اِس کے کیا معنی ہیں ؟

جواب:- رُوح القُدس کا یہ حلول ہَوا کی مانند نہیں جو جوفِ انسان میں حلول کرتی ہے۔ یہ تشبیہ وتعبیر ہے۔ ظاہری معنی مُراد نہیں۔ جس طرح آفتاب آئینوں میں حلول کرتا ہے اسی طرح رُوح القُدس نے یہ حلول کیا تھا یعنی اُس کی تجلّی ظاہر ہوئی تھی۔ حضرت مسیح کے بعد آپ کے حواری مضطرب ہو گئے تھے اُن کی آراء۔ اُن کے خیالات منتشر و مختلف تھے۔ پھر ثابت و متحد ہو گئے۔ عید عنصرہ (پینتیکست) کے دن جمع ہوئے اور انقطاع اختیار کیا۔ اپنے آپ کو فراموش کیا۔ اس دُنیا کے آرام اور اُس کی خوشیوں کو خیرباد کہا۔ جسم و رُوح کو اپنے محبوب پر فدا کیا۔ گھر بار کو چھوڑ دیا۔ بے سروسامان و سرگردان ہوئے یہانتک کہ اپنی ہستیوں کو بھی بھلا دیا۔ پس تائیدِ الٰہی نازل ہوئی اور رُوح القُدس کی قوت ظاہر ہوئی مسیح کی رُوحانیت نے غلبہ کیا۔ اور خدا کی محبت نے بے اختیار کر دیا۔ اُس دن تائید ملی اور ہر ایک نے تبلیغ امر اللہ کے لئے ایک راہ اختیار کی اور دلیل و برہان کی زبان کھولی۔ پس رُوح القُدس کے حلول سے یہ مُراد ہے کہ وہ رُوحِ مسیحائی سے منجذب اور امر اللہ پر ثابت و مستقیم ہوئے۔ رُوحِ محبت اللہ سے نئی زندگی پانے والے بنے۔ اور اُنھوں نے حضرت مسیح کو زندہ اور معین و مددگار دیکھا۔ قطرہ تھے دریا ہو گئے مکھی تھے۔ عقابِ آسمانی بن گئے۔ کمزور تھے قوی ہو گئے۔ اُن کی مثال اُن آئینوں کی مانند ہے جو آفتاب کے سامنے آ جائیں۔ یقیناً اُن میں اُس کے پرتو و انوار ضرور آشکار ہوں گے ؛

(۲۳)

رُوح القُدس

سوال:- رُوح القدس کیا ہے؟

جواب:- رُوح القدس سے مُراد فیضِ الٰہی اور وہ شعاعیں ہیں جو مظہرِ ظہور سے چمکیں۔ آفتابِ حقیقت کی شعاعوں کے مرکز حضرت مسیح تھے اور اِس مرکزِ جلیل یعنی حقیقتِ مسیح سے فیضِ الٰہی کُل آئینوں یعنی حقائقِ حواریون پر چمکا۔ حواریون پر رُوح القدس اُترنے سے یہ مُراد ہے کہ اِس فیضِ جلیلِ الٰہی نے حقائقِ حواریون پر تجلّی فرمائی اور فیض افشانی کی۔ کیونکہ دخول و خروج و نزول و حلول اجسام کے خواص ہیں۔ ارواح کے نہیں۔ یعنی دخول و حلول وغیرہ حقائقِ محسوسہ کے لئے ہے۔ لطائفِ معقولہ کے لئے نہیں۔ مثلاً حقائقِ معقولہ عقل و محبت و علم و تصور و فکر کے لئے دخول و خروج نہیں۔ بلکہ اُن کا

تعلق کہا جاتا ہے۔ مثلاً علم ایک حالت کا نام ہے جسے عقل حاصل کرتی ہے۔ یہ ایک حالتِ معقول ہے اور عقل میں داخل اور خارج ہونا موہوم باتیں ہیں۔ بلکہ عقل وحصولِ علم کا ایسا ہی تعلق ہے جیسے آئینہ میں عکس کا ظاہر ہونا۔ پس جب یہ ظاہر اور ثابت ہوگیا کہ حقائق معقولہ کے لئے دُخول وحلول نہیں ہے تو البتہ رُوح القدس کے لئے بھی چڑھنا اور اُترنا۔ داخل و خارج ہونا۔ ملنا اور تحلیل ہونا غیر ممکن ومحال ہے۔ نہایت یہ ہے کہ رُوح القدس آفتاب کی مانند آئینوں میں جلوہ نما ہے۔ کُتبِ مقدسہ کی بعض عبارتوں میں رُوح کا ذکر کر کے کوئی شخص مُراد لیا جاتا ہے۔ جیسے کہ عام بول چال میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص رُوحِ مجسّم ہے۔ یا یہ کہ حمیّت و مروّت کا مجسّمہ ہے۔ اِن مقامات میں ہم شیشے کو نہیں بلکہ چراغ کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ انجیل یوحنا کے باب ۱۶ کی ۱۲ و ۱۳ آیات میں مسیح کے بعد آنے والے ظہور کے بارے میں فرمایا ہے :-

"مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچّائی کی رُوح آئے گا تو تم کو تمام سچّائی کی راہ دکھائے گا۔ اِس لئے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آئندہ کی خبریں دیگا۔"

خوب غور سے مُلاحظہ فرمائیں "اِس لئے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا" اِس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ "سچّائی کی رُوح" ایک انسانِ مجسّم ہے جو شخصیت رکھتا ہے۔ کان اور زبان رکھتا ہے جس سے سُنتا بولتا ہے۔ اِسی طرح "رُوح اللہ" حضرت مسیح کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ آپ چراغ کہتے ہیں مگر آپ کی مُراد اِس سے روشنی اور لیمپ دونوں ہیں ۔

(۲۵)

مسیح کی آمدِ ثانی

کُتبِ مقدسہ میں لکھا ہے کہ مسیح دوبارہ آئے گا۔ آپ کی آمدِ ثانی کے لئے کچھ علامات دی گئی ہیں کہ جب آپ آئینگے تو اِن نشانوں کے ساتھ آئینگے۔ نشانوں میں سے کچھ یہ ہیں کہ سورج اندھیرا ہو جائے گا۔ چاند روشنی نہ دے گا۔ آسمان کے ستارے زمین پر گر پڑینگے۔ اُس وقت زمین کے سب قبائل روئیں اور پیٹینگے تب ابنِ انسان کی علامت آسمان پر نمودار ہوگی اور ابنِ آدم کو بڑی قوّت و جلال کے ساتھ ابر پر سوار

آتا دیکھینگے۔" حضرت بہاءاللہ نے کتاب ایقان میں ان آیات کی مفصل و مشرح تفسیر فرمائی ہے۔ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اس کتاب کو پڑھیں۔ اِن کلمات کے معانی آپ سمجھ جائیں گے۔ میں یہاں چند باتیں اِس بارے میں بتاتا ہوں اور وہ یہ ہیں کہ آمدِ اوّل میں بھی مسیح آسمان سے آئے تھے۔ چنانچہ انجیل میں صاف لکھا ہے۔ حضرت مسیح خود فرماتے ہیں "ابن آدم آسمان سے آیا ہے۔ ابن آدم آسمان میں ہے۔ اور آسمان کی طرف کوئی نہیں چڑھتا سوائے اُس کے جو آسمان سے آئے" حالانکہ حضرت مسیح بظاہر رحمِ مریم سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر عام طور سے یہ مانا جاتا ہے کہ آپ آسمان سے آئے تھے۔ جس طرح پہلی مرتبہ بظاہر رحمِ مادر سے لیکن فی الحقیقت آسمان سے آئے تھے۔ اِسی طرح آمدِ ثانی میں بھی بحقیقت آسمان سے اور بظاہر رحمِ مادر سے آئینگے۔

نشانیاں جو آپ کی آمدِ ثانی کے بارے میں دی گئی ہیں وہی آپ کی آمدِ اوّل کے بارے میں درج ہیں۔ چنانچہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کتاب اشعیا میں خبر دیتا ہے کہ مسیح مشرق و مغرب کو فتح کرے گا۔" تمام دُنیا کی اقوام زیرِ سایۂ مسیح آئیں گی۔" مسیح کی سلطنت قائم ہوگی۔ مسیح نامعلوم جگہ سے آئیگا۔ گنہگاروں کی عدالت ہوگی۔ اور انصاف کا ایسا دَور دَورہ ہوگا کہ بھیڑیا اور برہ۔ شیر اور بکری۔ سانپ اور شیر خوار بچہ ایک چشمہ اور ایک چمن اور ایک آشیانہ میں جمع ہونگے۔

آمدِ اوّل کے لئے بھی یہی نشانیاں تھیں۔ حالانکہ بظاہر اُن میں سے ایک بھی پوری نہیں ہوئی۔ اِسی لئے یہودیوں نے مسیح پر اعتراض کئے اور مسیح کو استغفراللہ مسیخ کہا۔ آپ کو خدائی دین کا خراب کرنے والا شریعت و سبت کو توڑنے والا سمجھکر آپ کے قتل کا فتویٰ دیا۔ حالانکہ ہر ایک نشانی کے ایک معنیٰ تھے۔ مگر یہودی اِن معنوں کو نہ سمجھ سکے اور مسیح کو پہچاننے سے پس ماندہ رہے۔ مسیح کی آمدِ ثانی بھی اِسی ڈھنگ سے ہے۔ سب حالات اور نشانیوں کے باطنی معنی ہیں۔ ظاہری و لغوی معنی نہیں۔ کیونکہ اگر لفظی معنے لئے جائیں تو نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تمام ستارے زمین پر گر جائینگے۔ ستارے بے پایاں اور بے شمار ہیں اور موجودہ عُلمائے ریاضی نے از روئے تحقیق یہ ثابت کر دیا ہے کہ سورج زمین سے قریباً ڈیڑھ ملیون گنا بڑا ہے اور ہر ایک ثابت ستارہ سورج سے ہزار گنا بڑا ہے۔ اگر یہ ستارے جھڑ کر گریں تو زمین پر انھیں کہاں جگہ ملیگی یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ ہمالیہ جیسے ہزاروں ملیون پہاڑ ایک رائی کے دانے پر گریں۔ یہ بات سراسر عقل و شعور کے خلاف اور غیر ممکن و محال ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح فرماتے ہیں "شاید میں اُس وقت آؤں جب تم سو رہے ہوگے۔ کیونکہ ابن انسان کا آنا چور کے آنے کی طرح ہوگا۔ یعنی چور گھر میں آئے اور گھر کے مالک کو خبر نہ ہو۔ پس واضح و مبرہن ہوگیا کہ اِن نشانیوں کے ظاہر کے سوا کچھ اور معنی بھی ہیں۔ یہ معنی

کتاب ایقان میں مفصل بیان کئے گئے ہیں وہاں دیکھئے۔

(۲۷)

تثلیث

سوال

تثلیث اور اقانیمِ ثلاثہ کیا ہیں؟

جواب

حقیقتِ اُلوہیت (خدا) جو کائنات کی سمجھ سے منزہ و مقدس اور اہلِ عقل و ادراک کے خیال سے بالا ہے تمام تصورات سے مبرّا ہے۔ یہ حقیقتِ ربانیہ تقسیم قبول نہیں کرتی۔ تقسیم و تعدد ممکن الوجود خلق کی خصائص ہیں۔ واجب الوجود پر عارض نہیں ہو سکتیں۔ حقیقتِ اُلوہیت توحید سے بھی پاک ہے تعدد کا ذکر ہی کیا۔ اس حقیقتِ ربوبیت (خدا) کے لئے مقامات و مراتب میں تنزل پانا عینِ نقص۔ کمال کے منافی اور سراسر ممتنع و محال ہے۔ ہمیشہ تقدیس و تنزیہہ کی بلندیوں پر رہا اور رہے گا۔ اگر ظہور و اشراقِ الٰہی کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود تجلّیِ الٰہی ہے۔ مراتبِ وجود میں تنزل نہیں۔ حق کمالِ خالص اور خلق سراسر پُر نقائص ہے۔ حق کے لئے مراتبِ وجود میں تنزل کرنا بہت بڑا نقص ہے۔ مگر اس کا ظہور و طلوع و اشراق لطیف و صاف و شفاف آئینوں میں آفتاب کی تجلی کی مانند ہوتا ہے۔

سب مخلوق حق کی کھلی نشانیاں ہیں۔ مثلاً کائناتِ زمین جس پر آفتاب کی شعاعیں چمکتی ہیں۔ دشت و کوہسار۔ اشجار و اثمار سب پر یہی نور چمکتا ہے جس کے ذریعے وہ پرورش پاتے ہیں اور اپنے وجود کے نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ لیکن انسانِ کامل (انبیاء) صاف و پاک آئینوں کی مانند ہیں اور آفتابِ حقیقت تمام صفات و کمالات کے ساتھ اُن میں ظاہر و آشکار ہوتا ہے۔ پس حقیقتِ مسیحیہ ایک صاف و شفاف آئینہ تھا جو نہایت لطیف و پاک تھا۔ لہٰذا شمسِ حقیقت ذاتِ اُلوہیت نے اُس آئینے میں تجلی فرمائی اور اُس کی نورانیت و حرارت اُس میں ظاہر ہوئی لیکن وہ شمسِ حقیقت تقدیس کی بلندی اور تنزیہہ کے آسمان سے آئینہ میں رہنے اور گھر بنانے کے لئے نہیں اُتر آیا تھا۔ بلکہ اپنے عُلو و سمو پر باقی و برقرار تھا اور ہے اور رہے گا آئینہ میں نہایت خوبی و خوبصورتی کے ساتھ جلوہ نما و آشکار ہوتا ہے۔ اب اگر کہیں کہ آفتاب کو دو آئینوں

میں دیکھا - ایک مسیح اور ایک رُوح القدس یعنی تین سورج دیکھے۔ ایک آسمان پر اور دو زمین پر تو ہم سچ کہتے ہیں۔ اور اگر کہیں کہ صرف ایک آفتاب ہے جو فردانیت محض ہے۔ لاشریک ہے۔ بے مثال ہے۔ پھر بھی ہم سچ کہتے ہیں۔ خُلاصۂ کلام یہ ہے کہ حقیقتِ مسیحیہ ایک صاف آئینہ تھی۔ اور شمسِ حقیقت یعنی ذاتِ احدیت بے انتہا کمالات وصفات کے ساتھ اس آئینہ میں ظاہر وآشکار تھا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ آفتاب یعنی ذاتِ ربانی تقسیم ہو کر جُز بن گئی تھی۔ نہیں آفتاب ایک ہی ہے مگر آئینوں میں ظاہر ہوتا ہی اسی لئے حضرت مسیح نے فرمایا ہے "باپ بیٹے میں ہے"۔ یعنی وہ آفتاب اِس آئینے میں ظاہر وآشکار ہے۔ رُوح القدس فیضِ الہٰی ہے جو حقیقتِ مسیح میں آشکار ہوتا ہے۔ بنوّۃ (بیٹا ہونا) مسیح کے قلب کا مقام ہے۔ اور رُوح القدس مسیح کی رُوح کا درجہ ہے۔ پس یہ پوری طرح پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا کہ ذات اُلوہیت وحدتِ محض ہے۔ اس کا کوئی شبیہ ومثیل ونظیر نہیں ہے۔ یہ ہے تثلیث کے تین اقانیم سے مُراد۔ ورنہ دین اللہ کی بُنیاد ایک غیر معقول مسئلہ پر پڑتی ہے جسے عقل سمجھ ہی نہیں سکتی۔ اِس پر اعتقاد دلانے کے لئے اُسے کس طرح مجبور کر سکتے ہیں۔ عقل ایک بات کو اُس وقت تک سمجھ نہیں سکتی جب تک یہ بات ایک معقول صورت میں پیش نہ کی جاتی۔ ورنہ یہ صرف وہم ہی وہم رہتا ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ اقانیم ثلاثہ سے کیا مُراد ہی۔ اور وحدانیتِ الٰہیہ بھی ثابت ہو گئی ؎

(کح)

انجیل یوحنا باب ۱۷ آیت ۵ کی تفسیر

"اب اے باپ! تو اپنے نزدیک مجھے وہ جلال دے جو آفرینش دُنیا سے پہلے میں تیرے نزدیک رکھتا تھا۔"

تقدّم دو قسم کا ہے - ایک تقدّم ذاتی ہے جو علّت سے مسبوق نہیں۔ اس کا وجود اسی کی ذات سے ہوتا ہے۔ مثلاً آفتاب کہ اُس کی روشنی اُسی کی ذات سے ہے۔ یعنی وہ روشنی کے لئے کسی دوسرے ستارہ کا محتاج نہیں۔ اسے روشنی ذاتی کہتے ہیں۔ لیکن چاند آفتاب سے روشنی پاتا ہے۔ پس روشنی کے لحاظ سے آفتاب علّت اور چاند معلول ہے۔ آفتاب سابق ومتقدم ہے اور چاند مسبوق ومتاخر۔ دوسری قسم کا تقدّم زمانی ہے۔ اور یہ لَا اوّلَ لہٗ (بے آغاز) ہے۔ کلمۃ اللہ زمانہ سے مقدّس و

مبرا ہے۔ حق کے لئے ماضی و حال و مستقبل سب ایک ہیں۔ آفتاب میں کل اور آج اور صبح و شام کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح تقدم بسبب شرف ہے۔ یعنی اشرف شریف پر مقدم ہے۔ پس کلمۃ اللہ یعنی حقیقتِ مسیحیہ ذات و صفات و شرف ہر لحاظ سے کائنات پر مقدم ہے۔ کلمۃ اللہ ہیکلِ بشر میں ظاہر ہونے سے پیشتر نہایت عزت و تقدیس اور کمالِ جلال و جمال کے ساتھ اپنی عظمت کی بلندیوں پر قائم تھا۔ جب خدائے پاک کی حکمت کے بموجب عالمِ جسد میں ظاہر ہوا تو اس جسم کے سبب اس پر تعدی ہوئی۔ چنانچہ یہودیوں کے ہاتھ چڑھا۔ اور ہر ظالم و جاہل کا قیدی بنا اور آخر کار مصلوب ہوا۔ اسی لئے خدا کو کہہ رہا ہے کہ مجھے عالمِ جسد کی قید سے آزاد کر۔ اور اس پنجرے سے چھڑا تاکہ اپنی عظمت و جلال کی بلندی پر چڑھ جاؤں۔ اور عالمِ جسد میں آنے سے پہلے کی عزت و تقدیس کو پاؤں اور اس جہانِ باقی میں خوشیاں مناؤں۔ اور اپنے عالمِ لامکان میں اپنے اصلی وطن و ملکوت نہاں کی طرف چڑھ جاؤں۔ اور ایسا ہی دیکھنے میں بھی آیا۔ حضرت مسیح کی عظمت اور ان کا جلال عالمِ مُلک یعنی جہانِ ارواح و آفاق میں حتیٰ کہ اس دُنیا میں بھی صعود کے بعد ظاہر ہوا۔ جب تک عالمِ جسد میں رہا، دُنیا کی سب سے کمزور قوم یعنی یہودیوں کی تحقیر و توہین کے تلے رہا۔ حتیٰ کہ انھوں نے آپکے سرِ مبارک کو کانٹوں کے تاج کے لائق سمجھا۔ لیکن صعود کے بعد سب بادشاہوں کے مرصع تاج اُس کانٹوں کے تاج کے سامنے خاضع و خاشع ہو گئے۔ دیکھئے کہ کلمۃ اللہ نے اس دُنیا میں کیا جلال پایا۔

(۲۷)

پولوس کے قرنتیون کے نام پہلے خط کی پندرھویں فصل کی بائیسویں آیت کی تفسیر

سوال

قرنتیون کے نام پولوس رسول کے خط کی پندرھویں فصل کی بائیسویں آیت میں لکھا ہے:-
"جس طرح آدم میں سب مرتے اسی طرح مسیح میں سب زندہ ہوئے۔" اس عبارت کے کیا کیا معنی ہیں؟

جواب

واضح ہو کہ انسان میں دو طبیعتیں ہیں۔ طبیعتِ جسمانی و طبیعتِ روحانی۔ طبیعتِ جسمانی ہیں

آدم سے ملی ہے۔ اور طبیعت رُوحانی حقیقت کلمۃ اللہ سے ورثہ میں آئی ہے۔ اور یہ رُوحانیت مسیح ہے طبیعتِ جسمانی آدم سے پیدا ہوتی ہے طبیعتِ رُوحانی فیض رُوح القدس سے حاصل ہوتی ہے۔ طبیعتِ جسمانی ہر نقص کی مصدر اور طبیعتِ رُوحانی ہر کمال کی منبع ہے۔ حضرت مسیح نے اپنے آپ کو فدا کیا۔ تاکہ لوگ طبیعتِ جسمانی کے نقائص سے آزاد ہوں اور طبیعت رُوحانی کے فضائل سے متصف بنیں۔ یہ طبیعتِ رُوحانی جو حقیقتِ رحمانیہ کے فیض سے ثابت ہوتی ہے تمام کمالات کی جامع اور دم رُوح القدس سے زندگی پاتی ہے۔ یہ طبیعت کمالاتِ الٰہی و انوارِ الٰہی ہے۔ رُوحانیت و ہدایت و بزرگی ہے۔ بلندیٔ ہمت و انصاف ہے۔ محبت و موہبت ہے۔ سب خلق سے مہربانی و خیرات ہے۔ حیات اندر حیات ہے۔ یہ طبیعتِ رُوحانی شمسِ حقیقت کی شعاعوں کی تجلّی ہے۔ مسیح رُوح القدس کا مرکز اور اس سے متولد ہوا ہے۔ یعنی حقیقتِ مسیحیہ آدم کی اولاد سے نہیں بلکہ رُوح القدس سے پیدا ہوئی ہے۔ پس پولوس کے کرنتھون کے نام رسالۂ اوّل کے باب ۱۵ کی آیت ۲۲ "جس طرح آدم میں سب مرتے ہیں مسیح میں زندہ کئے جائینگے" کا مطلب یہ ہے:۔ بحسب اصطلاح آدم انسانوں کا باپ ہے۔ یعنی آدم نوعِ انسانی کی جسمانی حیات کا سبب ہے۔ جسمانی باپ ہے۔ نفس زندہ ہے۔ مگر زندگی دینے والا نہیں۔

من حیث الروح حضرت مسیح رُوحانی باپ ہیں یعنی نوعِ انسانی کی حیاتِ رُوحانی کا سبب ہیں آدم نفس زندہ ہے۔ مسیح زندہ کرنے والی رُوح ہے۔ انسان کا عالمِ جسمانی قوائے شہوانی کے ماتحت ہے قوائے شہوانی کا ایک خاص نتیجہ گناہ ہے۔ کیونکہ قوائے شہوانی عدل۔ صداقت کے قانون کے تلے نہیں ہیں انسان کا جسم طبیعت کا بندہ ہے۔ جس طرح طبیعت اُسے حکم دیتی ہے ویسے ہی کرتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عالمِ جسمانی میں گناہ موجود ہے۔ مثلاً غصہ۔ حسد۔ جدال۔ حرص۔ طمع۔ جہالت۔ خود غرضی۔ فساد۔ تکبر۔ ظلم۔ یہ سب وحشیانہ صفات طبیعتِ انسانی میں موجود ہیں۔ جس انسان کو تربیتِ رُوحانی نہیں ملی وہ حیوان ہے۔ جیسے افریقہ کے باشندے۔ اُن کی حرکات و سکنات و اخلاق سراسر شہوانی ہیں۔ اور طبیعت کے کہنے پر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کو پھاڑتے اور کھاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کا جسمانی عالَم گناہ ہے۔ عالمِ جسمانی میں انسان و حیوان میں کچھ فرق نہیں۔ ہر گناہ طبیعت کے تقاضہ کا نتیجہ ہے طبیعت کا یہ اقتضا، جو جسم کا خاصہ ہے حیوان کے لئے گناہ نہیں، لیکن انسان کے لئے گناہ ہے۔ حیوان مصدرِ نقائص ہے۔ غضب۔ شہوت۔ حسد۔ حرص۔ تعدّی و تکبّر و تمام دیگر مذموم اخلاق حیوان کی طبیعت میں ہیں۔ حیوان کے لئے گناہ نہیں۔ مگر انسان کے لئے گناہ ہیں۔ حضرت آدم انسان کی حیاتِ جسمانی کا سبب ہیں۔ حضرتِ مسیح یعنی کلمۃ اللہ حیات رُوحانی کا سبب اور زندہ کرنے والی رُوح ہے یعنی تمام

نقائص جو انسان کی حیاتِ جسمانی کا تقاضا ہیں اِس رُوحِ مجرّد کی تعلیم و تربیت سے کمالاتِ انسانی میں بدل جاتے ہیں۔ پس حضرت مسیح زندگی دینے والی رُوح ہے۔ اور سب کی حیاتِ رُوحانی کا سبب۔ حضرت آدم حیاتِ جسمانی کا سبب تھے چونکہ انسان کا عالمِ جسمانی عالمِ نقائص ہے۔ اور نقائص عینِ موت ہیں۔ اِسی لئے پولوس نقائصِ جسمانی کو موت کہتا ہے۔

لیکن عام مسیحی کہتے ہیں کہ حضرت آدم نے شجرۂ ممنوعہ سے کھا کر گناہ کیا۔ اور اس گناہ کی نکبت و شامت مُسلسل اَولادِ آدم میں اِرث کے طَور پر جاری ہے۔ اِسی لئے حضرت آدم خلق کی مَوت کا سبب ہیں۔ یہ بیان صریحاً غلط ہے۔ کیونکہ اگر اِس بیان کے یہ معنی ہوں تو تمام خلق حتیٰ کہ تمام انبیاء و رُسل بھی بغیر قصور و گناہ صرف اِس لئے کہ اولادِ آدم ہیں تقصور وار و گنہگار ہوتے ہیں۔ اور مسیح کی قربانی کے دِن تک دوزخ میں عذابِ الیم میں گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ خُدائی انصاف سے بعید ہے۔ اگر آدم گنہگار تھا تو حضرت ابراہیم کا کیا گناہ۔ اسحٰق و یوسف کا کیا قصور۔ موسیٰ کی کیا خطا۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کلمہ تھے۔ اِس کے دو معنی ہیں۔ ظاہری اور حقیقی۔ ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ چونکہ حضرت مسیح کا یہ مقصد تھا کہ ایک اَمر پر قیام فرمائیں۔ تربیتِ عالمِ انسانی کریں۔ اولادِ آدم کو زندگی عطا کریں اور عام خلق کو نورانی بنائیں۔ ایسے امرِ عظیم پر قیام کرنا جس کے سبب اہلِ دُنیا مخالف اور تمام اقوام اور حکومتیں دشمن ہوں البتہ آپ کے مارے جانے اور مقتول و مصلوب ہونے کی نشانی تھی۔ لہٰذا حضرت مسیح نے جب اَمر کا اظہار فرمایا جان کو فدا کیا۔ صلیب کو نعمت سمجھا۔ زخم کو مرہم جانا۔ زہر کو شہد و شکر خیال کیا۔ لوگوں کی تعلیم و تربیت پر قیام فرمایا۔ یعنی اپنے آپ کو فدا کیا۔ تاکہ زندگی کی رُوح بخشیں اور اپنے جسم کو فنا کیا تاکہ دوسروں کو رُوح سے زندہ کریں۔

فِدا کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ حضرت مسیح بیج کی مانند تھے۔ اِس بیج نے اپنی صورت کو فدا کیا تاکہ درخت نشوونما پائے۔ اگرچہ بیج کی صورت گُم ہوگئی لیکن اُس کی حقیقت نہایت عظمت و لطافت کے ساتھ درخت میں ظاہر ہوئی۔ مقامِ مسیح کمالِ محض تھا۔ اور یہ کمالاتِ الٰہیہ آفتاب کی مانند سب مومنوں پر چمکے اور اَنوار کی ضیائیں حقائقِ نفوس میں روشن ہوئیں۔ اِسی لئے فرماتا ہے:۔ "میں آسمان سے اُتری ہوئی روٹی ہوں۔ جو کوئی اِس رُوٹی سے کھاتا ہے نہیں مرتا۔ یعنی جو اِس غذائے الٰہی سے حصّہ پاتا ہے ہمیشہ کی زندگی پاتا ہے۔ اِسی لئے جس کسی نے اِس فیض سے حصّہ پایا اور اُن کمالات کو حاصل کیا اُس نے ہمیشہ کی زندگی پائی اور فیضِ قدیم سے فائدہ اُٹھایا۔ گمراہی کی تاریکی سے رہائی پائی اور ہدایت کی روشنی سے روشن ہوا۔ بیج کی ہستی درخت کے لئے فدا ہوئی۔ مگر اِس فداکاری کے سبب بیج کے کمالاتِ ظاہر و

آشکار ہوئے۔کیونکہ درخت۔ شاخیں، پتے اور شگوفے سب بیج میں مستور و پنہاں تھے۔جب بیج فنا ہوا تو اس کے کمالات نہایت خوبی کے ساتھ پتوں، شگوفوں اور پھلوں کی صورت میں ظاہر ہوئے ؎

(ل)

حضرت آدم و حوّا و شجرۂ ممنوعہ

سوال

حضرت آدم اور شجرۂ ممنوعہ سے کھانے کی کیا حقیقت ہے؟

جواب

توراۃ میں مذکور ہے کہ خدا نے آدم کو جنّتِ عدن میں رکھا تاکہ عامل و محافظ رہے۔ اور فرمایا کہ "جنت کے سب درختوں سے کھا۔ مگر نیکی و بدی کے درخت سے نہ کھانا۔ اگر کھایا تو موت میں مبتلا ہوگا" ..... پھر فرماتا ہے کہ "خدا نے آدم کو نیند میں ڈالا۔ اور اس کی پسلیوں میں سے ایک ہڈی لے کر اس سے ایک عورت بنائی تاکہ وہ اس سے محبت سے مل کر رہے" ..... پھر فرماتا ہے کہ "سانپ نے اس عورت کو اس درخت کا پھل کھانے کے لئے اکسایا۔ اور کہا کہ خدا نے تمھیں اس درخت سے کھانے سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ تمھاری آنکھیں نہ کھل جائیں اور تم نیکی بدی کو نہ پہچان سکو۔ پس حوّا نے اس درخت سے کھایا۔ اور آدم کو بھی دیا۔ اور اس نے بھی کھایا۔ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ننگا پایا۔ اور درخت کے پتوں سے اپنے ستر کو ڈھانکا۔ پس عتاب الٰہی کے مورد ہوئے۔ خدا نے آدم سے پوچھا کیا شجر ممنوعہ سے تم نے کھایا۔ آدم نے جواب دیا کہ حوّا نے مجھے کھانے کو کہا۔ پس خدا نے حوّا پر عتاب ظاہر کیا۔ حوّا نے کہا کہ سانپ نے مجھے ورغلایا۔ اور سانپ ملعون ہوا۔ اور حوّا اور سانپ اور ان کی اولاد کے درمیان دشمنی قائم ہوئی۔ اور خدا نے فرمایا انسان ہمارے جیسا ہوگیا۔ نیکی و بدی سے آگاہ ہوا۔ شاید زندگی کے درخت سے کھائے اور جب تک زندہ رہے۔ اس لئے خدا نے زندگی کے درخت کی خود حفاظت کی"

اس حکایت کے اگر وہی معنی لیں جو عوام میں مانے جاتے ہیں تو یہ نہایت ہی عجیب و غریب ہیں۔ عقل ان کے ماننے اور قبول کرنے سے معذور ہے۔ بلکہ ایسا خیال بھی عقل سے بعید ہے۔کیونکہ ایسی ترتیب

وتفصیل، ایسے خطاب و عتاب ایک عقلمند شخص بھی نہ کرے گا۔ پھر خدا کا تو کیا ہی کہنا۔ وہ خدا جس نے اِس کونِ نامتناہی کو اکمل صورت میں ترتیب دیا۔ اور بے انتہا کائنات کو نہایت ہی انتظام اور مضبوطی و کمال سے آراستہ کیا۔ ذرا سوچیں۔ اگر اِس حکایت کے ظاہری معنوں کو کسی شخصِ عاقل کی طرف نسبت دیں تو عام عقلاء انکار کریں گے کہ ایسی ترتیب اور یہ وضع یقیناً کسی عاقل سے صادر نہ ہوگی۔ لہٰذا یہ آدم و حوّا کی حکایت اور درخت سے کھانے اور بہشت سے نکالے جانے کا قصّہ سب کا سب رُموز و خدائی اسرار ہیں۔ جو نہایت ہی عجیب و غریب معانی و تاویلات رکھتے ہیں۔ جن سے محرمینِ راز و مقرّبینِ حضرتِ بےنیاز کے سوا کوئی واقف نہیں۔

اِن آیاتِ تورات کے بہت سے معنی ہیں۔ ہم اُن معانی میں سے ایک کا ذکر کرتے ہیں۔ آدم سے مُراد رُوحِ آدم اور حوّا کا مطلب نفسِ آدم ہے۔ کیونکہ کُتبِ الٰہیہ کی بعض مقامات میں جہاں عورتوں کا ذکر ہوا ہے اُس سے نفسِ انسانی ہی مُراد لیا گیا ہے۔ نیکی و بدی کے درخت کے معنی یہ جہانِ ناسوتی ہے۔ کیونکہ جہانِ رُوحانی خدائی خالص نیکی اور سراسر نورانی ہے۔ لیکن عالمِ ناسوت میں نیکی و بدی۔ نور و تاریکی متضاد چیزیں موجود ہیں۔ سانپ سے مُراد عالمِ ناسوتی سے تعلّق ہے۔ رُوح کا عالمِ ناسوتی سے "یہ تعلّق" رُوح و نفسِ آدم کو عالمِ آزادی سے نکلوانے اور دُنیائے غلامی و اسیری میں لانے کا سبب ہوا۔ ملکوتِ توحید سے دُنیائے ناسوت کی طرف متوجہ ہونے کا باعث بنا۔ رُوح و نفسِ آدم نے جب عالمِ ناسوت میں قدم رکھا تو جنّتِ آزادی سے خارج اور عالمِ اسیری میں گرفتار ہوا۔ اَوجِ تقدیس سے جہاں نیکی ہی نیکی تھی گرا اور نیکی بدی کی دُنیا میں قدم رکھا۔

زندگی کے درخت سے مُراد عالمِ وجود میں کلمۃ اللہ اور ظہورِ کُلّی کا مقام ہے۔ لہٰذا وہ مقام محفوظ رکھا گیا۔ اور مظہرِ کُلّی کے ظہورِ اشرف کے وقت ظاہر و روشن ہوا۔ کیونکہ آدم کا مقام از روئے ظہور و بروزِ کمالاتِ الٰہیہ بچپن کا مقام تھا۔ اور حضرت مسیح کا مقام جوانی و رُشد کا رُتبہ تھا۔ اور نیّرِ اعظم (حضرتِ بہاءاللہ جلّ ذکرہ) کا مقام طلوعِ کمالاتِ ذاتی و صفاتی کا درجہ تھا۔ اِسی لئے جنّتِ اعلیٰ میں زندگی کے درخت سے مُراد تقدیسِ خالص اور تنزیہہ صرف کا مرکز ہے یعنی مظہرِ ظہورِ کُلّی ہے۔ حضرت آدم کے وقت سے حضرت مسیح کے زمانے تک ہمیشہ کی زندگی اور کمالاتِ ملکوتیہ کا اتنا ذکر نہ ہوا کرتا تھا۔ یہ زندگی کا درخت حقیقتِ مسیح کا مقام تھا جو ظہورِ مسیح میں لگایا گیا اور ابدی پھلوں سے آراستہ ہوا۔

اب دیکھئے یہ معنی کس قدر حقیقت کے مطابق ہیں۔ رُوح و نفسِ آدم نے جب عالمِ ناسوتی سے تعلّق پیدا کیا تو عالمِ آزادی سے نکل کر دُنیائے تقیّد میں گرا۔ اور یہ غُلامی اس کی اولاد میں جاری رہی۔ رُوح و نفس کا

عالمِ ناسوت سے تعلق گناہ ہے۔ اور یہ گناہ اولادِ آدم میں موروثی ہوگیا۔ یہ تعلق سانپ ہے جو ہمیشہ اولادِ آدم کی ارواح میں موجود ہے۔ اور اِن دونوں میں دشمنی بھی ہمیشہ کے لئے قائم و برقرار ہے۔ کیونکہ دُنیائے ناسوت سے تعلق ارواح کی غلامی کا سبب ہوا۔ یہ غلامی سراسر گناہ ہے۔ جو اولادِ آدم میں پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ اِس گناہ کے سبب ارواح اصلی رُوحانیت اور عالی مقامات تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر جب حضرت مسیح کے فیوضات اور نیّرِ اعظم (حضرت بہاء اللہ جلّ اسمہٗ) کے انوارِ تقدیس مُنتشر ہوئے تو وہ نفوس جنھوں نے امر اللہ کی طرف توجہ کی اور فیوضات سے فائدہ اُٹھایا اِس تعلق و گناہ سے نجات پاگئے۔ ہمیشہ کی زندگی سے فائز ہوئے۔ غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ کر آزادی کی دُنیا میں داخل ہوئے۔ عالمِ ناسوت کے رذائل سے بری ہوکر عالمِ ملکوت کے فضائل سے مستفیض ہوئے۔ یہی اِس بیان کے معنی ہیں کہ فرماتا ہے میں نے اپنے خون کو دُنیا کی زندگانی کے لئے نثار کیا یعنی بلائیں اور مصیبتیں جھیلیں۔ حتیٰ کہ شہادتِ کُبریٰ کو اختیار کیا۔ تاکہ یہ مقصد حاصل ہو۔ یعنی یہ گناہ - یہ عالمِ ناسوت سے ارواح کا تعلق ٹوٹ جائے۔ اور عالمِ لاہوت کی طرف منجذب ہوں۔ تاکہ ایسے نفوس پیدا ہوں جو ہدایت کی رُوحِ رواں اور کمالاتِ عالیہ کی جان ہوں۔ مُلاحظہ فرمائیں کہ اگر اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) کے خیال کے مطابق اِس عبارت کے ظاہری معنی لئے جائیں تو سراسر ظلم و جبر ہے۔ اگر آدم نے شجرۂ ممنوعہ کے قریب جانے سے گناہ کیا تھا تو خلیل جلیل کا کیا قصور۔ موسیٰ کلیم کی کیا خطا۔ نوح نبی کا کیا گناہ۔ یوسفِ صدیق کا کیا جرم۔ انبیای الٰہی کا کیا فتور۔ یوحنای مقدس کا کیا قصور۔ کیا خدائی انصاف اسے قبول کرے گا کہ یہ مظاہرِ نورانیہ آدم کے گناہ کے باعث عذابِ جہنم میں گرفتار رہوں! حتیٰ کہ مسیح آکر قربان ہو اور انھیں اِس سخت عذاب سے نجات دے۔ ایسا خیال ہر قاعدہ وقانون کے خلاف ہے۔ کوئی عقلمند شخص اسے قبول نہ کرے گا۔ اصل مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔ آدم سے مُراد انسان کی رُوح اور حوّا سے مُراد اُس کا نفس ہے۔ درخت سے مُراد عالمِ ناسوت اور سانپ سے مُراد عالمِ ناسوت سے تعلق ہے۔ یہ تعلق جو گناہ ہے اولادِ آدم کے اندر پھیل گیا۔ حضرت مسیح نے اپنے نفحاتِ قدس کے ذریعے اِس طوق سے نجات دی۔ اور اِس گناہ سے بچایا۔ آدم کا یہ گناہ آپ کے مرتبہ کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ اِس تعلق سے بڑے بڑے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ تو بھی عالمِ رُوحانی ولاہوتی سے تعلق کے بالمقابل عالمِ ناسوتی سے تعلق گناہ گنا جاتا ہے (حسنات الابرار سیئات المقرّبین) نیکوں کی خوبیاں مقرّبین کے گناہ ہیں۔ یہ ثابت ہوگیا۔ قوائے جسمانی کی مانند جو قوائے رُوحانی کے بالمقابل بالکل قاصر ہیں بلکہ یہ قوت اِس قوت کے آگے سراسر ضعف شمار کی جاتی ہے اِسی طرح جسمانی زندگی بھی وجودِ ملکوتی وحیاتِ ابدی کے مقابلہ میں موت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح حیاتِ جسمانی کو موت ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا ہے: "چھوڑ دے

مُردوں کو کہ مُردہ کو دفن کریں" حالانکہ وہ لوگ حیاتِ جسمانی رکھتے تھے ولیکن حضرت مسیح کی نظر میں وہ زندگی موت تھی۔ تو آتی حکایتِ آدم کے یہ معنی ہیں۔ اور آپ سوچیں تاکہ اور معنی آپ پر ظاہر ہوں۔ والسلام۔

(۳۱)

رُوح القدس کے خلاف کُفر کے جواب میں

سوال

"اِس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ سب قسم کا گناہ اور کُفر بخش دیا جائے گا۔ مگر رُوح القدس کے خلاف کفر نہ بخشا جائیگا۔ جو کوئی ابن انسان کے خلاف کوئی بات کہیگا وہ تو اُسے معاف کیجائیگی۔ مگر جو کوئی رُوح القدس کے خلاف کوئی بات کہیگا وہ اُسے معاف نہ کی جائیگی نہ اِس دُنیا میں نہ آنے والی دُنیا میں" (متی باب ۱۲۔ آیت ۳۱-۳۲)

جواب

حقائقِ مقدسہ مظاہر الٰہیہ کے لئے دو مقامِ معنوی ہیں۔ ایک مظہریت ہے جو کُرۂ شمس کی مانند ہے اور دوسرا جلوہ وہ ظہور ہے جو نور و کمالاتِ الٰہیہ کے مشابہ ہے۔ یہ ہی رُوح القدس ہے۔ کیونکہ رُوح القدس فیوضاتِ الٰہیہ و کمالاتِ ربانیہ کو ہی کہتے ہیں۔ اور یہ کمالاتِ الٰہیہ بمنزلۂ شعاع و حرارتِ آفتاب ہیں۔ سورج روشن شعاعوں کے سبب ہی سورج کہلاتا ہے۔ اگر روشن شعاعیں نہ ہوں تو سورج ہی نہ ہو۔ اگر مسیح میں کمالاتِ الٰہیہ کا ظہور و جلوہ نہ ہوتا تو یسوع مسیح ہی نہ ہوتا۔ آپ کو مظہر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کمالاتِ الٰہیہ آپ میں تجلی فرماتے تھے۔ انبیائے الٰہی اِسی لئے مظاہر ہیں کہ کمالاتِ ربانیہ یعنی رُوح القدس اُن سے ظاہر ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص مظہر سے دور رہے تو اُس کا متنبّہ ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ اُس نے جانا اور پہچانا نہیں کہ مظہر ظہور کمالاتِ الٰہیہ ہے۔ لیکن اگر کوئی کمالاتِ الٰہیہ یعنی رُوح القدس سے ہی بیزار ہو تو یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ چمگادڑ ہے اور آفتاب سے بیزار ہے۔ انوار سے اِس بیزاری کا کوئی عِلاج نہیں۔ اور اِس کے لئے معافی بھی نہیں یعنی ممکن نہیں کہ ایسا شخص خُدا کا قُرب حاصل کر سکے۔ یہ چراغ اِس روشنی کے سبب چراغ ہے۔ اگر روشنی نہ ہو تو اُسے چراغ نہ کہینگے۔ اب اگر کوئی شخص چراغ کی روشنی سے بیزار ہو تو وہ اندھا ہے اور روشنی کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ایسے شخص کا اندھاپن اُس کی دائمی محرومی کا سبب ہے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ نفوس شخصیتِ مظہر سے بلکہ اُس رُوح القدس سے فیض حاصل کرتے ہیں جو مظاہر الٰہیہ میں جلوہ نما ہوتی ہے۔

پس جو شخص روح القدس کے فیوضات سے فائدہ نہیں اُٹھاتا وہ محروم رہتا ہے۔ اور یہ نفس محرومیت علامِ مغفرت ہے۔ اسی لئے بہت سے نفوس مظاہر ظہور سے دشمنی رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ نہ جانتے تھے کہ وہ مظہرِ ظہور ہے۔ مگر جب انہیں معلوم ہوا تو وہ دوست بن گئے۔ پس مظہرِ ظہور سے عداوت، ابدی محرومیت کا سبب نہیں ہوتی۔ کیونکہ شمعدان کے دشمن تھے۔ نہ جانتے تھے کہ یہ مظہرِ سراجِ نورانیِ الٰہی ہے۔ نور کے دشمن نہ تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ شمعدان مظہرِ انوار ہے تو پیچھے دوست بن گئے۔ مقصود یہ ہے کہ شمعدان سے دوری محرومیتِ ابدی کا سبب نہیں۔ کیونکہ منتبہ و متذکر ہونے کا امکان ہے۔ مگر نور سے دشمنی محرومیتِ ابدی کا سبب اور لا علاج ہے ؛

(لب)

بلائے تو بہت گئے مگر ماننے والے بہت کم ہیں

سوال

حضرت مسیح انجیل میں فرماتے ہیں "بلائے تو بہت گئے مگر برگزیدہ بہت تھوڑے ہوئے۔" (انجیل متی باب ۲۲ ۔ آیت ۱۴) اور قرآن میں فرماتا ہے "یختص برحمتہ من یشاءُ" "وہ جس پر چاہتا ہے اپنا رحم کرتا ہے۔" اس میں کیا حکمت ہے ؟

جواب

معلوم ہو کہ جامعیت عالمِ وجود کا نظم و کمال اس بات کا مقتضی ہے کہ وجود صور ہائے نامتناہی میں ظاہر ہو۔ کیونکہ موجودات ایک رتبہ اور ایک مقام اور ایک طریقہ اور ایک جنس اور ایک قسم کی نہیں ہوسکتیں۔ مراتب کا تفاوت، صورتوں کا فرق۔ اور اجناس و انواع کی تقسیم ضروری ہے یعنی رتبۂ جمادی و رتبۂ نبات و رتبۂ حیوان و رتبہ انسان ہونا لابد و ضروری ہے۔ کیونکہ عالمِ وجود صرف انسان ہی سے ترتیب و تنظیم و تکمیل نہیں پاسکتا۔ اسی طرح صرف حیوان یا تنہا نبات یا محض حیوان سے یہ دُنیا خوش منظر، کامل ترتیب، پاکیزہ زینت حاصل نہیں کرسکتی۔ اس دُنیا کی زینت اور خوبصورتی کے لئے مراتب و مقامات و اجناس و انواع کا فرق ضروری ہے۔ مثلاً یہ درخت سب کا سب ثمر ہی ہوتا تو یہ کمالِ نباتی نہ ہوتا۔ نبات کی خوبصورتی اور اس کے کمال کے ظہور کے لئے پتوں، شگوفوں اور پھلوں سب کا ہونا لازمی ہے۔

اِسی طرح جسمِ انسان کو لیں۔ اس کے اعضاء، واجزاء، وارکان کے تفاوت ضروری ہیں۔ وجودِ انسان کے جمال وکمال کے لئے کان، آنکھ، دماغ؛ حتیٰ کہ ناخن اور بال کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر سراپا مغز یا آنکھ یا کان ہو تو یہ عینِ نقص ہے۔ اِسی طرح زُلف ومژگاں، ناخن و دنداں کا نہ ہونا عینِ نقص ہے۔ اگرچہ آنکھ کے بالمقابل یہ بے احساس اور جماد ونبات کی طرح ہیں لیکن وجودِ انسان میں اُن کا نہ ہونا بہت ہی بُرا اور بدنما ہے۔ چونکہ مراتبِ وجود مختلف ومتفاوت ہیں اِس لئے بعض کو بعض پر فوقیت ہے۔ یہ پروردگار کے اِرادہ ومشیّت سے ہے۔ کہ مخلوقات میں سے بعض رتبۂ اعلیٰ کے لئے انتخاب کئے گئے جیسا کہ انسان۔ اور بعض رُتبۂ اوسط میں رکھے گئے جیسا کہ حیوان۔ اور بعض رتبۂ ادنےٰ میں رہے جیسا کہ جماد۔ پس رتبۂ اعلیٰ کے لئے انسان کا چُنا جانا پروردگار کے فضل سے ہے۔

اِسی طرح وجود نوعِ انسان کے اندر رُوحانی ترقّیات وملکوتی کمالات کی حیثیت سے تفاوت ہونا بھی حضرتِ رحمٰن کے انتخاب کے سبب ہے۔ کیونکہ ایمان جو حیاتِ ابدی ہے نشانِ فضل ہے نتیجۂ عدل نہیں۔ اِس جہانِ خاک وآب میں شعلۂ نارِ محبّت سعی وکوشش سے نہیں بلکہ قوّتِ انجذاب سے پیدا ہوتا ہے۔ سعی واجتہاد سے سائنس اور دوسرے کمالات حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر انوارِ جمالِ الٰہی رُوح کو قوّتِ انجذاب ہی سے وجد وحرکت میں لاسکتے ہیں۔ اِسی لئے کہا ہے:۔

"بُلائے تو بہت گئے ہیں مگر برگزیدہ بہت تھوڑے ہوئے۔"

لیکن کائناتِ جسمانیہ اپنے مراتب ومقامات میں مذموم ومحکوم ومسئول نہیں ہیں۔ مثلاً جماد رُتبۂ جمادی میں حیوان رُتبۂ حیوانی میں۔ اور نبات رتبۂ نباتی میں مقبول ہیں۔ ہاں اگر وہ اپنے رتبہ میں ناقص رہیں تو مذموم ہیں۔ خود رُتبہ عینِ کمال ہے۔ نوعِ انسان میں دو قسم کا تفاوت ہے۔ ایک تفاوت بحیثیتِ مراتب ہے۔ یہ تفاوت بُرا نہیں۔ دوسرا بحیثیتِ ایمان وایقان ہے۔ اور اُس کا نہ ہونا مذموم ہے۔ کیونکہ نفس اپنی ہوا وہوس میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اسے اِن برکات سے محروم اور محبّت اللہ کی قوّۂ جاذبہ سے دور رکھتی ہیں۔ اگرچہ انسان اپنے رتبہ میں ممدوح ومقبول ہے۔ مگر چونکہ اُس رُتبہ کے کمالات سے محروم ہے اس لئے معدنِ نقائص ہے۔ اور جواب دہ ٭

(لج) مسئلۂ رجعت جس کا پیغمبروں نے ذکر کیا ہے

سوال:۔ مسئلہ رجعت کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں۔

جواب:۔ حضرت جمالِ مُبارک نے کتابِ ایقان میں اِس مطلب کو نہایت مفصّل ومشرح طور سے

بیان فرمایا ہے۔ اُسے پڑھئے۔ اِس مسئلہ کی حقیقت واضح و آشکار ہو جائے گی۔ چونکہ اِس وقت آپ نے سوال کیا ہے۔ اِس لئے کچھ مختصر سا بیان ہم بھی کرتے ہیں۔ ہم انجیل سے اس مسئلہ کا عنوان لیتے ہیں۔ انجیل میں صراحت سے لکھا ہے کہ جب یوحنا ابنِ زکریا ظاہر ہوا اور ملکوتِ خدا کی خوش خبری دینے لگا تو لوگوں نے پوچھا تو کون ہے؟ تو مسیحِ موعود ہے؟ اُس نے جواب دیا میں مسیح نہیں ہوں۔ پھر اُنھوں نے پوچھا کہ کیا تو ایلیا ہے؟ اُس نے کہا نہیں۔"

اِس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوحنا بن زکریا ایلیا، معہود نہ تھے۔ لیکن کوہ طابود پر صورت تبدیل ہونے کے دن حضرت مسیح صاف صاف فرماتے ہیں کہ یوحنا بن زکریا ایلیائے موعود تھا انجیل مرقس کے باب ۹ کی آیہ ۱۱ میں لکھا ہے:۔

"پھر اُنھوں نے اُس سے پوچھا کہ فقیہی کیونکر کہتے ہیں کہ ایلیا کا پہلے آنا ضرور ہے؟ اُس نے اُن سے کہا ایلیا البتہ پہلے آکر سب کچھ بحال کرے گا۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ابن آدم کے حق میں لکھا ہے کہ وہ بہت سے دُکھ اُٹھائے گا اور حقیر کیا جائے گا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ایلیا تو آچکا اور جیسا اُس کے حق میں لکھا ہوا ہے اُنھوں نے جو کچھ چاہا اُس کے ساتھ کیا۔"

انجیل متی باب ۱۷ کی آیت ۱۳ میں ہے:۔

"تب شاگرد سمجھ گئے کہ اُس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہا ہے۔"

یوحنا بپتسمہ دینے والے سے پوچھا کیا تو ایلیا ہے؟ اُس نے کہا نہیں۔ حالانکہ انجیل میں فرماتا ہے کہ یوحنا بپتسمہ دینے والا ایلیائے موعود تھا۔ اور مسیح نے بھی اُس کی تصریح فرمائی ہے۔ پس اگر حضرت یوحنا ایلیا تھے تو آپ نے کیوں فرمایا کہ میں ایلیا نہیں؟ اور اگر ایلیا نہ تھے تو حضرت مسیح نے کیوں فرمایا کہ وہ ایلیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ اِس مقام میں شخصیت مراد نہیں بلکہ حقیقتِ کمالات مدِنظر ہے یعنی وہ کمالات جو حضرت ایلیا میں تھے وہی بعینہٖ یوحنا بپتسمہ دینے والے میں تھے۔ پس یوحنا بپتسمہ دینے والا ایلیائے موعود تھا۔ یہاں ذات نہیں بلکہ صفات مدنظر ہیں۔ مثلاً پارسال ایک پھول تھا۔ اِس سال بھی پھول نکلا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پارسال کا پھول پھر آیا ہے۔ اِس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ وہ پھول اپنی شخصیت کے ساتھ بعینہٖ آیا ہے۔ مگر چونکہ یہ پھول صفات میں پارسال کے پھول جیسا ہے۔ یعنی وہی خوشبو و لطافت و رنگ و شکل رکھتا ہے۔ اِس لئے کہا جاتا ہے کہ پارسال کا پھول آیا ہے اور یہ پھول

وہی پھول ہے۔ بہار آتی ہے ہم کہتے ہیں کہ وہی پارسال کی بہار پھر آئی ہے۔ کیونکہ جو کچھ پارسال کی بہار میں تھا وہی اِس میں بھی موجود ہے۔ اِسی لئے حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ جو کچھ پہلے نبیوں کے زمانوں میں واقع ہوا وہ سب دیکھو گے۔"

ایک اور مثال ہے۔ گذشتہ سال کا بیج اَب بویا گیا۔ شاخ پتّے نکلے۔ شگوفے اور پھل پیدا ہوئے۔ اور سب پھر بیج بن گئے۔ یہ دوسرا بیج جب بویا جائے گا وہی درخت پیدا ہوگا۔ پھر وہی پتّے وشگوفے۔ شاخیں اور پھل نکلینگے۔ اور وہ درخت رجعت کرے گا۔ چونکہ اوّل بھی بیج تھا۔ اور آخر میں بھی بیج۔ اِس لئے ہم کہتے ہیں کہ بیج پھر آیا ہے۔ اگر درخت کے مادّہ کا خیال کرتے ہیں تو اُس مادّہ میں بہت فرق ہے۔ مگر جب شگوفوں اور پتوں اور پھولوں کو دیکھتے ہیں تو وہی مزہ۔ وہی خوشبو اور وہی لطافت پاتے ہیں۔ پس درخت کا وہ پہلا کمال پھر لوٹ کر آیا ہے۔ اِسی طرح جب ہم شخص کو دیکھتے ہیں تو دوسرا پاتے ہیں۔ مگر جب صفات وکمالات کو دیکھتے ہیں تو وہی پہلے والی صفات وکمالات پاتے ہیں۔ پس حضرت مسیح نے فرمایا یہ ایلیا ہے۔ یعنی یہ شخص کمالات وصفات واخلاق وفیوضاتِ ایلیا کا مظہر ہے یوحنّا بپتسمہ دینے والے نے کہا میں ایلیا نہیں ہوں۔ حضرت مسیح دونوں کی صفات وکمالات اور اخلاق فیوضات کو مدّنظر رکھ کر کہتے ہیں اور یوحنّا صرف اپنی شخصیت ومادّہ کو سامنے رکھکر کہتے ہیں۔ مثلاً یہ موجودہ چراغ کل رات بھی تھا اور آج رات بھی روشن ہے اور کل شب کو بھی روشن ہوگا۔ ہم کہتے ہیں کہ آج کا چراغ وہی کل شب کا چراغ ہے اور وہی چراغ پھر آیا ہے۔ اِس سے ہمارا مقصد نور ہے۔ روغن وبتی وشمعدان نہیں۔ رسالۂ ایقان میں یہ مضمون نہایت تفصیل سے بیان فرمایا ہے ؎

(۳۱)

تفسیر آیۂ "انتَ الصّخرۃُ وعلیکَ ابنی کلیستی"

سوال

انجیل متی کے باب ۱۶ کی آیات ۱۶ و ۱۸ میں پطرس کو فرماتا ہے "تو چٹان ہے اور اِس چٹان پر میں اپنی کلیسا بناؤں گا۔"

جواب

یہ بیان حضرت مسیح نے پطرس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا تھا جب اُس نے کہا کہ

میرا اعتقاد یہ ہے کہ تو زندہ خُدا کا بیٹا ہے۔ حضرت نے جواب میں فرمایا تو کیفا ہے۔ اور چونکہ زبانِ عبری میں کیفا کے معنے پتھر ہیں۔ اِس لئے اِس پتھر پر میں اپنی کلیسیا بناؤں گا۔"

دوسرے شاگردوں میں سے بعض نے حضرت مسیح کے جواب میں کہا تھا وہ الیاہ ہے۔ بعض نے کہا تھا یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے۔ بعض نے یرمیاہ یا نبیوں میں سے ایک نبی کہا تھا۔ آنحضرت چاہتے تھے کہ اشارہ وکنایہ سے پطرس کے بیان کی تصدیق فرمائیں۔ اسی لئے اس کے نام کی مناسبت کے سبب فرمایا " تو وہ چٹان ہے جس پر میں اپنی کلیسیا بناؤں گا"۔ یعنی یہ تیرا عقیدہ کہ مسیح زندہ خُدا کا بیٹا ہی دین اللہ کی بُنیاد ہوگا۔ اور اس عقیدہ پر کلیسای خدا یعنی شریعت اللہ کی بُنیاد رکھی جائے گی۔ روم میں پطرس کی قبر کا ہونا بھی مشکوک ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انطاکیہ میں ہے۔ علاوہ ازیں بعض پوپوں کے اعمال کو حضرت مسیح کی شریعت سے ملائیں۔ مُلاحظہ فرمائیں حضرت مسیح بھوکے اور بے پناہ جنگل میں جڑی بوٹی کھا کر گذارہ کیا کرتے تھے۔ اور اس بات پر راضی نہ ہوتے تھے کہ کسی کا دِل دُکھائیں۔ پوپ ایک مرصع گاڑی میں بیٹھتا ہے اور نہایت عظمت کے ساتھ ایسے لذائذ وعیش وعشرت میں اپنا وقت گذارتا ہی کہ بادشاہوں کو بھی ایسی نعمت وخود پرستی میسّر نہیں۔ مسیح نے کبھی کسی کا دِل نہ دُکھایا تھا۔ مگر پوپوں نے کثیر التعداد بندگانِ خُدا کو بے گناہ مروا دیا۔ تاریخ کو دیکھئے کہ صرف حکومتِ دُنیوی کے لئے پوپوں نے کس قدر خون بہایا۔ محض مخالفتِ رائے کے سبب ہزاروں ہی خادمانِ عالمِ انسانی واہلِ علم کا جو کشفِ اسرارِ کائنات کرتے تھے۔ گرفتار کیا۔ قید میں ڈالا اور مِٹا دیا۔ پوپ سچائی کے کس قدر مخالف تھے! حضرت مسیح کی نصیحتوں کو دیکھیں اور پوپوں کے احوال واطوار پر غور کریں۔ کیا وصایای مسیح اور اطوارِ حکومتِ پوپ کے درمیان ایک ذرّہ بھر بھی مشابہت دکھائی دیتی ہے؟ ہم نہیں چاہتے کہ لوگوں کی مذمت کریں۔ مگر تاریخ واٹیکان کے صفحات نہایت عجیب ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وصایای حضرت مسیح کچھ اور تھیں اور حکومتِ پوپ کے اطوار کچھ اور ہیں۔ دونوں میں بالکل مطابقت نہیں ہے۔ دیکھئے کتنے پروٹسٹنٹ پوپ کے فتوے سے قتل ہوئے۔ کیسے کیسے ظلم وستم روا رکھے گئے۔ کیسی کیسی سزائیں اور عقوبتیں دی گئیں۔ کیا اِن اعمال سے مسیح کے نفحاتِ پاک کی ذرا بھر بھی خوشبو آتی ہے؟ لا واللہ! انھوں نے مسیح کی اطاعت نہیں کی۔ مگر اس مقدس سینٹ بربارہ نے جس کی تصویر ہمارے سامنے ہے، مسیح کی اطاعت کی۔ آپ کے قدموں پر چلا۔ اور آپ کی وصایا کو جاری کیا۔ پوپوں میں بھی مُبارک نفوس گذرے ہیں جو حضرت مسیح کے پیچھے پیرو تھے۔ خصوصاً پہلی صدیوں میں جب اسبابِ دُنیوی مفقود اور امتحاناتِ الٰہیہ کی شدّت تھی۔ مگر جب اسبابِ حکومت فراہم ہوگئے اور دُنیوی عزت و دولتمندی حاصل ہوئی حکومتِ پوپ نے مسیح کو بالکل بھُلا دیا۔ اور دُنیوی

سلطنت وعظمت و راحت وآرام کے پیچھے لگ گئے ۔ خُدا کے بندوں کو قتل کیا۔ نشر معارف کی مخالفت کی۔ اہلِ علم کو اذیت دی۔ نورِ علم کے پھیلنے میں حائل ہوئے اور قتل وغارت کے حکم دیئے۔ ہزاروں ہی اہلِ علم ومعارف اور بے گناہ لوگ روما کے قید خانے میں ہلاک ہوئے۔ ایسے چال چلن اور ایس روش کے ہوتے ہوئے خلافتِ حضرتِ مسیح کیسے اُن پر صادق آسکتی ہے۔ حکومتِ پوپ نے ہمیشہ علم کی مخالفت کی حتیٰ کہ یورپ میں یہ بات رواج پاگئی کہ دین علم کے مخالف اور علم دین کی بنیاد ڈھانے والا ہے۔ حالانکہ دین اللہ حقیقت کا مروج۔ علم ومعرفت کا موسس۔ اہلِ علم کا خیر خواہ۔ نوع انسان کا مُمدن۔ اسرارِ کائنات کا کاشف اور آفاق کا منور کرنے والا ہے۔ پھر کس طرح علم کا مخالف ہو سکتا ہے؟ استغفراللہ! بلکہ خدا کے نزدیک علم انسانوں کے لئے سب سے بڑی برکت اور کمالاتِ بشر میں سب سے بڑا کمال ہے۔

علم کا مخالف جہل ہے اور جو عُلوم وفنون سے نفرت کرتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ بے شعور حیوان ہے۔ کیونکہ علم نور ہے۔ زندگی ہے۔ سعادت ہے۔ کمال ہے۔ جمال ہے۔ خدا کی درگاہ کی قربت کا سبب ہے۔ عالم انسانی کی عزت و بزرگی ہے۔ خُدا کی سب سے بڑی عنایت ہے۔ علم عین ہدایت ہے اور جہل اصلی گمراہی۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جو اپنی عمر کو تحصیل عُلوم وکشفِ اسرار کائنات وتدقیقِ حقیقت میں صرف کرتے ہیں۔ اور افسوس ہے اُن لوگوں پر جو جہل ونادانی پر قناعت کرتے ہیں اور چند تقالید سے دل خوش کر رکھتے ہیں۔ اور جہل ونادانی کے پست ترین درجات میں گر کر اپنی عمر کو برباد کرتے ہیں۔

(۲۸)

قضا وقدر

سوال

اگر خدا اُس عمل کا علم رکھتا ہے جو کوئی شخص کسی وقت کرے گا جو تقدیر کی لوح محفوظ میں ثبت ہو چکا ہے تو کیا اُس کی مخالفت ممکن ہے؟

جواب

کسی چیز کا علم اس چیز کے حصول کی دلیل نہیں۔ خُدا کا علمِ ذاتی، وجودِ اشیاء کے پہلے اور بعد حقائقِ اشیاء پر یکساں محیط ہے۔ یہ اُن کے وجود کا سبب نہیں ہوتا۔ یہ کمالِ الٰہی ہے۔ جو کچھ وحی الٰہی کے ذریعے انبیاء کی زبان سے موعودِ تورات کے بارہ میں خبریں دی گئی تھیں وہ حضرت مسیح کے

ظہور کا سبب نہ ہوئی تھیں۔ انبیاء پر آئندہ کے اسرارِ مکنونہ وحی کئے گئے اور آنے والے وقائع کی ایسی خبر دی گئی۔ یہ اطلاع و اخبار، وقائع کے واقع ہونے کا سبب نہیں ہوا۔ مثلاً آج رات سب لوگ جانتے ہیں کہ سات گھنٹے کے بعد آفتاب نکلے گا۔ لوگوں کا یہ علم آفتاب کے نکلنے کا سبب نہیں ہے۔ پس علم الٰہی حیز امکان میں اشیاء کی صورتوں کو پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ ماضی، حال و مستقبل سے مقدس یہ عین تحقق اشیاء ہے۔ سبب تحقق اشیاء نہیں۔ پس کتاب میں کسی چیز کا ذکر اس کے وجود کا سبب نہیں ہو سکتا۔ انبیاء وحی الٰہی سے مطلع ہوئے کہ ایسا ہوگا۔ مثلاً وحی الٰہی کے ذریعے اس بات سے واقف ہوئے کہ مسیح شہید ہوگا۔ اور اس بات کی انھوں نے خبر دی۔ اب کیا انبیاء کا یہ علم اور اُن کی یہ اطلاع حضرت مسیح کی شہادت کا سبب ہوئی؟ انبیاء کا یہ علم اُن کے کمالِ علم کو ظاہر کرتا ہے۔ شہادت کے واقع ہونے کا سبب نہیں۔ اہل ریاضی حسابِ فلکی سے واقف ہو کر کہتے ہیں کہ اتنی دیر بعد گرہن لگیگا۔ یہ معلوم ہونا یقیناً گرہن لگنے کا سبب نہیں ہوتا۔ البتہ یہ تمثیل ہے۔ تصویر نہیں۔

در بیانِ

علاماتِ وکمالاتِ مظاہرِ الٰہیّہ

(ﻟﻮ)
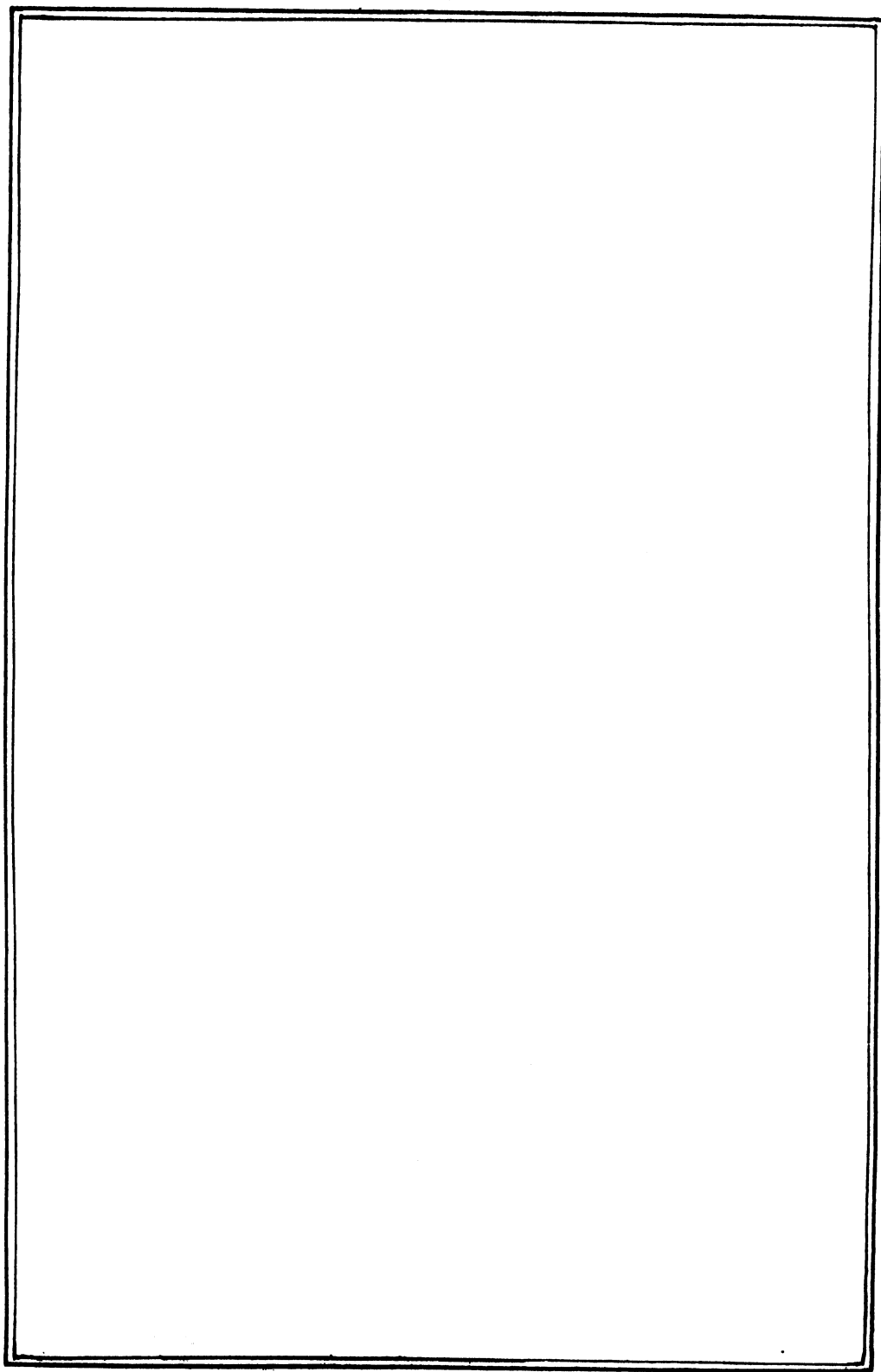
دربیانِ علامات و کمالاتِ مظاہرِ الٰہیہ

رُوح کی پانچ قسمیں

معلوم ہو کہ کلّیتاً ارواح پانچ قسم کی ہیں۔ اوّل "رُوحِ نباتی"۔ یہ ایک قوت ہے جو ترکیب عناصر اور امتزاجِ مواد و تدبیر و تاثیر و ارتباط کائنات سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً الیکٹرک بعض اجزاء کی ترکیب سے پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ اجزاء و عناصر بکھر جاتے ہیں تو یہ قوتِ نامیہ بھی محو ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ الیکٹرک بعض اجزاء کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے اور جب یہ اجزاء ایکدوسرے سے جُدا ہوتے ہیں تو یہ قوت بھی مفقود و متلاشی ہو جاتی ہے۔ یہ رُوح نباتی" ہے۔

دوّم۔ رُوحِ حیوانی ہے۔ یہ بھی عناصر کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر اِس کی ترکیب مکمّل تر ہے۔ ربّ قدیر کی تقدیر سے عناصر امتزاج تام حاصل کرتے اور رُوحِ حیوانی یا دوسرے لفظوں میں قوۂ حسّاسہ پیدا ہوتی ہے۔ یہ حقائق محسوسہ کا احساس کرتی ہے یعنی جنھیں دیکھ سُن۔ چکھ۔ سونگھ اور چھو سکتی ہے یہ بھی اجزائے مرکّبہ کے بکھرنے اور جُدا ہونے کے بعد خود بخود محو ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ چراغ جسے آپ دیکھ رہے ہیں جب تک تیل بتی اور آگ باہم جمع ہیں روشنی دے رہا ہے۔ مگر جب روغن تمام ہو جاتا ہے اور بتی جل جاتی ہے تو روشنی بھی محو ہو جاتی ہے۔ مگر رُوحِ انسانی کی مثال بلور میں فیض آفتاب کی سی ہے۔ یعنی جسم انسانی جو عناصر کا مُرکّب ہے ترکیب و امتزاج کی اکمل صورت، صنعت و کاریگری کا اعلیٰ نمونہ۔ ترکیب و ترتیب کی شریف ترین شکل اور اکمل موجودات ہے۔ یہ رُوحِ حیوانی سے نشو و نما پاتا ہے۔ یہ جسم مکمّل آئینہ کی مانند ہے۔ اور رُوحِ انسانی مثلِ آفتاب ہے۔ اگر آئینہ ٹوٹ جائے تو بھی آفتاب کا فیض باقی رہتا ہے۔ اگر آئینہ محو و نابود ہو جائے آفتاب کا فیض بے ضرر و برقرار رہتا ہے۔ یہ رُوح قوۂ کاشفہ ہے اور کُل اشیاء پر حاوی ہے۔ یہ سب عجیب و غریب آثار و صنعتیں، بڑے بڑے اکتشافات و ایجادیں، اہم و مشہور تاریخی وارداتیں جو آپ دیکھتے ہیں سب اسی کی کشف کی ہوئی ہیں یہی اُنھیں قوتِ معنوی کے ذریعے پردۂ غیب و کمون سے عرصۂ ظہور میں لائی ہے۔ مثلاً زمین میں رہتے ہوئے آسمان میں کشفیات کرتی ہے۔ حقائقِ معلومہ یعنی اُن چیزوں سے جو معلوم و مشہود ہیں

مجہول ونامعلوم چیزوں کو ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ مثلاً اِس نصف کرّہ میں رہتے ہوئے کولمبس کی مانند قوّۂ عاقلہ سے دوسرے کرّہ یعنی امریکا کا جو مجہول و پوشیدہ تھا پتہ لگاتی ہے۔ جسم ثقیل ہے۔ مگر اپنے ایجاد کردہ آلات کے ذریعے ہوا میں اُڑتا ہے۔ بطیءُ الحرکت ہے مگر اُن وسائل کے ذریعے جنھیں خود ایجاد کرتا ہے نہایت سُرعت سے مشرق و مغرب کو طے کرلیتا ہے۔ مختصراً یہ قوّت تمام اشیاء کو گھیرے ہوئے ہے یہ رُوحِ انسانی دو جنبہ رکھتی ہے۔ رحمانی یا شیطانی۔ یعنی حد درجے کے کمال کی استعداد بھی رکھتی ہے اور حد درجہ کے نقص اور زوال کی بھی۔ اگر نیکیاں حاصل کرتی ہے تو اشرفِ ممکنات ہے۔ اور اگر بدیوں کی جانب مائل ہوتی ہے تو ارذلِ موجودات ہے۔

چوتھی روح "رُوحِ آسمانی" ہے۔ یہ رُوح ایمانی و فیضِ رحمانی ہے۔ یہ نفثاتِ رُوح القدس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور قوّتِ خُدائی سے ہمیشہ کی زندگی کا سبب ہوتی ہے۔ یہ وہ قوّت ہے جو انسان کو زمینی سے آسمانی، ناقص سے کامل، ناپاک سے پاک۔ ساکت سے ناطق۔ جاہل سے عالم۔ نباتی اور نفسانی خواہشات کی اسیری سے چھُڑاکر پاک و مقدس بناتی ہے۔

پانچویں رُوح "رُوح القدس" ہے۔ رُوح القدس خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہے مانند آئینہ ہے جو آفتاب کے مقابل ہے۔ جس طرح ایک پاک وصاف آئینہ آفتاب سے انوار لے کر دوسروں کو فیض پہنچاتا ہے۔ اِسی طرح رُوح القدس انوارِ تقدیس کا وسیلہ ہے کہ شمسِ حقیقت سے حاصل کرکے اُنھیں پاک و مقدس لوگوں کو دیتی ہے۔ یہ رُوح تمام کمالاتِ الٰہیہ سے متصف ہے۔ جب ظہور فرماتی ہے تو دُنیا کو بدل دیتی ہے۔ دورۂ جدید کی بُنیاد ڈالتی ہے۔ عالمِ انسانی کو ایک نیا چولہ پہناتی ہے۔ اس کی مثل بہار کی مانند ہے کہ جس وقت آتی ہے دُنیا کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل دیتی ہے۔ موسمِ بہار کی آمد سے جھُلسی ہوئی زمین و دشت و صحرا سبز و خرّم ہو جاتے ہیں۔ طرح طرح کے پھول اور شگوفے اُگتے ہیں۔ اشجارِ حیات تازہ ہوتے ہیں اور نئے پھل پیدا ہوتے ہیں اور ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ رُوح القدس کے ظہور کی مثال ہے۔ جس وقت ظاہر ہوتی ہے، عالمِ انسانی کی تجدید کرتی ہے۔ حقائقِ انسانیہ کو نئی رُوح بخشتی ہے۔ عالمِ وجود کو خلعتِ محمود پہناتی ہے۔ جہل کی تاریکی کو مٹاتی اور کمالات کے نور کو چمکاتی ہے۔ مسیح نے اِس قوّت سے اِس دَور کو تجدید کیا تھا۔ بہارِ الٰہی نے نہایت طراوت و لطافت سے جہانِ انسانی میں خیمہ بلند کیا تھا۔ اور نسیمِ جاں پرور نے نورانیوں کے دماغوں کو معطّر بنایا۔ اِسی طرح ظہورِ جمالِ مُبارک بھی فصلِ بہار کی مانند تھا۔ جو نسائمِ پاک و جنودِ حیاتِ ابدیہ و قوّتِ ملکوتیہ کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ اور سلطنتِ خدا کے تخت کو مرکزِ دُنیا میں قائم کیا۔ رُوح القدس سے نفوس کو زندہ فرمایا اور ایک نئے دَورے کی بُنیاد رکھی ؎

(۱۸)

خدا فقط مظاہرِ الٰہیہ کے وسیلے سے پہچانا جا سکتا ہے

سوال

حقیقتِ اُلوہیت (خدا) مطالعِ ربانیہ و مشارقِ رحمانیہ (انبیاء) سے کیا تعلق رکھتی ہے؟

جواب

معلوم ہونا چاہئے کہ حقیقت و کُنہِ ذاتِ احدیت تنزیہہ صرف اور تقدیس محض ہے۔ یعنی ہر ستائش سے پاک اور ہر تعریف سے مبرا ہے۔ درجۂ وجود کی اعلیٰ ترین صفات اُس مقام میں اوہام ہیں۔ وہ غیب الغیوب سمجھ سے بالا اور ایسی ذاتِ بحت و بے چون وچرا ہے جس کی کوئی صفت بیان ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ ذاتِ الٰہی محیط ہے اور تمام کائنات مُحاط۔ یعنی اُس سے گھری ہوئی ہیں۔ یہ ظاہر ہی ہے کہ محیط، محاط سے بڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا مُحاط، مُحیط پر حاوی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اُس کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ عقل خواہ کتنی ہی ترقی کرے اور ادراک کے انتہائی درجہ تک ہی پہنچ جائے تو بھی اُس کے نشانات و صفات کو عالمِ خلق میں ہی دیکھ سکتی ہے۔ عالمِ حق میں کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیونکہ ذات و صفاتِ حضرتِ احدیت نہایت اعلیٰ درجۂ تقدیس میں ہیں۔ عقول و ادراکات کو وہاں تک راہ نہیں۔ اَلسَّبِیْلُ مَسْدُوْدٌ وَّ الطَّلَبُ مَرْدُوْدٌ (اُس کا راستہ بند ہے اور اُس کی طلب مردود ہے) یہ معلوم ہی ہے کہ مُدرکاتِ انسانیہ وجودِ انسان کی ایک فرع ہیں اور انسان آیتِ رحمٰن ہے۔ آیت کی فرع آیت کے موجد کو کیسے سمجھ سکتی ہے یعنی ادراکات جو وجودِ انسان کی فرع ہیں حضرت یزدان تک نہیں پہنچ سکتیں۔ پس حقیقتِ اُلوہیت تمام ادراکات سے مخفی اور سب انسانوں کی عقلوں سے پوشیدہ ہے۔ اُس تک پہنچنا ممتنع و محال ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مادون اپنے مافوق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یعنی ایک ادنیٰ درجہ والا اپنے سے اعلیٰ درجہ والے کو نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً پتھر، مٹی اور درخت کتنی بھی ترقی کریں حقیقتِ انسان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور دیکھنے سُننے کی قوتوں اور دوسرے حواس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حالانکہ سب مخلوق ہیں۔ پس ایک مخلوق انسان کس طرح اپنے خالق پاک ذات کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ اِس مقام میں نہ عقل کو راہ نہ بیان کو پہنچ۔ نہ اشارہ کو مجال و یارا ہے۔ ذرّۂ خاک کو جہانِ پاک سے کیا کام۔ عقلِ محدود کو عالمِ نامحدود سے کیا رشتہ۔ عقول اُس کے سمجھنے سے عاجز اور نفوس اُس کے بیان سے قاصر ہیں لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝

یعنی آنکھیں اُس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کو ادراک بخشتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے" (قرآن سورۃ الانعام)
لہٰذا اِس مقام میں ہر ذکر و بیان قاصر۔ ہر تعریف و توصیف غیر لائق۔ ہر تصور ساقط اور ہر تعمق باطل ہے۔
مگر اُس جوہر الجواہر۔ حقیقت الحقائق اور سر الاسرار کی تجلیات و اشراقات اور اُس کا جلوہ و ظہور عالم وجود میں ہے۔ اُس اشراق کے چمکنے کی جگہ اور اُس تجلی کا جلوہ گاہ اور اُس ظہور کے مظاہر مطالع مقدسہ۔ حقائق کلیہ و کینونات رحمانیہ ہیں جو ذاتِ مقدس الٰہی کے حقیقی آئینے ہیں۔ خدا کے تمام کمالات و فیوضات و تجلیات اِن مظاہر مقدسہ کی حقیقت سے ظاہر و باہر ہوتے ہیں۔ آفتاب کی مانند جو پاک و صاف آئینوں میں تمام کمالات و فیوضات کے ساتھ چمکتا ہے۔ اگر کہا جاتا ہے کہ آئینے آفتاب کے مظاہر اور نیّر اشراق کے چمکنے کے مقام ہیں تو اِس سے یہ مُراد نہیں کہ آفتاب تقدیس کی بلندیوں سے اُتر کر آئینہ میں مجسم ہوا ہے یا یہ کہ وہ حقیقتِ نامحدود اِس مکانِ مشہود میں محدود ہوگئی ہے۔ استغفر اللہ عن ذٰلک۔ یہ اعتقاد فرقہ مجسمہ کا ہے یعنی اُن لوگوں کا جو خُدا کو مجسم مانتے ہیں۔

ہر تعریف و توصیف و تمجید کا مرجع مظاہر مقدسہ (انبیا) ہیں۔ یعنی جو اوصاف و نعوت و اسما و صفات ہم بیان کرتے ہیں وہ سب کے سب مظاہر الٰہیہ (انبیا) کی طرف پھرتے ہیں۔ کیونکہ ذاتِ اُلوہیت کی حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا کہ اُس کے بارے میں کچھ بتلائے یا بیان کرے یا اُس کی حمد و نعت کو زبان پر لائے پس انسان اسما، وصفات و کمالات کے بارے میں جو کچھ جانتا اور سمجھتا ہے اُس کا مرجع یہی مظاہر مقدسہ ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ السّبیل مقطوعٌ والطّلب مردودٌ (اس کا راستہ بند اور اُس کی طلب مردود ہے)

تو بھی ہم حقیقتِ اُلوہیت کے لئے اسما، و صفات بیان کرتے ہیں۔ اور بصر و سمع و قدرت و حیات و علم سے اُس کی ستایش کرتے ہیں۔ اِن اسما، و صفات سے ہماری مُراد کمالاتِ حق کو ثابت کرنا نہیں بلکہ ہمارا مقصد اُس کی شان میں نقائص کی نفی کرنا ہے۔ جب عالمِ امکان میں ہم نظر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جہالت نقص ہے اور علم کمال ہے۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ وہ ذاتِ پاکِ الٰہی علیم ہے۔ عجز نقص ہے اور قدرت کمال ہے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ خدا کی مقدس ذات قادر ہے۔ اِس سے یہ مُراد نہیں کہ اس کے علم و سمع و بصر و قدرت و حیات کو ہم ادراک کرسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے ادراک سے بالا ہے۔ اسما، وصفاتِ ذاتیہ الٰہی عینِ ذات ہیں اور ذات ادراکات سے منزّہ ہے۔ اگر عینِ ذات نہ ہوں تو بہت سے قُدما کو ماننا پڑتا ہے اور ذات و صفات کے درمیان فرق ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ قدیم لازم ہے۔ اِس لئے قدما کا سلسلہ نامتناہی ہو جاتا ہے۔ یہ صریح غلطی ہے پس اِن سب اوصاف و اسما، و محامد و نعوت کے مرجع مظہر ظہور ہیں۔ اِس کے علاوہ جو کچھ ہم سوچتے اور خیال

کرتے ہیں وہ بالکل وہم ہے۔ کیونکہ اُس غیب منیع کی طرف کوئی راہ نہیں۔ اِسی لئے کہا گیا ہے کلما میزتموہ باوھامکم فی ادق معانیکم فھو مخلوق مثلکم ومردود الیکم یعنی جو کچھ تم نے اپنے باطن کی گہرائیوں میں اپنے اوہام سے اس کے بارے میں سوچ رکھا ہے وہ تمھارے جیسا مخلوق ہے۔ اور تمھاری ہی طرف پھرتا اور لوٹتا ہے"۔

یہ واضح ہے کہ اگر ہم حقیقتِ اُلوہیت کا تصور کریں تو تصور محاط اور ہم اُس کے محیط ہیں۔ محیط البتہ محاط سے بڑا ہے۔ اِس سے صاف ثابت ہوگیا کہ اگر مظاہر مقدسہ کے علاوہ ہم کسی ایک حقیقتِ اُلوہیت کا تصور کرتے ہیں تو وہ صرف ہمارا وہم ہی وہم ہے۔ کیونکہ حقیقتِ اُلوہیت کے لئے کوئی راستہ ایسا نہیں جو ہمارے لئے مقطوع نہ ہو۔ جو کچھ تصور میں آتا ہے وہ وہم ہے۔

پس مُلاحظہ فرمائیں کہ دُنیا کے لوگ اپنے خیال و تصور کے بتوں کی پرستش کر رہے ہیں۔ اور سمجھتے نہیں۔ اپنے وہم کو ادراکات و اشارات سے پاک و منزہ حقیقت خیال کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو اہلِ توحید اور دوسرے لوگوں کو بُت پرست کہتے ہیں۔ حالانکہ بُت کا تو وجود جمادی ہوتا بھی ہے۔ مگر خیال و تصور بالکل وہم ہی وہم ہوتے ہیں۔ ان کا تو وجودِ جمادی بھی نہیں ہوتا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار (پس اے اہلِ بصیرت اس سے عبرت پکڑو)

معلوم ہونا چاہئے کہ صفاتِ کمالیہ و جلوۂ فیوضاتِ الٰہیہ و انوارِ وحی سب مظاہر مقدسہ میں ظاہر و باہر تھے۔ مگر کلمۃ اللہ کبریٰ حضرت مسیح و اسمِ اعظم جمالِ مُبارک (حضرت بہاءاللہ) کا ظہور و بروز تصور سے بالا ہے۔ کیونکہ اپنے سے پہلے سب انبیاء کے کمالات رکھتے ہوئے آپ اُن سے بڑھکر ایسے کمالات کے مالک بھی تھے کہ وہ انبیاء آپ کے تابع تھے۔ مثلاً بنی اسرائیل کے تمام انبیاء پر وحی اُترتی تھی اور حضرت مسیح بھی مظہرِ وحی تھے۔ مگر کلمۃ اللہ کی وحی کہاں اور ایلیا و اشعیا و ارمیا کا الہام کہاں۔ مُلاحظہ فرمائیں کہ روشنی مادۂ اثیر کی موجوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اِن موجوں سے بصارت کی رگیں متأثر ہوتی ہیں اور نظر حاصل ہوتی ہے۔ اب چراغ کے لئے بھی مادۂ اثیر کی موجیں ہیں۔ اور آفتاب کے لئے بھی وہی مادۂ اثیر کی موجیں ہیں۔ مگر کہاں انوارِ آفتاب اور کہاں نورِ ستارہ و چراغ۔ رُوحِ انسان کے لئے رُتبۂ جنین میں ایک جلوہ و ظہور ہے۔ مراتبِ طفولیت و بلوغ و کمال میں بھی اشراق و بروز ہے۔ رُوح وہی روح ہے۔ مگر رُتبۂ جنین سمع و بصر کی برکتوں سے محروم اور رُتبۂ بلوغ و کمال اِن ہی برکتوں کے انتہائی ظہور و بروز و اشراق کے مقام ہیں۔ اِسی طرح بیج شروع میں پتّا بنتا ہے۔ اور رُوحِ نبات کا جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ رُتبۂ ثمر میں بھی اِسی رُوح کا مظہر ہوتا ہے یعنی قوّتِ نامیہ انتہائی کمال سے ظاہر ہوتی ہے۔ مگر پتّے کا درجہ کہاں اور پھل کا مقام کہاں۔

کیونکہ پھل سے ہزاروں پتے ظاہر ہوتے ہیں۔ حالانکہ سب ایک ہی رُوح نباتی سے نشوونما پاتے ہیں
خوب سوچیئے۔ حضرت مسیح کے فضائل وکمالات اور حضرت جمالِ مُبارک کے اشراقات وتجلیات کہاں
اور بنی اسرائیل مثل حزقیل، سموئیل کے فضائل کہاں۔ اگرچہ سب مظاہر وحی تھے۔ مگر دونوں میں بے انتہا
فرق ہے۔ والسلام۔

(لح)

مظاہر مقدّسہ کے تین مراتب

معلوم ہو کہ مظاہر مقدّسہ کے لئے اگرچہ بے انتہا مقامات وکمالات ہیں لیکن عموماً تین مراتب
بیان کئے جاتے ہیں۔ اوّل رُتبۂ جسمانی۔ دوّم رُتبۂ انسانی یا نفسِ ناطقہ۔ سوّم ظہورِ الٰہی وجلوۂ ربانی۔
رُتبۂ جسمانی حادث ہے۔ کیونکہ عناصر سے مِل کر بنا ہے۔ ہر ترکیب کے لئے تحلیل لازمی ہے ممکن نہیں
کہ ترکیب ہو اور تفریق نہ ہو۔

دوسرا مقام نفسِ ناطقہ ہے۔ یہ حقیقتِ انسانی ہے۔ یہ بھی حادث ہے۔ اور مظاہر مقدّسہ اِس رتبہ
میں تمام نوعِ انسان کے ساتھ شریک ہیں۔ واضح ہو کہ رُوحِ انسانی اگرچہ اس کرۂ ارض پر مُدّتِ مدید اور
عرصۂ بعید سے ہے۔ مگر حادث ہے۔ ہاں آیتِ الٰہی ہے۔ اِس لئے وجود پانے کے بعد باقی رہتی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ روحِ انسانی کے لئے آغاز ہے۔ مگر انجام نہیں۔ ابدالآباد تک باقی رہے گی۔ اسی طرح
اِس کرۂ ارض کی دوسری انواع بھی حادث ہیں۔ کیونکہ یہ مُسلّم ہے کہ ایک وقت کُل کرۂ ارض پر یہ انواع
نہ تھیں۔ بلکہ یہ کرۂ ارض بھی موجود نہ تھا۔ مگر عالَمِ وجود ازل الآزال سے ہے۔ کیونکہ یہ اِس کرۂ ارض
تک ہی منحصر نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ رُوحِ انسانی اگرچہ حادث ہے مگر اَب باقی، ابدی ودائمی ہے
کیونکہ انسان کے بالمقابل عالَمِ اشیاء عالَمِ نقص ہے اور عالَمِ انسان اشیاء کے بالمقابل عالَمِ کمال
ہے۔ نقائص جب درجۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں تو بقا حاصل کرتے ہیں۔ یہ مثل ہے۔ آپ مقصد کو سمجھ لیجیئے۔

تیسرا مقام ظہورِ الٰہی وجلوۂ ربانی ہے۔ کلمۃ اللہ ہے۔ فیض ابدی اور رُوح القدس ہے۔ اس کا
نہ اوّل ہے نہ آخر۔ کیونکہ اوّلیت وآخریت عالَمِ امکان کے لئے ہے۔ عالَمِ حق کے لئے نہیں۔ خدا کے
نزدیک اوّل عینِ آخر اور آخر عینِ اوّل ہے۔ مثلاً دن، ہفتے، مہینے، سال، کل اور آج کرۂ ارض

میں ہے آفتاب میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ کل ہے نہ آج۔ نہ مہینہ ہے نہ سال۔ وہاں سب مساوی ہے۔ اسی طرح کلمۃ اللہ ان سب شیون سے منزہ اور عالمِ امکان کی حدود و قیود و قوانین سے مقدّس ہے۔ حقیقتِ نبوت یعنی کلمۃ اللہ و مظہریت کاملہ کے لئے نہ بدایت ہی ہے نہ نہایت۔ اس کا اشراق البتہ آفتاب کی طرح متفاوت ہے۔ مثلاً برجِ مسیح سے اس کا طلوع نہایت چمکدار اور روشن تھا اور یہ باقی و دائمی ہے۔ دیکھئے کتنے مُلوکِ جہانگیر آئے۔ کس قدر وزیر و امیر باتدبیر پیدا ہوئے سب محو و نابود ہو گئے۔ مگر نسائمِ مسیح ویسے ہی چل رہی ہیں۔ اس کے انوار ابھی چمک رہے ہیں۔ اُس کی آواز ابھی بلند ہے۔ اُس کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ اس کی افواج مشغول جنگ ہیں۔ اس کا ہاتف اپنی پیاری ندا سے بُلا رہا ہے۔ اس کا اَبر گہر بار ہے۔ اس کی بجلی شعاع انگیز ہے۔ اُس کی تجلّی واضح و روشن ہے۔ اس کا جلوہ روشن و منوّر ہے۔ یہی ان نفوس کی شان ہے جو آپ کے زیرِ سایہ منوّر و مُستضئ ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مظاہر مقدّسہ تین مقام رکھتے ہیں۔ مقامِ بشریہ۔ مقامِ نفسِ ناطقہ۔ مقامِ ظہورِ ربّانی و جلوۂ رحمانی۔

مقامِ جسدی فنا ہو جاتا ہے۔ مقامِ نفسِ ناطقہ کا اوّل ہے مگر آخر نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کی زندگی پاتا ہے۔ مگر حقیقتِ مقدسہ کا جسے مسیح فرماتے ہیں "باپ بیٹے میں ہے" نہ شروع ہی ہے نہ آخر ہی۔ اس کے لئے جب شروع کہا جاتا ہے تو اُس سے مُراد مقامِ اظہار ہے۔ تشبیہاً خاموشی کو نیند سے تعبیر کیا ہے مثلاً ایک شخص سوتا تھا جب بولنے لگا تو گویا وہ جاگ اُٹھا۔ شخص وہی ہے خواہ سوتا ہو یا جاگتا۔ اُس کے مقام و بلندی و بزرگی و حقیقت و فطرت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ حالتِ خاموشی کو نیند سے تشبیہ دی ہے اور مقامِ ظہور کو بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ انسان نیند و بیداری کی حالت میں وہی انسان رہتا ہے۔ نیند ایک حالت ہے۔ اور بیداری حالتِ دیگر۔ سکوت کو نیند کہا ہے اور ظہور و ہدایت کو بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ انجیل میں فرمایا ہے "سب سے پہلے کلمہ تھا اور کلمہ خُدا کے ساتھ تھا" پس واضح و ظاہر ہو گیا کہ حضرت مسیح بپتسمہ پانے اور رُوح القدس کے بصورتِ کبوتر نازل ہونے کے بعد ہی مقامِ مسیحی اور اُس کے کمالات تک نہ پہنچے تھے بلکہ کلمۃ اللہ لم یزل تقدیس کی بلندیوں پر رہا اور رہے گا۔

(لط)

مظاہرِ ظہور کے جسمانی و رُوحانی مراتب

پہلے ذکر ہوا کہ مظاہرِ ظہور کے تین مقام ہیں۔ اوّل حقیقتِ جسمانیہ جو اس جسد سے تعلق رکھتی ہے

دوسرا حقیقتِ شاخصہ یعنی نفسِ ناطقہ۔ تیسرا ظہورِ ربانی۔ یہ تیسرا درجہ کمالاتِ الٰہیہ ہے جو وجود کی زندگی۔ لوگوں کی تربیت و ہدایت اور دنیا کی نورانیت کا سبب ہے۔ مقامِ جسد مقامِ بشری ہے اور فنا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ عناصر کی ترکیب سے بنا ہے۔ اور جو کچھ عناصر کی ترکیب سے بنتا ہے وہ تحلیل ہوکر متفرق ہوجاتا ہے۔ مظاہر الٰہیہ کی حقیقتِ شاخصہ ایک مقدس حقیقت ہے۔ اس کے مقدس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ از روئے ذات واز روئے صفات یہ تمام دوسری اشیاء سے ممتاز ہے۔ اس کی مثل آفتاب کی طرح ہے جو خود اپنی استعداد سے روشنی پیدا کرتا ہے۔ چاند سے اُسے کوئی مناسبت و مقابلہ نہیں۔ جیسے اُن اجزاء کا جن سے چاند بنا ہے اور اُن اجزاء کا جن سے سورج بنا ہے کوئی مقابلہ نہیں۔ سورج کے اجزاء اور اُن کی ترتیب اِس بات کی مقتضی ہیں کہ شعاعیں پیدا ہوں۔ مگر وہ اجزاء جن سے چاند بنا ہے شعاعیں پیدا کرنے کے مقتضی نہیں بلکہ شعاعیں اقتباس کرنے کے مقتضی ہیں۔ پس کُل دوسرے نفوس چاند کی طرح ہیں جو سورج سے روشنی اقتباس کرتا ہے۔ مگر یہ حقیقتِ مقدسہ بذاتِ خود روشن ہے۔ اس نفس کا تیسرا مقام فیضِ الٰہی و جمالِ قدیم کا جلوہ اور زندہ خدا کے انوار کی چمک ہے۔ مظاہر مقدسہ کی حقیقتِ شاخصہ فیضِ الٰہی و جلوۂ ربانی سے جدا نہیں۔ لہٰذا مظاہر مقدسہ کے صعود سے یہ مُراد ہے کہ اُنھوں نے اِس قالب عنصری کو چھوڑ دیا۔ مثلاً یہ چراغ جو اِس طاق میں جل رہا ہے طاق کے ٹوٹ جانے سے اِس طاق سے منقطع ہوسکتا ہے مگر فیضِ سراج منقطع نہیں ہوسکتا۔ مختصراً مظاہر مقدسہ میں فیضِ قدیم سراج کی مانند ہے۔ اور حقیقتِ شاخصہ زجاج کے مشابہ اور جسمِ انسان طاق کی مانند ہے۔ طاق پڑا ٹوٹ جائے مگر جلتا ہی رہتا ہے۔ مظاہر الٰہیہ جُداگانہ متعدد آئینے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کی ایک خاص شخصیت ہے۔ مگر اِن سب آئینوں میں ایک ہی سورج مجلّی ہے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ حقیقتِ مسیحیہ اور ہے۔ حقیقتِ موسویہ اور۔ اَلحق! حقیقتِ مقدسہ شروع ہی سے اسرارِ وجود کی واقف اور بچپن ہی سے بزرگواری کے آثار اُس سے ظاہر و باہر ہوتے ہیں۔ پھر کس طرح ہوسکتا ہے کہ اِن فیوضات و کمالات کے ہوتے ہوئے اُن میں استشعار نہ ہو۔

مظاہر مقدسہ کے تین مقامات کا ذکر ہم کرچکے ہیں یعنی مقامِ جسد و مقامِ حقیقتِ شاخصہ و مقامِ مظہریتِ کاملہ۔ یہ تینوں مقام سورج اور حرارت اور روشنی کی مانند ہیں۔ دوسرے نفوس بھی مقامِ جسد و مقامِ نفسِ ناطقہ یعنی رُوح و عقل رکھتے ہیں۔ پس جہاں یہ ذکر فرمایا ہے کہ:۔

"میں سو رہا تھا نسائم الٰہی مجھ پر سے ہوکر گذریں اور مجھے بیدار کیا۔"

حضرت مسیح کے اِس بیان کی مانند ہے کہ "جسد محزون ہے مگر رُوح خوش ہے" یا یہ کہ "سخت مشقت میں ہوں"

یا یہ کہ "راحت میں ہوں" یا "زحمت میں ہوں" یہ سب جسد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن حقیقتِ شاخصہ اور اُن مظہریتِ حقیقتِ رحمانیہ سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں جسد انسان میں ہزار ہا انقلابات ہوتے ہیں مگر رُوح پر کبھی اثر نہیں ہوتا۔ جسدِ انسان کے بعض اعضاء بالکل بے کار ہو جائیں تو ہو جائیں مگر جوہرِ عقل باقی و برقرار رہتا ہے۔ لباس پر لکھو کھا آفتیں آئیں لیکن لابس کے لئے کچھ خطرہ نہیں۔ یہ جو جمالِ مُبارک بیان فرماتے ہیں کہ "میں سو رہا تھا اور نسیمِ الٰہی مجھ پر سے ہو کر گذری اور میں بیدار ہوا" اِس کا تعلق جسد سے ہے۔ عالَمِ حق میں ماضیؔ، حال و مستقبل نہیں۔ ماضی، مضارع و حال سب ایک ہیں۔ مثلاً مسیح فرماتے ہیں: "ابتدا میں کلام تھا" اِس کا مطلب یہی ہے کہ تھا، اور ہے اور رہے گا۔ کیونکہ عالَمِ حق میں وقت نہیں ہے۔ وقت کا تعلق صرف خلق سے ہے۔ خُدا سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً نماز میں کہا جاتا ہے "تیرے نام کی تقدیس ہو" اِس سے مُراد یہ ہے کہ تیرا نام مقدس تھا، ہے، اور رہے گا۔ صبح و ظہر و عصر زمین سے تعلق رکھتے ہیں، آفتاب میں صبح و ظہر و عصر و شام کچھ بھی نہیں ؛

---

(۵)

مظاہرِ ظہور کی کیفیّتِ علمی

سوال

مظاہرِ ظہور کے قوٰی میں سے قوّتِ علم کس حد تک محدود ہے ؟

جواب

علم دو قسم کا ہے۔ علمِ وجودی اور علم صوری۔ یا یوں کہئے علمِ تحقیقی اور علمِ تصوّری۔ اشیاء کا علم لوگوں کو عموماً یا تو تصوّر سے حاصل ہوتا ہے یا مشاہدہ سے۔ یعنی یا تو قوّتِ عقل کے ذریعے شئ کا تصوّر کرتے ہیں یا شئے کے مشاہدے سے قلب کے آئینے پر ایک صورت حاصل ہوتی ہے۔ اِس علم کا دائرہ بہت محدود ہے۔ کیونکہ اکتساب و تحصیل اِس کی شرط ہے۔ دوسری قسم کا علم وجودی و تحقیقی ہے۔ یہ علم اُس دانائی اور وقوف کی مانند ہے جو انسان خود اپنے نفس کا رکھتا ہے۔ مثلاً عقل انسان و روحِ انسان جسم کے تمام حالات و اطوار و اعضاء و اجزائے عنصری سے واقف اور تمام حواسِ جسمانی سے مطلع ہے۔ اسی طرح یہ اپنے تمام قوٰی و حسّیات و احوالِ رُوحانی سے بھی باخبر ہے۔ یا علمِ وجودی ہے جسے انسان

پاتا ہے۔ احساس کرتا اور سمجھتا ہے۔ کیونکہ رُوح جسم پر محیط ہے اور حواس و قویٰ سے مُطلع ہے۔ یہ علم سعی و مطالعہ کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک موجود چیز ہے اور خدا کی خالص برکت ہے۔ مظاہرِ کلّیہ الٰہیہ کے حقائقِ مقدّسہ کائنات کی ذات و صفات پر محیط اور حقائق موجودات پر فائق اور اُن کے کاشف ہیں۔ وہ تمام اشیاء کا صحیح اور پورا پورا علم رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن کا علم، علمِ الٰہی ہے۔ اکتسابی نہیں یعنی فیضِ ربّانی و انکشافِ رحمانی ہے۔ ایک مثال بیان کرتے ہیں۔ یہ مثال صرف اسی مطلب کے سمجھنے کے لئے ہے۔ زمین پر انسان اشرفِ موجودات ہے۔ انسان عالمِ حیوان اور نبات و جماد کو سمجھتا ہے یعنی یہ مراتب اس میں اس حد تک مندرج ہیں کہ وہ اِن مقامات و مراتب کا مالک ہے۔ اِن مقامات کا مالک ہونے کے سبب وہ ان کے اَسرار اور اُن کے وجود کے بھیدوں سے واقف ہے۔ یہ مَثَل ہے مِثل نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ مظاہرِ کلّیۂ الٰہیہ اَسرارِ کائنات کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسی شرائع قائم کرتے ہیں جو انسانی عالم کے حال کے موافق و مطابق ہوتی ہیں۔ کیونکہ دین یا شریعت اُن روابطِ ضروریہ کا نام ہے جو حقائق کائنات سے حاصل ہوتے ہیں۔ مظہرِ ظہور یعنی شارعِ مقدّس اگر حقائقِ کائنات سے مطلع نہ ہو تو ان روابطِ ضروریہ کو جو حقائقِ ممکنات سے منبعث ہوتے ہیں سمجھ نہیں سکتا۔ اور نہ ہی ایسا دین وضع کر سکتا ہے جو مطابقِ واقعہ یا موافقِ حال ہو۔ انبیائے الٰہی یا مظاہرِ کلّیہ حاذق اطبّاء کی مانند ہیں۔ عالمِ امکان مانندِ جسمِ انسان ہے۔ اور دینِ الٰہی دَوا و عِلاج۔ پس طبیب کے لئے مریض کے تمام اعضاء و اجزاء و احوال سے آگاہی لازم ہے۔ تا کہ ایسی دوائی ترتیب دے جو بیماری کے زہر کی دافع ہو۔ فی الحقیقت حکیم خود امراضِ مریض سے ہی دوا تجویز کرتا ہے۔ یعنی پہلے مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ پھر بیماری کا علاج تجویز کرتا ہے۔ اگر تشخیص مرض نہ ہو تو دوا کیسے تجویز ہو سکتی ہے۔ پس طبیب کے لئے لازم ہے کہ وہ مریض کی طبیعت اور اُس کے اعضاء، و اجزا و احوال سے پوری پوری واقفیت رکھتا ہو اور سب امراض سے واقف اور کُل دواؤں سے مطلع ہو تا کہ وہ موافق دَوا تجویز کر سکے۔ پس دین وہ روابطِ ضروریہ ہیں جو کائنات سے منبعث ہوتے ہیں۔ مظاہرِ کلّیۂ الٰہیہ چونکہ اسرارِ کائنات سے مطلع ہوتے ہیں اِس لئے روابطِ ضروریہ سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ اِسی کا نام شریعت اللہ یا دین اللہ رکھتے ہیں۔

۳۱
اَدوارِ کلّیہ

سوال: کہا جاتا ہے کہ عالم وجود میں اَدوارِ کلّیہ (عالمگیر دور) واقع ہوتے ہیں۔ اِس مسئلہ کی حقیقت بیان فرمائیں

جواب: اِن اجرامِ نورانیہ کے لئے اِس فضائی نامتناہی میں ہر ایک کے لئے ایک دَورِ زمانی ہے۔

کر مختلف زمانوں میں ہر ایک اپنے فلک کے اندر دورہ کرتا ہے اور ایک چکر ختم ہونے پر دوبارہ نیا دورہ شروع کرتا ہے۔ مثلاً کرۂ ارض ہر ۳۶۵ دن پانچ گھنٹے ۴۸ منٹ اور کچھ کسور میں اپنا دورہ ختم کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر نیا دورہ شروع کرتا ہے۔ یعنی وہی دورۂ اوّل دوبارہ تجدید ہوتا ہے۔ اِسی طرح کلِّ عالَم وجود آفاق و انفس میں بڑے بڑے واقعات اور عظیم احوال و امور کے دورے ہیں۔ جب ایک دورہ ختم ہوجاتا ہے تو دوسرا دورہ شروع ہوتا ہے۔ وہ پہلا دورہ اِس دورہ میں بڑے بڑے حوادثات کے واقع ہونے کے سبب بالکل فراموش ہو جاتا ہے۔ یہانتک کہ اس کا اثر اور اُس کی کچھ خبر مطلقاً نہیں رہتی۔ چنانچہ مُلاحظہ فرمائیں کہ بیس ہزار سال پہلے کے واقعات کی ہمیں بالکل خبر نہیں۔ حالانکہ ہم دلائل سے پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ کرۂ ارض بہت قدیم ہے۔ سو ہزار یا دو ہزار یا ایک ملیون اور دو ملیون سال نہیں بلکہ بہت ہی قدیم ہے۔ اور پُرانے زمانوں کے آثار و اخبار بالکل مفقود ہیں۔ اِسی طرح ایک مظہرِ ظہورِ الٰہی کے لئے ایک دورِ زمانی ہے جس میں اُس کے احکام اور اس کا دین جاری رہتا ہے۔ جب اُس کا دَور انتہا کو پہنچتا ہے تو ایک نئے مظہرِ ظہور کا دَور شروع ہوتا ہے اسی طرح ادوار آتے جاتے اور تجدّد پاتے ہیں۔ حتّٰی کہ عالَمِ وجود کا ایک دورۂ کُلّیہ ختم ہوتا ہے اور ایسے بڑے اور عظیم الشّان حوادث و واقعات واقع ہوتے ہیں کہ پہلے دَورہ کا اثر یا اُس کی کوئی خبر بالکل نہیں رہتی۔ پس عالَمِ وجود میں ایک بڑا نیا دورہ شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ عالَمِ وجود کی کوئی ابتدا نہیں۔ ہم اس مسئلہ پر پہلے دلیل و بُرہان دے چکے ہیں۔ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ عالَمِ وجود کے دَورِ کُلّی سے مُراد ایک مُدّتِ مدیدہ بے حد و بے شمار قرنیں اور زمانے ہیں اور اس دَورہ کے دوران میں مظاہرِ ظہور ساحتِ شہود میں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ ایک بڑا ظہورِ کُلّی آفاق کو اپنا مرکزِ اشراق فرماتا ہے اور اس عالمگیر ظہور کے سبب عالَم بلوغ کو پہنچتا ہے۔ اس کے دَورہ کی مُدّت بہت لمبی ہے۔ اس کے زیرِ سایہ مظاہر مبعوث ہوتے ہیں اور بحسبِ اقتضای زمانہ بعض احکام کو جو جسمانیات و معاملات کے متعلق ہیں بدل دیتے ہیں۔ ہم اس دَور میں ہیں جس کی ابتداء آدم سے ہوئی اور جس کا ظہورِ کُلّی جمالِ مُبارک ہیں ؛

(۴۲)

نفوذ و تاثیر مظاہر الٰہیہ

سوال: اعراضِ حقیقت یعنی مظاہرِ ظہورِ الٰہی کے قوٰی اور کمالات کس درجہ تک ہیں اور ان کا نفوذ کس حد تک ہے ؟

جواب

عالمِ وجود یعنی کائناتِ جسمانیہ کو مُلاحظہ فرمائیں۔ دائرۂ شمسیہ (سولر سسٹم) اندھیرا اور تاریک ہے۔ اِس دائرہ میں آفتاب مرکزِ انوار ہے۔ باقی سب سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں اور اس کے فیوضات سے چمکتے ہیں۔ دائرۂ شمسیہ میں آفتاب، زندگی اور نورانیت کا سبب اور تمام کائنات کی نشو ونما کا باعث ہے۔ اگر آفتاب کا فیض نہ ہوتا تو اِس دائرہ میں موجودات کی ایک چیز بھی نہ ہوتی۔ بلکہ کُل تاریک و مُنتشر ہو جاتیں۔ پس واضح و ظاہر ہوا کہ دائرۂ شمسیہ میں آفتاب، مرکزِ انوار اور سببِ حیاتِ کائنات ہے۔ اِسی طرح مظاہرِ مقدّسہ الٰہیہ مرکزِ انوارِ حقیقت و منبعِ اسرار و فیوضاتِ محبت ہیں۔ عوالمِ قلوب و افکار پر تجلّی فرماتے ہیں اور عالمِ ارواح پر فیضِ قدیم مبذول فرماتے ہیں حیاتِ رُوحانی بخشتے ہیں۔ حقائق و معانی کے انوار سے درخشاں ہوتے ہیں۔ عالمِ افکار کی روشنی اِسی مرکزِ انوار و مطلعِ اسرار سے ہے۔ اگر اِن نفوسِ مقدّسہ کا فیضِ تجلّی و تربیت نہ ہوتا تو نفوس و افکار کی دُنیا تاریک در تاریک ہوتی۔ اگر اِن مطالعِ اسرار کی صحیح تعلیمات نہ ہوتیں تو عالمِ انسانی، اخلاق و اطوارِ حیوانی کا جولانگاہ ہوتا۔ سب کا وجود مجازی ہوتا۔ حیاتِ حقیقی مفقود ہوتی۔ اِسی لئے انجیل میں فرمایا ہے" ابتداء میں کلام تھا یعنی سب کی زندگی کا یہی سبب تھا۔

اَب کائناتِ زمینی میں آفتاب کے نفوذ کو مُلاحظہ فرمائیں۔ آفتاب کی دوری و نزدیکی سے اس کے طلوع و غروب سے کائنات میں کیا کیا نتائج و آثار واضح و آشکار ہوتے ہیں کبھی سردی کبھی گرمی۔ جب خطِ استوا سے گذرتا ہے تو بہارِ جاں بخش جلوہ نما ہوتی ہے۔ اور جب سمتِ راس میں پہنچتا ہے تو میوہ جات درجۂ کمال کو پہنچتے ہیں۔ اناج اور نبات اپنی اپنی پیداوار دیتے ہیں۔ سب کائناتِ زمینی نشو ونما کے آخری درجہ پر پہنچ جاتی ہیں۔ اِسی طرح مظہرِ مقدّس ربّانی جو عالمِ آفرینش کا آفتاب ہے، جب عالمِ ارواح و افکار و قلوب پر تجلّی فرماتا ہے تو بہارِ رُوحانی آتی ہے اور نئی زندگی جلوہ نما ہوتی ہے نئی بہار زور وں پر آتی ہے اور ایک نہایت ہی عجیب موہبت و عنایت نمایاں ہوتی ہے۔ چنانچہ مُلاحظہ فرمائیے کہ ہر مظہرِ الٰہی کے ظہور کے وقت عالمِ معقول و اَرواح و افکار کو ایک عجیب ترقی حاصل ہوتی ہے خصوصًا اِس عصرِ الٰہی میں مُلاحظہ فرمائیں کہ عالمِ عقول و اَرواح میں کس قدر ترقی حاصل ہوئی ہے۔ حالانکہ یہ ابتدا ہی عنقریب ہی دیکھنے میں آئے گا کہ یہ فیوضاتِ جدیدہ اور یہ تعالیمِ الٰہیہ اِس تاریک جہان کو نورانی اور اِن اقالیمِ غمگین کو بہشتِ بریں بنائیں گی۔ اگر ہر مظہرِ مقدّس کے آثار و فیوضات کا بیان کریں تو یہ بہت طویل ہو جائے گا۔ آپ خود غور و فکر کریں۔ اِس مطلب کی حقیقت کو پا لیجئے گا۔

(ج)

انبیاء دو قسم کے ہیں

سوال

انبیاء کی کتنی قسمیں ہیں؟

جواب

انبیاء دو قسم کے ہیں۔ ایک بالاستقلال و متبوع۔ دوسرے غیر مستقل و تابع۔ انبیائے مستقلہ صاحبِ شریعت اور دورِ جدید کے موسس ہوتے ہیں۔ اُن کے ظہور سے دُنیا ایک نیا چولہ بدلتی ہے۔ اور ایک نئے دین کی بُنیاد پڑتی ہے اور ایک نئی کتاب نازل ہوتی ہے۔ یہ انبیاء حقیقتِ اُلوہیت سے بلاواسطہ فیض حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی نورانیت نورانیت ذاتی ہوتی ہے بعینہٖ آفتاب کی مانند جو خود اپنی ہی ذات سے روشن ہے۔ اُس کی روشنی اُس کا ایک لزومِ ذاتی ہے۔ کسی دوسرے سیارے یا ستارے سے حاصل کی ہوئی نہیں۔ یہ مطالعِ صبحِ احدیت فیض کے سرچشمے اور ذاتِ حقیقت کے آئینے ہیں۔

دوسری قسم کے نبی تابع و مروّج ہیں۔ کیونکہ فرع ہیں مستقل نہیں۔ یہ نبی انبیائے مستقلہ سے فیض پاتے ہیں۔ اور نبوّتِ کلّیہ سے نورِ ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ چاند کی مانند جو بذاتِ خود روشن و ساطع نہیں بلکہ آفتاب سے روشنی پاتا ہے۔ مظاہرِ نبوّتِ کلّیہ جو بالاستقلال اِس دُنیا میں ظاہر ہوئے، اُن میں کی حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت مسیحؑ۔ حضرت محمدؐ۔ حضرت اعلیٰ اور حضرت جمالِ مُبارک ہیں۔ دوسری قسم کے جو تابع و مروّج ہیں اُن میں سے حضرت سلیمانؑ۔ داؤدؑ۔ اشعیاؑ۔ ارمیاؑ۔ حزقیالؑ ہیں۔

انبیائے مُستقلہ مُوسِّس تھے۔ یعنی اُنھوں نے ایک نئی شریعت کی بنیاد ڈالی اور لوگوں کو ایک نئی خلق بنایا۔ اخلاقِ عموم کو بدل دیا۔ اور ایک نئے طریقے اور نئی روش کو جاری کیا۔ ایک نیا زمانہ شروع ہوا۔ اور ایک نئے دین نے شکل پکڑی۔ اُن کا ظہور موسمِ بہار کی طرح ہے کہ سب کائناتِ زمین ایک نئی خلعت پہنتی اور ایک نئی زندگی پاتی ہے۔

دوسرے قسم کے نبی جو تابع ہیں شریعت اللہ کو جاری کرتے ہیں۔ دینِ اللہ کو پھیلاتے اور کلمۃ اللہ کو بلند کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے بلکہ انبیائے مستقلہ سے ہی حاصل کرتے اور ماہتاب کی مانند دوسروں پر نورانی پرتو ڈالتے ہیں۔

سوال

بدھا اور کونفیوشس کس قسم کے انبیاء تھے؟

جواب

بودھ نے ایک نیا دین تاسیس کیا تھا اور کونفیوش نے اخلاق و سلوکِ قدیم کی تجدید فرمائی تھی۔ مگر اِن کے اصول بالکل درمیان سے اُٹھ گئے۔ اور بدھا اور کونفیوش کی اُمتیں اصل معتقدات وعبادات پر بالکل باقی و برقرار نہیں رہیں۔ بدھ دین کا موسّس اور ایک نہایت ہی نفیس وجود تھا۔ آپ نے وحدانیتِ الٰہی کی بُنیاد ڈالی تھی۔ مگر بعد میں آہستہ آہستہ اصلی اصول درمیان سے اُٹھ گئے۔ اور جاہلانہ عادات و رسوم شروع ہوگئیں۔ حتیٰ کہ بُتوں کی پوجا کرنے لگے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت مسیح نے بار بار فرمایا اور سخت تاکید سے فرمایا کہ توراۃ کے دس احکام کی متابعت کرنا۔ اِن دس احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ "تو کسی تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت کی پرستش مت کر" اِس وقت بعض مسیحیوں کے گرجوں میں بکثرت بُت اور تصاویر پائی جاتی ہیں۔ پس واضح و معلوم ہوگیا کہ لوگوں کے درمیان خُدا کا دین اصلی حالت میں نہیں رہتا۔ بلکہ بتدریج تبدیل و تغییر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بالکل محو و نابود ہو جاتا ہے۔ اس لئے نیا ظہور ظاہر ہوتا ہے اور نئے قوانین قائم کئے جاتے ہیں۔ اگر تغیر و تبدل نہ ہو تو تجدید کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ درخت ابتدا میں سرسبز و پُرشگوفہ و پُرثمر تھا۔ پھر کُہنہ اور پُرانا، بالکل بے ثمر بلکہ خشک و بوسیدہ ہوگیا۔ اس لئے باغبانِ حقیقت پھر اُسی صنف کا ایک نہالِ بیہمال لگاتا ہے۔ جو روز بروز نشو و نما پاکر باغِ الٰہی میں اپنے سایہ کو پھیلاتا ہے اور قابلِ تعریف پھل دینے لگتا ہے یہی حال ادیان کا ہے۔ وقت کے گذرنے کے سبب اُن کے اصلی اصول بدل جاتے ہیں اور دینِ خُدا کی حقیقت بالکل اُٹھ جاتی ہے۔ رُوح نہیں رہتی۔ بلکہ بدعتیں داخل ہو جاتی ہیں اور جسم بے جان رہ جاتا ہے۔ اِسی لئے تجدید کیا جاتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ بودھ اور کونفیوش کے پیرو اب بُتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ وحدانیتِ الٰہی سے بالکل بے خبر ہیں۔ قدیم یونانیوں کی طرح موہوم خداؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ وحدانیتِ الٰہی سے بالکل بےخبر ہیں۔ قدیم یونانیوں کی طرح موہوم خداؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ اُن کے اصولِ قدیم ایسے نہ تھے۔ اُن کے اصول اور اُن کی روش اور تھی۔ ملاحظہ فرمائیں حضرت مسیح کے اصولِ دین کس قدر فراموش کر دیئے گئے ہیں۔ اور کیسی کیسی بدعتیں درمیان میں آگئی ہیں۔ مثلاً حضرت مسیح نے تعدی و انتقام سے منع کیا ہے بلکہ

شرارت اور مضرت کے بدلے نیکی اور مہربانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب دیکھیں کہ خود مسیحیوں کے درمیان کس قدر خونریز جنگیں واقع ہوتی ہیں۔ کیسے کیسے ظلم کس قدر جفائیں اور کیسی درندگی وخونخواری اُن میں پائی جاتی ہے۔ یہانتک کہ زمانہ سابق میں بہت سی لڑائیاں پوپ کے فتوے سے واقع ہوئیں۔ پس معلوم و واضح ہوگیا کہ دین مرورِ ایام کے سبب بالکل تغیر وتبدیل ہوجاتا ہے اس لئے تجدید ہوتا ہے۔

(۳۱)

خُدا کا عتاب انبیاء پر اور اُس کے معنی

سوال

کُتبِ مقدسہ میں بعض خطابہای زجریہ عتاب کے طور پر انبیاء کو کئے گئے ہیں۔ اُن کا مخاطب کون ہے اور یہ عتاب کس پر واقع ہیں؟

جواب

ہر خطابِ الٰہی جو ازروئے عتاب ہے اگرچہ اس کے مخاطب بظاہر انبیاء ہیں مگر بحقیقت اُمت ہے۔ اس کی حکمت محض شفقت ہے تاکہ اُمت افسردہ و دلگیر نہ ہو اور خطاب وعتاب اُن پر گراں نہ گذرے۔ اِسی لئے انبیاء کو خطاب کر کے کہے گئے ہیں۔ پس اگرچہ بظاہر نبی کی طرف خطاب ہوتا ہے لیکن باطن میں مخاطب اُمت ہوتی ہے۔ پیغمبر نہیں۔ علاوہ ازیں ایک خودمختار مقتدر بادشاہ اپنی اقلیم کے سب لوگوں کا نمایندہ ہے۔ یعنی اُس کا قول سب کا قول اور اُس کا عہد سب کا عہد ہوتا ہے۔ کیونکہ عموم کا ارادہ اور اُن کی مرضی اُس کے ارادہ اور اُس کی مرضی میں فانی ہوتی ہے۔ اِسی طرح پیغمبر اپنی اُمت کی ہیئاتِ عمومی کا نمایندہ ہے۔ لہٰذا اُس کی طرف عہد وخطابِ الٰہی کُل اُمت کی طرف عہد وخطاب ہوتا ہے۔ خطاب زجری وعتاب اغلباً لوگوں پر گراں گذرتا ہے اور دِلوں کے ٹوٹنے کا سبب ہوتا ہے۔ اِس لئے حکمتِ بالغہ کو یہی بھایا کہ وہ انبیاء کو ان کا مخاطب بنائے۔ یہ بات تورات سے صاف ظاہر ہے۔ بنی اسرائیل نے مخالفت کی اور حضرت موسیٰ سے کہا گیا کہ عمالیقیون سے نہیں لڑسکتے۔ کیونکہ وہ قوی، زورآور اور بہادر ہیں۔ خدا نے اس کے لئے موسیٰ اور ہارون پر عتاب فرمایا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نہایت اطاعت کی حالت میں تھے۔ گنہگار نہ تھے۔ کیونکہ ایک ایسا بزرگوار شخص جو فیضِ الٰہی اور تبلیغِ شریعت کا واسطہ ہو لازماً امراللہ کا مطیع ہوگا۔ یہ نفوسِ مُبارکہ درخت کے پتوں کی طرح ہوا کے

جھونکوں سے متحرک ہوتے ہیں۔ اپنے ارادہ سے کچھ بھی نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ نفوسِ مُبارکہ نفحاتِ محبت اللہ سے منجذب ہوتے ہیں۔ اُن کا ارادہ بالکل منسلب ہوتا ہے۔ اُن کا قول خدا کا قول، اُن کا امر خدا کا امر اور اُن کی نہی خدا کی نہی ہے۔ اِس چراغ کی طرح۔ اس کی روشنی سراج سے ہے۔ یہ اگرچہ بظاہر زجاج سے چمکتی ہے مگر درحقیقت سراج سے آتی ہے۔ اسی طرح انبیای الٰہی اور مظاہرِ ظہور کا حرکت و سکون وحیِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ انسانی خواہشات کے مطابق نہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پیغمبر کیسے امین بن سکتا ہے۔ اور کس طرح خدا کا سفیر کہلا سکتا ہے۔ اور خدا کے اوامر و نواہی کو کس طرح اس کے بندوں تک پہنچا سکتا ہے۔ پس کُتب مقدسہ میں مظاہرِ ظہور کے حق میں جو کچھ بطور قصور لکھا ہے وہ اسی قسم کا ہے۔

الحمدللہ کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور آپ نے بندگانِ الٰہی سے مُلاقات کی۔ رضای خدا کے سِوا کیا آپ نے کچھ اور بھی بو باس پائی؟ لا واللہ۔ اپنی آنکھوں سے آپ نے دیکھا کہ کس طرح رات دن سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اِن کا مطلب کلمۃ اللہ کو ملبند کرنا۔ لوگوں کی تربیت و اصلاح کرنا، رُوحانی ترقیات کو پھیلانا، صُلحِ عمومی کو جاری کرنا۔ نوعِ انسانی سے خیر خواہی کرنا۔ سب اقوام کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا۔ انسانوں کی بہتری کے لئے جاں فشانی کرنا۔ ذاتی منافع سے منہ موڑنا اور عالمِ انسانی کے فضائل کے پھیلانے کے لئے محنت کرنا ہی اس کے سوا اُن کا مقصد اور کچھ نہیں۔

برسرِ مطلب۔ توریت کی کتاب اشعیاء کے باب ۴۸ کی آیت ۱۲ میں فرماتا ہے "اے یعقوب میری سُن! اور اے اسرائیل جو میرا بُلایا ہوا ہے میں وہی ہوں اور میں ہی اوّل اور میں ہی آخر بھی ہوں"۔ یہ معلوم ہی ہے کہ اس سے مُراد یعقوب جو اسرائیل تھا نہیں بلکہ قوم بنی اسرائیل مقصود ہے۔ پھر کتاب اشعیا کے باب ۴۳ کی آیت اوّل میں فرماتا ہے "سو اب خداوند کہ جس نے اے یعقوب تجھ کو پیدا کیا اور جس نے اے اسرائیل تجھ کو بنایا یوں کہتا ہے کہ مت ڈر کہ میں نے تجھے رہائی دی۔ میں نے تیرا نام لے کے تجھے بُلایا۔ تو میرا ہے۔"

پھر تورات کی کتاب گنتی کے باب ۲۰ کی آیت ۲۳ میں فرماتا ہے "اور خداوند نے کوہ ہور پر جو ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا موسیٰ اور ہارون کو کہا۔ ہارون اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔ کیونکہ وہ اس زمین میں جو میں نے بنی اسرائیل کو دی ہے داخل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ تم مریبہ کے پانی پر میرے حکم کو ٹال کر باغی ہوئے"

اور اِسی باب کی آیت ۱۳ میں فرماتا ہے "یہ مریبہ کا پانی ہے جہاں بنی اسرائیل نے خدا سے جھگڑا کیا اور اس نے اُن کے درمیان اپنے تئیں مقدس کیا"

دیکھیے گُناہ تو بنی اسرائیل نے کئے مگر بظاہر عتاب موسیٰ اور ہارون پر ہوا۔ چنانچہ تورات کی کتاب استثناء کے باب ۳ کی آیت ۲۶ میں فرماتا ہے "خدا تمھارے سبب مجھ پر غضبناک ہوا۔ اور اُس نے میری نہ سُنی بلکہ خداوند

نے مجھے کہا اتنا تیرے لئے کافی ہے۔ اس مقدمے میں مجھ سے اور کچھ مت کہہ"۔

اَب یہ خَطا و خِطاب درحقیقت اُمّتِ اسرائیل سے ہے۔ جو خدا کے حکم سے سرتابی کرنے سے ایک مُدّتِ مدید تک یَرون کے اُس طرف کے لق و دق صحرا میں یوشع علیہ السّلام کے زمانے تک گرفتار رہے۔ اَب یہ خطاب و عتاب اگرچہ بظاہر حضرت موسیٰ و ہارون سے ہے۔ مگر فی الحقیقت اُمّتِ اسرائیل سے ہے

اسی طرح قرآن میں حضرت محمدؐ سے خطاب فرماتا ہے "انا فتحنا لك فتحاً مّبیناً لیغفر لك الله ما تقدّم من ذنبك وما تأخّر" یعنی ہم نے تیرے لئے ایک فتح ظاہر فرمائی تاکہ ہم تیرے پہلے اور پچھلے گناہوں کو بخشدیں"۔ یہ خطاب اگرچہ بظاہر حضرت محمد کو تھا مگر فی الحقیقت تمام اُمّت اس کی مخاطب تھی۔ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ یہ محض حکمتِ بالغۂ الٰہیہ کے سبب تھا۔ تاکہ دل بے چین۔ فکرمند و شرمسار نہ ہوں۔ کتنی مرتبہ انبیائے الٰہی و مظاہرِ ظہورِ کلّی مناجات میں اپنے قصوروں اور گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کی تعلیم کے لئے ہے تاکہ خضوع و خشوع کا انھیں شوق و حرص ہو۔ اور گناہوں اور قصوروں کا اعتراف کرنا سیکھیں والّا وہ مقدّس نفوس ہر گناہ سے پاک اور ہر خطا سے منزّہ ہیں۔ مثلاً انجیل میں لکھا ہے کہ ایک شخص حضرت مسیح کے پاس آیا اور کہا "اے معلّمِ نیکوکار" حضرت مسیح نے جواب میں فرمایا "کیوں مجھے نیکوکار کہتا ہے نیکوکار ایک ہی ہے اور وہ خدا ہے"۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ آنحضرت گنہگار تھے۔ بلکہ شخصِ مخاطب کو خضوع و خشوع و خجلت و سرمساری کی تعلیم دینی مقصود تھی۔ یہ مبارک نفوس نور ہوتے ہیں، نور و تاریکی ایک ہی جگہ نہیں رہ سکتے۔ زندگی ہوتے ہیں، زندگی و موت ایک ہی جگہ جمع نہیں ہوسکتی۔ ہدایت ہوتے ہیں، ہدایت اور گمراہی ایک ہی جگہ نہیں رہ سکتی۔ اطاعت کے جوہر ہوتے ہیں، اطاعت و بغاوت ایک جگہ مجتمع نہیں ہوسکتی۔ مختصراً مقصود یہ ہے کہ جو خطاب کُتبِ مقدسہ میں عتاب کے طور پر ہیں ان کے مخاطب اگرچہ بظاہر انبیاء یعنی مظاہرِ الٰہی ہیں مگر حقیقتاً اُن کی مخاطب اُمّت ہوتی ہے۔ کُتبِ مقدسہ کو خوب غور سے پڑھیں یہ مسئلہ آپ پر واضح و آشکار ہو جائے گا۔ والسّلام

(۴۵)

کتاب الاقدس کی آیت

لیس لمطلع الامر شریك فی العصمۃ الکبریٰ

کا بیان

سوال

آیۂ مبارکہ میں فرماتا ہے "لیس لمطلع الامر شریک فی العصمۃ الکبری انہ لمظہر یفعل ما یشاء فی ملکوت الانشاء قد خص اللہ ھذا المقام لنفسہ وما قدر لاحد نصیبا من ھذا الشان المنیع۔" (عصمتِ کبریٰ میں مطلع امر کا کوئی شریک نہیں۔ تحقیق وہ ملکوتِ انشاء میں "جو چاہے کرے" کا مظہر ہوتا ہے۔ بیشک یہ مقام خدا نے اپنے نفس کے لیے مخصوص رکھا ہے۔ اور اس شانِ منیع میں کسی کے لئے کچھ بھی حصہ مقدر نہیں۔

جواب

معلوم ہو کہ عصمت دو قسم کی ہے۔ عصمتِ ذاتی و عصمتِ صفاتی۔ عصمتِ ذاتی مظہرِ کلّی کے لئے مخصوص ہے۔ کیونکہ عصمت اس کا لزومِ ذاتی ہے اور لزومِ ذاتی شئ سے جُدا نہیں ہو سکتا۔ روشنی آفتاب کا لزومِ ذاتی ہے۔ آفتاب سے جُدا نہیں ہو سکتی۔ علمِ خدا کا لزومِ ذاتی ہے۔ یہ خدا سے جُدا نہیں ہو سکتا۔ قدرتِ خدا کا لزومِ ذاتی ہے۔ یہ خدا سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ جُدا ہو تو خدا خدا نہ ہو۔ اگر روشنی آفتاب سے جُدا کر لی جائے تو آفتاب آفتاب نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر عصمتِ کبریٰ مظہرِ کلّی سے جُدا کر لی جائے تو وہ مظہرِ کلّی نہیں رہتا اور کمالِ ذاتی کی اس میں کمی رہے گی۔

عصمتِ صفاتی شئ کا لزومِ ذاتی نہیں بلکہ موہبتِ عصمت کی ایک کرن ہے جو آفتابِ حقیقت سے قلوب پر چمکتی ہے اور نفوس کو بہرہ و نصیب بخشتی ہے، یہ نفوس اگرچہ عصمتِ ذاتی نہیں رکھتے مگر عصمتِ خدا کی حفاظت و حمایت کے تلے ہیں یعنی خدا انھیں خطا سے بچاتا ہے۔ مثلاً بہت سے نفوسِ مقدسہ عصمتِ کبریٰ کے مطلع نہ تھے ولیکن خدا کی حفاظت و حمایت کے تلے خطا سے محفوظ و مصئون تھے۔ کیونکہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطۂ فیض تھے۔ اگر خدا انھیں خطا سے نہ بچاتا تو ان کی خطا تمام مومنین کو خطا میں ڈال دیتی اور دینِ خدا کی بنیاد بالکل منہدم ہو جاتی اور یہ خدا کے لائق و سزاوار نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ عصمتِ ذاتیہ صرف مظاہرِ کلّیہ تک ہی رہتی ہے۔ اور عصمتِ صفاتی ہر شخص پاک کے حصہ میں آتی ہے۔ مثلاً بیت العدل عمومی اگر لازمی شرط یعنی تمام ملت کے انتخاب سے بنایا گیا تو ایسا بیت العدل خدا کی عصمت و حمایت کے تلے ہوگا۔ جو کچھ کتاب (اقدس) میں منصوص نہیں اسے بیت العدل اتفاقِ آراء یا کثرتِ آراء سے مقرر کرے تو یہ قرار و حکم خطا سے محفوظ ہے۔ اب اعضائے بیت العدل فرداً فرداً عصمتِ ذاتی کے مالک نہیں۔ مگر ہیئتِ بیت العدل عصمت خدا کی حمایت کے زیرِ سایہ ہے۔ اس عصمت کو عصمتِ موہوب کہتے ہیں

مختصراً فرماتا ہے کہ مطلع اَمر مظہر یفعل مایشا ہے۔ یہ مقام ذاتِ مقدّس کے لئے مخصوص ہے۔ غیر کو اس کمالِ ذاتی میں حصہ نہیں یعنی مظاہر کلیہ کے لئے چونکہ عصمتِ ذاتی محقق ہے۔ اس لئے جو کچھ ان سے صادر ہوتا ہے وہ عینِ حقیقت و مطابقِ واقع ہوتا ہے۔ وہ پہلی شریعت کے زیر سایہ نہیں ہوتے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں کلام خدا ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں عمل صدق ہوتا ہے۔ کسی مومن کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔ خالص تسلیم ان پر فرض ہے۔ کیونکہ مظہر ظہور حکمتِ بالغہ سے قیام فرماتا ہے۔ عقول شاید اس کی حکمت خفیہ کے بعض امور سمجھنے سے عاجز ہوں۔ مظہر ظہور کلّی جو کچھ کہتا اور کرتا ہے وہ عینِ حکمت و واقع کے مطابق ہوتا ہے۔ پس اگر بعض لوگ اس کے کسی حکم یا عمل کے اسرار خفیہ کو نہیں سمجھ سکتے تو انھیں نہ چاہئے کہ اعتراض کریں۔ کیونکہ مظہرِ کلّی یفعل مایشاء ہے۔

بارہا ایسا واقع ہوا کہ ایک شخص عاقل و دانا و کامل سے کوئی فعل صادر ہوا۔ دوسرے لوگ اس کی حکمت کو نہ سمجھ کر اعتراض کرنے لگے اور متعجب ہوئے کہ یہ عقلمند شخص کیوں ایسا کہتا ہے یا کیوں ایسا کرتا ہے۔ یہ اعتراض ان کے جہل سے صادر ہوتے ہیں۔ اس حکیم کی حکمت خطا سے مقدس و مبرا ہوتی ہے۔ اسی طرح طبیب حاذق معالجۂ مریض کے لئے "یفعل مایشاء" ہے۔ مریض کو اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ جو کچھ طبیب کہتا یا کرتا ہے وہی صحیح ہے۔ سب کے لئے لازم ہے کہ اُسے اپنے فعل اور اپنے حکم میں آزاد و مختار مانیں۔ البتہ طبیب ایسا معالجہ بھی کرتا ہے جو دوسروں کے خیال کے خلاف ہوتا ہے۔ اَب اُن لوگوں کا اعتراض جو حکمت و طب نہیں جانتے جائز نہیں۔ لا واللہ بلکہ سب کے لئے لازم ہے کہ سرِ تسلیم خم کریں۔ اور جو کچھ طبیبِ حاذق کہے وہی کریں۔ پس طبیب حاذق "یفعل مایشاء" ہے۔ مریضوں کا اس درجہ میں حصہ نہیں۔ حذاقت کا ثابت ہونا ضرور ہے۔ جب حذاقت ثابت ہوگئی تو وہ "یفعل مایشاء" ہے۔ اسی طرح فوج کا جرنیل چونکہ فنونِ جنگ میں یکتا ہے اسلئے جو کچھ کہتا اور حکم دیتا ہے "یفعل مایشاء" ہے۔ جہاز کا کپتان بھی چونکہ فنونِ بحریہ میں کامل ہے اسلئے جو کچھ وہ کہتا ہے "یفعل مایشاء" ہے

چونکہ سچا مربّیِ انسان کامل ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ وہ کہتا اور حکم دیتا ہے اس میں وہ یفعل مایشاء ہوتا ہے۔

پس یفعل مایشاء کے معنے یہ ہوئے کہ اگر مظہر ظہور کچھ کہے یا کچھ حکم دے یا کوئی کام کرے جس کی حکمت اس کے ماننے والوں کی سمجھ میں نہ آئے تو بھی انھیں نہ چاہئے کہ وہ اس کی مخالفت کا خیال تک بھی کریں بلکہ ان کو چاہئے کہ وہ معلوم کریں کہ اس نے کیوں یہ بات کہی یا کیوں ایسا کام کیا۔ دوسرے لوگ جو عالمگیر مظہرِ ظہور کے سایہ تلے ہیں۔ شریعت اللہ کے اوامر کے ماتحت ہیں اور وہ ایک بال بھر بھی ان حکموں سے

ادھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ اُن کے قول و فعل شریعت اللہ کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اگر وہ اس سے انحراف کریں گے تو خدا کے حضور میں ذمہ وار ٹھہرائے جائیں گے۔ اور سرزنش کئے جائینگے۔ اس میں شک نہیں کہ صفتِ "یفعل ما یشاء" میں وہ شریک نہیں۔ کیونکہ یہ صفت اور یہ شان صرف عالمگیر مظہر کے لئے ہی مخصوص ہے۔ پس مسیح (میری رُوح اُس پر نثار) "یفعل ما یشاء" کے مظہر تھے۔ مگر آپ کے حواری ایسے شریک نہ تھے۔ کیونکہ وہ حضرت مسیح کے زیر سایہ تھے۔ وہ آپ کے حکم اور آپ کی مشیت سے انحراف نہ کر سکتے تھے۔
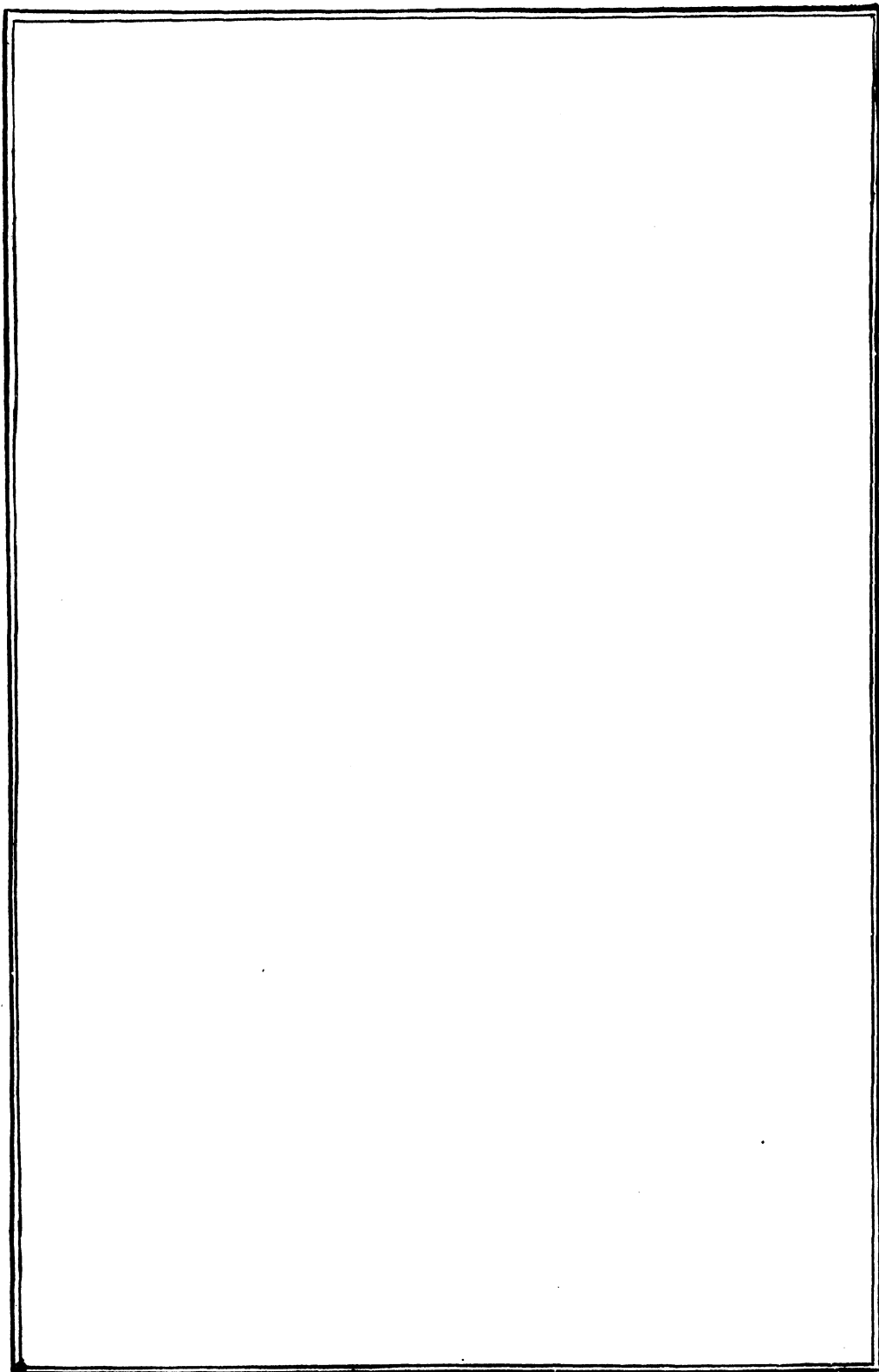
قسمِ چہارم

اِنسان کے آغاز و انجام اور اس کے مختلف حالات

اور

اُس کی قوتوں کے بارے میں مختلف مقالات

از مفاوضاتِ عبدالبہاءؑ

گفتگوی بر سرِ ناہار

(۳۰)

تغیرِ انواع

آب ہم اِس سوال کو اُٹھاتے ہیں کہ کیا چیزوں کی نوعیت بدل سکتی ہے۔ اور اعضاء کا ارتقاء کس حد تک ممکن ہے۔ بالفاظِ دیگر کیا انسان، حیوان سے ترقی کرتے کرتے انسان بنا ہے؟ یہ خیال یورپ کے بعض فلاسفروں کے دل میں ایسا پختہ ہو گیا ہے کہ اِس وقت اس کی غلطی کو سمجھانا بہت مشکل ہے مگر آئندہ چل کر یہ غلطی ظاہر و آشکار ہو جائے گی۔ اور یورپ کے فلاسفر اِس مسئلہ کی غلطی کو سمجھ جائینگے۔ کیونکہ دراصل اس مسئلہ کی غلطی صاف ظاہر ہے۔ انسان جب غور سے کائنات کو دیکھتا ہے اور موجودات کے احوال کی باریکیوں کو جان جاتا ہے اور عالمِ وجود کی وضع و ترتیب و تکمیل کو دیکھتا ہے تو یقین کر لیتا ہے کہ عالمِ امکان میں کوئی چیز بھی اس سے زیادہ عجیب نہیں۔ جو فی الحال موجود ہے۔ کیونکہ ہر چیز جو آسمان یا زمین میں بلکہ تمام فضای نامتناہی میں ہے جیسا کہ چاہیئے تھا کامل پیدا کی گئی ہے۔ اور اُس کی تنظیم و ترکیب و ترتیب بالکل مکمل ہے۔ اس میں کوئی نقص نہیں۔ یہانتک کہ اگر تمام کائنات کاملاً عقل بن جائے اور ابد الآباد تک غور و خوض کرے تو بھی ممکن نہیں کہ جو کچھ ہے اُس سے بہتر کوئی چیز خیال میں لا سکے۔ اگر یہ کہیں کہ آفرینش پہلے ایسے کمالات سے آراستہ نہ تھی بلکہ پست تر تھی تو وجود مہمل اور ناقص ٹہرتا ہے۔ اور اِس حالت میں آفرینش کا نامکمل ہونا ماننا پڑتا ہے۔ اس مسئلہ کو نہایت غور و خوض سے دیکھنا ضروری ہے۔ مثلاً عالمِ امکان یعنی عالمِ وجود کو مثال کے لئے جسمِ انسان کے مشابہ تصوّر کریں۔ اگر یہ ترکیب و ترتیب و تکمیل و جمال و کمال جو اسوقت جسمِ انسان میں ہے نہ ہوتا تو یہ نقصِ محض ہوتا۔ پس اگر ایک ایسے زمانے کا تصور کریں کہ اس وقت انسان عالمِ حیوانی میں یعنی بالکل حیوان تھا تو وجود ناقص تھا۔ جس کے معنے یہ ہوئے کہ انسان نہ تھا۔ اور ہیکلِ عالم کا یہ عضو جو بمنزلہ مغز و دماغ ہے مفقود تھا تو عالم بالکل ناقص تھا۔ پس یہ ثابت ہو گیا کہ اگر ایک وقت انسان جنسِ حیوان میں تھا تو عالمِ وجود بھی کامل نہ تھا۔ کیونکہ انسان اِس عالم کا عضوِ اعظم ہے۔ اور اگر جسم کا عضوِ اعظم نہ ہو تو وہ جسم ناقص ہے۔ انسان کو عضوِ اعظم ہم اس لئے کہتے ہیں کہ انسان تمام کائنات میں وجود کے تمام کمالات پر حاوی ہے۔ انسان سے ہماری مُراد انسانِ کامل ہے یعنی دُنیا کا وہ اوّل شخص جو تمام رُوحانی اور جسمانی خوبیوں کا جامع اور کائنات میں مثلِ آفتاب ہو۔ پس غور کریں

کہ اُسوقت جب آفتاب موجود نہ تھا بلکہ آفتاب بھی ستارہ تھا تو ایسے وقت میں یہ ماننا پڑے گا کہ روابطِ وجود مختل تھے۔ کس طرح ایسی چیز تصور میں آسکتی ہے۔ اُس شخص کے لئے جو عالمِ وجود کو خوب غور سے مُلاحظہ کرتا ہے جو کچھ ہم نے کہا کافی ہے۔

اِس کے علاوہ ایک اور دلیل ہے اور وہ زیادہ لطیف ہے۔ عالمِ وجود میں یہ بے انتہا کائنات موجود ہے۔ انسان ہو یا حیوان نبات ہو یا جماد۔ جو کچھ بھی ہے اُن میں سے ہر ایک مختلف عناصر کے مجموعہ سے بنا ہے۔ اور یہ تکمیل جو ہر چیز میں آپ دیکھتے ہیں بلاشک وشبہ عناصر کی ترکیب کی خوبی اور اندازہ کی مناسبت۔ ترکیب کی کیفیت اور تمام دوسری کائنات کی تاثیرات سے پیدا ہوئی ہے۔ پس کُل کائنات ایک دوسرے سے سلسلہ وار مربوط ہے۔ اور باہمی مدد و امداد اور تاثیر کائنات کے خواص اور موجودات کے وجود اور اُن کی نشو ونما کا سبب ہے۔ یہ دلائل و براہین سے ثابت ہے کہ اِن کائنات میں سے ہر ایک عموماً دوسری سب کائنات پر بالاستقلال یا بالتسلسل اثر انداز ہے۔ خلاصہ یہ کہ کائنات کے ہر کائن کی تکمیلیت یعنی وہ تکمیلیت جو اِسوقت آپ انسان اور دوسری چیزوں میں دیکھتے ہیں اجزا اور اعضاء اور قویٰ کے لحاظ سے عناصر کی ترکیب اور اُن کے مقادیر و موازین سے پیدا ہوتی ہے۔ جب امتزاجِ عنصری کی کیفیت اور وہ باہمی اثر و تاثیر جو انسان اور دوسری کائنات میں ہے جمع ہوتے ہیں تو یہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ اِن سب کی تکمیل عناصر مرکبہ کے اجزاء اور اُن عناصر کی مقادیر اور کیفیتِ امتزاج اور دوسری کائنات کے اثر و تاثیر سے حاصل ہوتی ہے لہٰذا اس ہزار سال یا ایک لاکھ سال پہلے چونکہ انسان اِنہیں عناصر خاکی اور اِنھیں مقادیر و موازین، اِسی نحویت و ترکیب و امتزاج اور کائنات کے اِسی اثر و تاثیر سے پیدا ہوا تھا، اِسلئے وہ انسان بھی بعینہ یہی انسان تھا جو اِسوقت ہے۔ یہ بات صاف و صریح ہے شک وشبہ کو اِس میں جگہ نہیں۔ یعنی اگر ایک ارب سال بعد بھی انسان کے یہ عناصر جمع ہوں اور اِنھیں خاص مقادیر سے ترکیب پائیں، یہی نحویتِ امتزاج حاصل ہو اور دوسری کائنات کے اِسی اثر سے متأثر ہوں تب بھی بعینہ یہی انسان موجود ہو گا۔ مثلاً ایک لاکھ سال بعد اگر تیل اور آگ اور بتی اور چراغدان اور روشن کرنے والا وغیرہ وغیرہ وہ تمام چیزیں جو اِسوقت لازم ہیں اُس وقت بھی موجود ہوں تو بعینہ ایسا ہی چراغ پیدا ہوگا۔ یہ صریح ثبوت ہیں۔ اٹل اور قطعی دلائل ہیں۔ مگر جو دلیلیں یورپین حضرات پیش کرتے ہیں وہ قطعی نہیں بلکہ ظنی ہیں۔

(حز)

عالمِ وجود کا آغاز نہیں

مبدأ انسان

مسائلِ الٰہیہ میں سے یہ نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے کہ عالمِ وجود یعنی اِس کونِ نامتناہی کی ابتداء نہیں۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خُدا کے اسماؤ صفات کا ہونا اِس بات کا مقتضی ہے کہ کائنات بھی ہو۔ اگرچہ یہ مسئلہ مُفصلاً بیان ہو چکا ہے پھر بھی ہم کچھ مختصر سا یہاں بھی بیان کرتے ہیں۔

معلوم ہو کہ ربّ بے مربوب۔ بادشاہ بے رعیت۔ مُعلّم بے مُتعلّم۔ خالق بے مخلوق۔ رازق بے مرزوق تصوّر میں نہیں آسکتا۔ خدا کے تمام اسماء، وصفات وجودِ کائنات کے مُستدعی ہیں۔ اگر ہم تصوّر کریں کہ ایک وقت ایسا تھا جب کائنات بالکل موجود نہ تھی تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم خدا کی اُلوہیت کے منکر ہیں، علاوہ ازیں عدم صرف قابلِ وجود نہیں۔ اگر کائنات نیستی محض ہوتی تو وجود کبھی موجود نہ ہوتا۔ لہٰذا چونکہ ذاتِ احدیت یعنی وجود الٰہی ازلی و سرمدی یعنی لااوّل ولا آخر ہے اسلئے بلاشک وشبہ عالمِ وجود یعنی یہ کونِ نامتناہی بھی بِلا ابتداء ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اجزائے ممکنات کا ایک جز یعنی ایک نیا کُرّہ پیدا ہو یا کرّاتِ موجودہ میں سے کوئی کرّہ درہم برہم ہو جائے مگر اور کرّہ ہای نامتناہی موجود ہیں، عالمِ وجود کی ترتیب نہیں بگڑتی۔ نہ یہ فنا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ چونکہ ان کرّات میں سے ہر ایک کرّہ کے لئے ابتداء ہے اِس لئے حکماً اِس کے لئے انتہا بھی ہے۔ ہر ترکیب کیلئے خواہ کُلّی ہو یا جزئی تحلیل لازم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض ترکیبیں جلد تحلیل ہو جاتی ہیں اور بعض دیر میں تحلیل ہوتی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک چیز جو بنی ہے وہ بگڑے نہیں۔ پس ہمیں جاننا چاہئے کہ ان موجوداتِ عظیمہ کا وجود شروع میں کیا تھا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ ابتداء میں مبدأ واحد تھا۔ ممکن نہیں کہ مبدأ دو ہوں۔ تمام ہندسوں کا مبدأ ایک ہے دو نہیں۔ دو محتاج مبدأ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اصل میں مادّہ واحد ہے۔ اور یہ واحد مادّہ ہر عنصر میں ایک ایک صورت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ جس سے مختلف صورتیں پیدا ہوئیں۔ ہر صورت نے پیدا ہو کر ایک استقلال پیدا کیا۔ اور ہر ایک عنصر مخصوص بن گیا۔ لیکن یہ استقلال

ایک مُدّتِ مدیدہ کے بعد پایۂ حصول و درجۂ تحقیق اور رتبۂ تکوین تک پہنچا۔ تب یہ عناصر لا انتہا صورتوں میں مُرکب، مرتّب و ممتزج ہوئے۔ یعنی اِن عناصر کے ملنے اور مُرکّب ہونے سے بے انتہا کائنات وجود میں آئی۔ اِس ترکیب و ترتیب نے حکمتِ الٰہیہ اور قدرتِ قدیمہ سے ایک نظمِ طبعی یا تنظیمِ قدرتی حاصل کی۔ چونکہ یہ عناصر قدرتی تنظیم کے ذریعے نہایت پختگی و حکمت کے مطابق قانونِ کُلّی کے ماتحت ترکیب و امتزاج پاتے ہیں اس لئے واضح ہے کہ ایجادِ الٰہی میں اتفاقی ترکیب و ترتیب نہیں۔ اِسی لئے ہر ایک ترکیب سے ایک ہستی پیدا ہوتی ہے۔ اتفاقی ترکیب سے کوئی وجود پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص اپنی عقل و ذکاء سے عناصر کو جمع کر کے ترکیب دے تو چونکہ یہ ترکیب انتظامِ طبیعی سے نہیں ہوتی، اس لئے زندہ وجود پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اس سوالِ مقدرہ کا جواب ہے جو شاید دِل میں گذرے کہ اگر یہ کائنات ترکیب و امتزاج عناصر سے پیدا ہوتی ہیں تو اِن عناصر کو جمع کر کے اور ملا کر ہم بھی ایک کائن پیدا کر سکتے ہیں۔ ایسا خیال کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ یہ ترکیب اصلی در ترکیب الٰہی ہے۔ اور یہ امتزاج انتظامِ طبیعی کے مطابق خُدا دیتا ہے۔ اِسی لئے اس ترکیب سے ایک کائن پیدا ہو کر وجود میں آتا ہے۔ جو ترکیب انسان دیتا ہے اُس سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیونکہ انسان خلق نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ عناصر کی ترکیب و امتزاج و تخویت، ترتیب موازین سے اور دوسری اشیاء و حقائقِ نامتناہی کی تاثیر سے بے حساب و بے شمار کائنات پیدا ہوتی ہے۔ یہ واضح ہے کہ کُرۂ زمین ایک ہی دفعہ اس موجودہ ہیئت میں نہیں بنا تھا۔ بلکہ اُس نے بتدریج مختلف اطوار طے کئے۔ حتیٰ کہ موجودہ تکمیل اس میں جلوہ نما ہوئی۔ موجوداتِ کلیہ موجوداتِ جزئیہ کے مطابق ہیں۔ موجوداتِ جزئیہ سے موجوداتِ کُلّیہ قیاس کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ موجودِ کُلّی اور موجودِ جزئی دونوں ایک ہی نظمِ طبیعی، ایک ہی قانونِ کُلّی اور ایک ہی ترتیبِ الٰہی کے ماتحت ہیں۔ مثلاً آپ اِس نظامِ عمومی میں چھوٹی چھوٹی کائناتِ دُنیا کو بڑی بڑی کائنات کے مطابق پاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک ہی کارخانۂ قدرت اور ایک ہی نظمِ طبیعی اور ایک ہی قانونِ عمومی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اِسی لئے ایک سے دوسرے کا قیاس لگا سکتے ہیں۔ مثلاً نطفہ انسان ماں کے رحم میں بتدریج نشو و نما پا کر مختلف اشکال و اطوار سے گذرتا ہوا حدِ درجہ کے حسن کے ساتھ جوان ہو کر بصورتِ تکمیل نہایت لطافت کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔ اسی طرح اِس پھول کا بیج جسے آپ دیکھ رہے ہیں ابتداء میں نہایت ہی چھوٹی سی حقیر چیز تھا۔ رحمِ زمین میں نشو و نما پا کر مختلف صورتیں بدلتا رہا۔ حتیٰ کہ کمال طراوت و لطافت سے اس رتبہ میں جلوہ نما ہوا۔ واضح ہے کہ یہ کُرۂ زمین بھی رحمِ عالم میں تکوّن پا کر نشو و نما پاتا ہوا مختلف حالات اور صورتیں بدلتا ہوا بتدریج موجودہ تکمیل پا کر بے انتہا مکونات سے آراستہ ہو کر نہایت خوبی کے ساتھ جلوہ نما ہوا ہے۔ پس واضح ہوا کہ وہ مادۂ اصلیہ جو بمنزلہ نطفہ ہے اور عناصر مرکبہ و ممتزجہ جو اُس کی پہلی صورتیں تھیں صدیوں اور زمانوں میں بتدریج نشو و نما

پاکر ایک ہیئت و شکل سے دوسری ہیئت و شکل بدلتا ہوا حضرتِ یزداں کی حکمتِ بالغہ سے موجودہ تکمیل و انتظام ترتیب و اتقان تک پہنچا ہے۔

اب ہم مطلب کی طرف آتے ہیں کہ انسان ابتدائے وجود میں کرّۂ زمین کے رحم میں جس طرح نطفہ رحمِ مادر میں نشو و نما پاتا اور پلٹتا ہوا ایک صورت سے دوسری صورت اور ایک ہیئت سے دوسری ہیئت بدلتا رہا حتیٰ کہ اِس جمال و کمال و قویٰ و ارکان کے ساتھ جلوہ نما ہوا یقین ہے کہ ابتدا میں اِس ملاحت و لطافت و ظرافت میں نہ تھا۔ بلکہ بتدریج اِس ہیئت و شمائل اور حسن و ملاحت تک پہنچا ہے۔ جیسا کہ نطفۂ انسان جس نے بلاشبہ ماں کے پیٹ میں یہ صورت ایک ہی مرتبہ نہیں پائی۔ یک لخت ہی فتبارک اللہ احسن الخالقین کا مظہر نہیں ہوا۔ بتدریج مختلف حالتیں اور شکلیں بدلتا ہوا اِس شمائل و جمال و کمال اور لطافت و ملاحت سے جلوہ نما ہوا۔ پس صاف ظاہر ہوگیا کہ اِس کرّۂ زمین میں انسان کی اِس تکمیل تک نشو و نما ایسی ہی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں نطفۂ انسانی کی نشو و نما کہ بتدریج حالتیں بدلتا رہا۔ ایک ہیئت و صورت سے دوسری ہیئت و صورت میں انتقال کرتا رہا۔ کیونکہ یہ نظامِ عمومی اور قانونِ الٰہی کا اقتضاء ہے یعنی نطفۂ انسانی مختلف حالتیں پیدا کرتا اور بہت سے درجوں سے گذرتا ہے۔ حتیٰ کہ (فتبارک اللہ احسن الخالقین) کی صورت تک پہنچتا ہے۔ تب رشد و جوانی کے نشان اُس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اِسی طرح نوعِ انسان کو بھی اِس کرّۂ زمین میں ابتدائے وجود کے وقت سے لے کر اِس موجودہ ہیئت و شمائل و حالت تک پہنچنے کے لئے ایک لمبی مدت لگی ہوگی۔ اِس حالت تک پہنچنے کے لئے بہت سے درجات طے کرنے پڑے ہونگے۔ مگر اپنے وجود کی ابتدا ہی سے انسان ایک نوعِ ممتاز تھا اور ہے جس طرح نطفۂ انسان ماں کے پیٹ میں شروع میں ایک عجیب شکل میں ہوتا ہے۔ پھر یہ جسم ایک ترکیب سے دوسری ترکیب' ایک ہیئت سے دوسری ہیئت اور ایک صورت سے دوسری صورت بدلتا ہوا نہایت جمال و کمال سے جلوہ نما ہوتا ہے۔ مگر اُس وقت بھی جب رحمِ مادر میں اُس عجیب ہیئت میں تھا جو موجودہ شکل و شمائل سے بالکل مختلف تھی، ایک نوعِ ممتاز کا نطفہ تھا۔ حیوان کا نہیں، اس کی نوعیت و ماہیت بالکل نہیں بدلی۔ بالفرض اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ بعض اعضاء کے نشان جو پہلے تھے اور اب نہیں، موجود ہیں، تو یہ عدمِ استقلال اور عدمِ اصالتِ نوع کی دلیل نہیں ہو سکتے۔ انتہا یہ ہے کہ ہیئت، و شمائل و اعضائے انسان نے ترقی کی ہے۔ انسان ہمیشہ سے نوعِ ممتاز رہا اور ہے۔ انسان، انسان ہی رہا ہے حیوان کبھی نہ تھا۔ مثلاً ماں کے پیٹ میں نطفۂ انسان اگر ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں چلا جائے تو اس پہلی ہیئت سے بالکل مختلف ہے۔ تو کیا یہ نوعیت کے بدلنے کی دلیل ہو سکتی ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلے حیوان تھا، اب اِس کے اعضا نشو و نما پاکر انسان تک پہنچے ہیں۔ لا واللہ۔

غرض یہ خیال اور رائے (یعنی انسان کا پہلے کبھی حیوان ہونا) کس قدر سست اور بے بنیاد ہے اصالتِ نوعِ انسان اور استقلالیتِ ماہیتِ انسان واضح و مشہود ہے۔ والسلام

(۳۴)

انسان اور حیوان میں فرق

ایک دو مرتبہ روح کے مسئلہ پر بات چیت ہوئی۔ لیکن ہماری یہ باتیں لکھی نہیں گئیں۔
جاننا چاہئے کہ اہلِ عالم دو قسم یعنی دو فرقے ہیں۔ ایک فرقہ روح کا منکر ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان بھی ایک قسم کا حیوان ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حیوان کی قوتیں اور اس کے حواس بھی ویسے ہی ہیں جیسے انسان کے۔ یہ بسیط و مفرد عناصر جن سے یہ فضا مملو ہے، بے انتہا ترکیبوں سے وجود پاتے ہیں، اور ہر ایک ترکیب سے ایک کائن پیدا ہوتا ہے۔ جملہ کائنات میں سے ایک ذوی الارواح (انسان) ہے۔ جو قویٰ اور احساس کا مالک ہے۔ جتنی ترکیب مکمّل تر ہوتی ہے اُتنا ہی یہ کائن اشرف تر ہوتا ہے۔

وجودِ انسان میں عناصر کی ترکیب تمام کائنات کی ترکیب سے مکمّل تر ہے اور اُن کا امتزاج نہایت معتدل ہوتا ہے۔ لہٰذا اشرف و اکمل ہے، ان لوگوں کا قول ہے کہ یہ اس لئے نہیں کہ انسان ایک خاص قوت و روح کا مالک ہے جس سے دوسرے حیوانات محروم ہیں۔ حیوانات بھی حسّاس جسم رکھتے ہیں۔ انسان بعض قویٰ میں حسّاس تر ہے (حالانکہ ظاہری قویٰ حسّاسہ مثلاً سُننے۔ دیکھنے۔ چکھنے سونگھنے اور چھونے کی طاقتوں حتّٰی کہ بعض باطنی قویٰ مثلاً حافظہ میں حیوان، انسان سے شدید تر ہے، اُن کا قول ہے کہ حیوان، انسان سے شدید تر ہے۔ اُن کا قول ہے کہ حیوان ادراک و شعور کا مالک ہے۔ نہایت یہ کہ انسان کا شعور زیادہ ہے۔ یہ موجودہ فلاسفروں کے قول ہیں، یہ اُن کا زعم ہے، اور اُن کے اوہام نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اسی لئے لمبی بحث اور بڑی بڑی دلیلوں کے بعد اُنھوں نے انسان کو حیوان کی اولاد تک پہنچا دیا ہے۔ کہتے ہیں ایک وقت تھا جب انسان حیوان تھا۔ نوع بدل کر ترقی کرتا ہوا کم از کم درجہ انسان تک پہنچا ہے۔

لیکن الٰہیون کہتے ہیں کہ ایسا نہیں۔ اگرچہ ظاہری حواس میں انسان و حیوان شریک ہیں لیکن

انسان میں ایک خارق العادت قوّت موجود ہے۔ جو حیوان میں نہیں پائی جاتی۔ یہ سب علوم وفنون۔ ایجادیں اور صنعتیں انکشافِ اسرار اور کشفِ حقائق اسی رُوحانی قوّت کے نتائج ہیں، یہ ایک ایسی قوّت ہے جو تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ یہ حقائقِ اشیاء کی مُدرک اور کائنات کے پوشیدہ اسرار کی کاشف ہے۔ اس لئے اُن پر قابض ہے، حتیٰ کہ اُن چیزوں کا ادراک بھی کرلیتی ہے جو ظاہر میں موجود نہیں ہیں یعنی غیر محسوس حقائقِ معقولہ کا جو ظاہر میں وجود نہیں رکھتے بلکہ غیب ہیں بمثلاً عقل و رُوح کی حقیقت کا اور انسان کی صفات حُب و حُزن، عادات و اخلاق کا جو حقائقِ معقولہ ہیں ادراک کرتی ہے، علاوہ ازیں انسان نے جو یہ لاانتہا علُوم وفنون صنعتیں اور ایجادیں، آئین وقوانین ظاہر کئے ہیں وہ ایک وقت غیب مستور اور سرِّ مکنون تھے، اسی قوۂ محیطۂ انسان نے انھیں کشف کیا اور حیزِ غیب سے عرصۂ شہود میں لائی، پس تار برقی، فوٹو گرافی، فونو گرافی اور ایسی اور عجیب وغریب ایجادیں اور صنعتیں ایک وقت سرِّ مکنون تھیں انسانی حقیقت نے اُن کا کھوج نکالا۔ اور پردۂ غیب سے میدانِ شہود میں لائی۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا تھا کہ اس لوہے کے خواص جیسے آپ دیکھ رہے ہیں بلکہ سب دھاتوں کے خواص سرِّ مکنون تھے، حقیقتِ انسانی نے اس دھات کا کھوج لگایا۔ اور اسمیں صنعت کی یہ ہیئت ایجاد کی۔ یہی حال اُن سب چیزوں کا ہے جو انسان نے ایجاد اور دریافت کیں۔ ایسی ایجادیں لامتناہی ہیں۔ اس کا ہم انکار نہیں کرسکتے۔

اگر کہیں کہ یہ قویٰ حیوانیت اور قوائے حواس جسمانیت کے اثرات ہیں تو یہ ظاہر ہے اور صاف صاف ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات ان قوتوں کے اندر انسان سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مثلاً حیوان کی نظر انسان کی نظر سے زیادہ تیز ہے۔ حیوان کی سُننے کی قوت انسان کی قوتِ سامعہ سے بہت بڑھ کر ہے۔ یہی حال سونگھنے اور چکھنے کا ہے۔ مختصر یہ کہ حیوان اور انسان کے تمام قوائے مشترکہ میں حیوان اکثر شدید تر ہیں۔ مثلاً قوۂ حافظہ کو لیجئے اگر ایک کبوتر کو یہاں سے کسی دور مقام پر لے جائیں اور وہاں چھوڑیں تو وہ لوٹ کر یہاں آجائیگا راہیں اُسے حفظ رہتی ہیں۔ ایک کُتّے کو وسطِ ایشیا میں لے جاکر چھوڑیں وہ یہاں آجائے گا۔ بالکل راہ نہ بھولے گا۔ یہی سُننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوّتوں کا حال ہے۔ پس واضح ہوگیا کہ انسان میں اگر قوائے حیوانی کے بغیر اور قوت نہ ہو تو حیوان کو عظیم الشان اکتشافات اور حقائق کے ادراک کرنے میں انسان سے بڑھ کر ہونا چاہئے۔ اس دلیل سے صاف ظاہر ہوگیا کہ انسان میں ایک ایسی حقیقت ہے جو حیوان میں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حیوان صرف اشیاء محسوسہ کا ہی ادراک کرسکتا ہے۔ حقائق معقولہ کا ادراک نہیں کرسکتا۔ یعنی جو کچھ پیشِ نظر ہے اُسے ہی دیکھتا ہے اور جو حدِ نظر سے باہر ہے ممکن نہیں کہ اُس کا ادراک کرسکے یا اُسے تصور میں لاسکے۔ مثلاً ممکن نہیں کہ حیوان اِس بات کا ادراک کرسکے کہ زمین کروی الشکل ہے

انسان اُن باتوں سے جو معلوم ہیں استدلال کر کے اُن باتوں کا جو معلوم نہیں پتہ لگا لیتا ہے۔ مثلاً انسان آفاقِ مائلہ کو دیکھ کر زمین کے گول ہونے کا نتیجہ نکالتا ہے۔ قطب شمالی مکہ میں ۲۱ درجہ ہے یعنی ۲۱ درجے اُفق سے بلند ہے۔ جب انسان قطب شمالی کی طرف جاتا ہے تو ہر ایک درجۂ مسافت کے ساتھ ساتھ قطبِ شمالی بھی ایک درجہ اونچا ہوتا جاتا ہے۔ یعنی ایک درجہ طے کرنے کے بعد قطب کی اونچائی ۲۲ درجہ ہو جاتی ہے۔ پھر چالیس درجہ ۵۰ درجے ۶۰ درجے ۷۰ درجے۔ حتیٰ کہ قطب پر پہنچنے کے بعد اُس کی بلندی ۹۰ درجے ہوتی ہے اور سمت الرّاس میں پہنچ جاتا ہے یعنی عین سر کے اوپر ہوتا ہے۔ قطب اور اُس کا بلند ہونا محسوس اُمور ہیں۔ کہ جتنا قطب کی طرف کوئی جاتا ہے اُتنا ہی قطب بلند ہوتا جاتا ہے۔ اِن دو معلوم اُمور سے ایک مجہول اَمر کا پتہ لگتا ہے، اور وہ یہ کہ اُفق جُدا ہے یعنی ہر درجۂ زمین کا اُفق دوسرے درجۂ زمین کے اُفق سے علیحدہ ہے۔ اِس کیفیت کو انسان ادراک کرتا ہے اور اِس سے ایک امرِ مجہول یعنی زمین کے گول ہونے کا استدلال کرتا ہے۔ ممکن نہیں کہ حیوان اِن باتوں کو سمجھ سکے۔ اِسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ یہ جان سکے کہ سورج مرکز ہے اور زمین متحرک۔ حیوان حواس کا اسیر اور اُن کا قیدی ہے۔ وہ اُمور جو حواس سے بالا ہیں یعنی جن پر حواس کا تصرّف نہیں اُنھیں بالکل ادراک نہیں کر سکتا۔ حالانکہ ظاہری قویٰ و حواس میں حیوان انسان سے بڑھ کر ہے۔ پس ثابت و محقق ہو گیا کہ انسان میں ایک قوۂ کاشفہ ہے جس کے سبب یہ حیوان سے ممتاز ہے۔ اور یہی روحِ انسان ہے۔

سُبحان اللہ! انسان ہمیشہ بلندی کی طرف توجہ لگائے رکھتا ہے۔ اُس کی ہمت بلند ہے۔ ہمیشہ چاہتا ہے کہ اِس عالَم سے جس میں کہ ہے بلند عالَم کو ترقی کرے اور اونچے سے اونچے درجے پر پہنچے۔ بلندی کی محبت انسانی خصوصیت ہے۔ ہم متحیر ہیں کہ امریکا اور یورپ کے بعض فلاسفر کیسے اپنے آپ کو عالَمِ حیوان کی طرف گھٹانا چاہتے ہیں اور ترقیِ معکوس کے خواہاں ہیں۔ کیونکہ وجود کے لئے لازم ہے کہ بلندی کی طرف توجہ لگائے رہے۔ حالانکہ اگر اِن فلاسفروں میں سے کسی کو کہا جائے کہ تو حیوان ہے تو بہت رنجیدہ اور دِل تنگ ہوگا۔

عالَمِ انسان کہاں اور عالَمِ حیوان کہاں۔ کہاں کمالاتِ انسان اور کہاں جہالتِ حیوان؟ نورانیتِ انسان کہاں اور ظلمانیتِ حیوان کہاں۔ کہاں عزّتِ انسان اور کہاں ذلّتِ حیوان۔ ایک دس سالہ عرب بچہ صحرا میں دو تین سو اونٹوں کو مسخر کر کے رکھتا ہے۔ ایک آواز سے اُنھیں لے جاتا اور لاتا ہے۔ ہاتھی کو باوجود اس قدر جسامت کے ایک کمزور ہندوستانی ایسا مسخر کرتا ہے کہ نہایت اطاعت سے اُسکے کہنے کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ دُنیا کی تمام چیزیں انسان کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ انسان طبیعت یا نیچر کی

مقاومت کرتا ہے۔ تمام کائنات تسخیر کی اسیر ہیں۔ ممکن نہیں کہ مقتضائے طبیعت سے انحراف کریں۔ صرف انسان ہی طبیعت کی مقاومت کرتا ہے۔ طبیعت ہر چیز کو مرکزِ زمین کی طرف کھینچتی ہے۔ مگر انسان اپنے بنائے ہوئے وسائط کے ذریعے مرکز سے دور ہوا میں اُڑتا پھرتا ہے۔ طبیعت انسان کے سمندر میں جانے کی مانع ہے۔ انسان کشتی بنا کر بحرِ اعظم کے عین وسط میں سیر و حرکت کرتا ہے۔ وقِس علیٰ ذٰلک۔

یہ مطلب بہت طویل ہے۔ مثلاً انسان جنگل اور پہاڑ میں انجن چلاتا ہے اور مشرق و مغرب کے وقوعات کو ایک جگہ جمع کرتا ہے۔ یہ سب باتیں طبیعت کے مخالف ہیں۔ سمندر باوجود اس قدر عظمت کے ایک ذرہ بھر بھی طبیعت کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا۔ آفتاب ایسی بزرگی کے ہوتے ہوئے بھی ایک سوئی کے نوک بھر بھی طبیعت کے حکم سے پھر نہیں سکتا۔ اور انسان کی طبیعت و حرکت اُس کے خواص و احوال اور اُس کی شئون کو بالکل ادراک نہیں کر سکتا۔ پس انسان کے اِس چھوٹے سے جسم میں وہ کون سی قوت ہے جو اِن سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ کیا قوتِ قاہرہ ہے جس کے آگے سب چیزیں مقہور ہیں۔

ایک اور بات باقی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نئے فلاسفر کہتے ہیں کہ ہم نے انسان میں کبھی کوئی رُوح نہیں دیکھی۔ اور جسمِ انسان کی باریکیوں میں باوجود اپنی تحقیقات کے ہم نے کوئی رُوحانی طاقت احساس نہیں کی۔ وہ قوت جو محسوس نہیں بھلا کیسے خیال میں آ سکتی ہے؟

انہیں جواب دیتے ہیں کہ رُوحِ حیوان بھی محسوس نہیں ہے۔ اور اُس کی جسمانی قوتوں کے ذریعے ادراک نہیں ہو سکتی۔ پھر تم کس طرح رُوحِ حیوانی کا وجود ثابت کرتے ہو؟ بلاشبہ تمہارا استدلال آثار سے ہے۔ آثار دیکھ کر تم کہتے ہو کہ حیوان میں ایک ایسی قوت ہے جو نباتات میں نہیں ہے۔ یہ قوتِ حسّاسہ ہے یعنی دیکھنا سُننا وغیرہ وغیرہ۔ اِس سے تم نتیجہ نکالتے ہو کہ رُوحِ حیوانی ہے۔ اِسی طرح اُن آثار و دلائل سے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں استدلال کریں کہ ایک رُوحِ انسانی ہے۔ جس طرح حیوان میں ایسے آثار دیکھ کر جو نبات میں نہیں تم کہتے ہو کہ یہ قوائے حسّیہ رُوحِ حیوان کی خصوصیت ہیں اسی طرح تم انسان میں آثار و قویٰ و کمالات دیکھتے ہو جو حیوان میں نہیں پس نتیجہ نکالیں کہ انسان میں ایک قوت ہے جس سے حیوان محروم ہے۔

اگر ہم ہر غیر محسوس چیز کا انکار کریں تو ہمیں مسلّمہ وجود حقائق کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ مثلاً مادۂ ایثر محسوس نہیں لیکن محقق الوجود ہے یعنی اُس کا ہونا سب نے مان لیا ہے۔ قوۂ جاذبہ محسوس نہیں مگر مسلّم الوجود ہے۔ اُن کے وجود کا پتہ ہم کس طرح لگاتے ہیں؟ اُن کے آثار سے۔ مثلاً روشنی مادۂ ایثر کی تموجات سے

پیدا ہوتی ہے۔ پس ان تموجات سے مادۂ اثیر کے وجود کا پتہ لگاتے ہیں۔

(۲مط)

نشو و ترقیِ عالمِ انسان

سوال

عالمِ وجود کی نشو و ترقی کے مسئلہ میں جو یورپ کے بعض فلاسفروں کی رائے ہے اس کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب

اس مسئلہ میں ایک روز پہلے بھی بات چیت ہو چکی ہے۔ اب پھر گفتگو کرتے ہیں۔ آخرش یہ مسئلہ اصالتِ نوع اور اس کے نہ ہونے پر ختم ہوگا یعنی کیا نوعیتِ انسان اس کے شروع سے ہے یا بعد میں حیوان سے متفرّع ہوئی ہے۔ یورپ کے بعض فلاسفروں کا خیال ہے کہ نوع کے لئے نشو و ترقی بلکہ تغیّر و تبدّل بھی ممکن ہے۔ اور اس دعوے کے ثبوت میں جو دلیلیں وہ دیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ علمِ طبقاتِ ارض کے ذریعے تحقیق و تدقیق کرنے سے ہمیں معلوم ہوا کہ نبات حیوان سے پہلے اور حیوان، انسان سے پہلے وجود میں آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نبات و حیوان دونوں کی جنس بدل گئی ہے۔ کیونکہ زمین کے بعض طبقات میں ایسی نباتات ملی ہیں جو پرانے وقتوں میں تھیں اور اب نہیں ہیں۔ یعنی وہ ترقی کرکے زور دار ہو گئیں اور ان کی شکل و ہیئت بدل گئی۔ لہٰذا نوع بدل گئی۔ اسی طرح زمین کے بعض طبقات میں حیوانات کے بعض انواع ہیں جو بدل گئے ہیں۔ ان حیوانات میں سے ایک سانپ ہے۔ جس کے اعضاء میں ایسے نشانات موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایک وقت سانپ کے پاؤں تھے۔ لیکن مرورِ زمانہ سے یہ عضو معدوم ہو گیا ہے۔ مگر آثار باقی و برقرار ہے۔ اسی طرح انسان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسا نشان ہے جو ثابت کرتا ہے کہ انسان بھی دوسرے حیوانات کی مانند دُم رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے آثار باقی ہیں۔ ایک وقت یہ عضو مفید تھا۔ مگر انسان جب ترقی کر گیا تو یہ عضو بے کار ہو گیا۔ اسلئے بتدریج معدوم ہو گیا۔ سانپ نے بھی چونکہ زیرِ زمین رہنا شروع کیا۔ اور پیٹ کے بل چلنے والے حیوانوں میں سے ہو گیا۔ پاؤں کا محتاج نہ رہا۔ اس لئے پاؤں معدوم ہو گئے مگر ان کے نشان باقی ہیں۔ ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اعضاء کے نشانات کا ہونا اعضاء کے ہونے کا

ثبوت ہے اور اب بے فائدہ ہو جانے کے باعث بتدریج مفقود ہو گئے ہیں، چونکہ ان اعضاء کا اب کچھ فائدہ اور کچھ کام نہ تھا، اِس لئے لازماً اعضائے کامل باقی رہ گئے اور غیر لازمی اعضا تغیرِ نوع کے سبب بتدریج زائل ہو گئے ہیں مگر اثر باقی ہے۔

اِس کا اوّل جواب تو یہ ہے کہ حیوان کا انسان سے پہلے وجود میں آنا نوع کی ترقّی اور تغیر و تبدّل کی دلیل نہیں کہ انسان عالمِ حیوان ہی عالمِ انسان میں آیا ہے۔ کیونکہ اِن مختلف تکوّنات کا علیٰحدہ علیٰحدہ حدوث مسلّم ہے یہ ہو سکتا ہے کہ انسان حیوان کے بعد پیدا ہوا ہو۔ جیساکہ ہم عالمِ نباتات میں ملاحظہ کرتے ہیں کہ مختلف درختوں کے پھل سب ایک دفعہ ہی پیدا نہیں ہوتے، بلکہ بعض پہلے اور بعض پیچھے پھلتے ہیں، یہ تقدّم اِس بات کی دلیل نہیں کہ اِس درخت کا یہ آخری پھل اُس درخت کے پہلے پھل سے حاصل ہوا ہے۔

دوم اِن چھوٹے چھوٹے نشانات اور اجزائے اثریہ میں ممکن ہے کوئی حکمت مخفی ہو جس سے انسانی عقلیں ابھی مطلع نہیں ہوئیں۔ دُنیا میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جن کی حکمت ابھی تک غیر معلوم ہے۔ جیساکہ علم فزیالوجی یعنی تشریح الاعضا میں مذکور ہے کہ حیوانات کے رنگوں میں اور انسان کے بالوں کے رنگوں میں اختلاف کا سبب ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ نہ ہی لبوں کے سُرخ ہونے کی علت اور پرندوں کے رنگوں کے مختلف ہونے کی حکمت ابھی تک معلوم ہوئی۔ یہ باتیں ابھی تک مخفی و مستور ہیں۔ مگر آنکھ کی پُتلی کی سیاہی کی حکمت معلوم ہو گئی ہے کہ آفتاب کی شعاعوں کو جذب کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ اگر سادہ یا سفید ہوتی تو آفتاب کی روشنی کو جذب نہ کر سکتی۔ پس جبکہ اِن مذکورہ اُمور کی حکمت مجہول ہے تو ممکن ہے کہ حیوان اور انسان میں اجزای اثریہ کی حکمت و علت بھی غیر معلوم ہو۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی حکمت ہے۔ اگرچہ وہ حکمت اِس وقت معلوم نہیں۔

سوم۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک وقت بعض حیوانات حتّٰی کہ خود انسان بھی ایسے عضو رکھتے تھے جو اب زائل ہو گئے ہیں، تو بھی یہ دلیل نوع کی تغیر و ترقی کے لئے کافی نہیں ہے، کیونکہ انسان انعقادِ نُطفہ کے شروع سے درجۂ بلوغ پر پہنچنے تک مختلف شکلیں اور ہیئتیں بدلتا ہے۔ اُس کی صورت، ہیئت اور شکل اور اس کا رنگ بالکل بدلتا جاتا ہے۔ یعنی ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں اور ایک شکل سے دوسری شکل میں جاتا ہے۔ باایں ہمہ انعقادِ نطفہ کے شروع ہی سے نوعِ انسان ہوتا ہے۔ یعنی نطفۂ انسان ہوتا ہے۔ نہ کہ نطفۂ حیوان۔ پہلے مخفی تھا۔ پھر ظاہر و آشکار ہوا۔ مثلاً ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک وقت انسان حیوان سے مشابہت رکھتا تھا۔ اور اب ترقی کر کے تغیر ہو گیا ہے، اگر بالفرض اُسے مان بھی لیا جائے تب بھی یہ بات تغیرِ نوع کی دلیل نہیں ہوتی۔ بلکہ جیسا اوپر ذکر ہوا یہ نطفۂ انسان کے تغیر و تبدیل کی

مانند ہے، حتیٰ کہ وہ درجۂ رُشد و کمال کو پہنچتا ہے۔

ہم ذرا زیادہ واضح کرکے بیان کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ ایک وقت انسان چار ہاتھ اور پیر پر چلتا تھا یا کہ دُم رکھتا تھا تو یہ تغیر و تبدل ایسا ہی ہے جیسے ماں کے رحم میں جنین کا تغیر و تبدل ہے۔ جو اگرچہ ہر طرح سے تغیر ہوتا اور نشو و ترقی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس ہیئتِ تامہ تک پہنچتا ہے۔ مگر شروع ہی سے نوعِ مخصوص تھا۔ چنانچہ عالمِ نبات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اصلی نوعیتِ فصلیہ تبدیل نہیں ہوتی۔ مگر ہیئت رنگ، جسمانیت بدلتے جاتے ہیں بلکہ ترقی بھی حاصل کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح رحمِ مادر میں انسان ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں بدلتا اور ترقی کرتا ہے اور پھر بھی شروع ہی سے نطفہ نوعِ انسان ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان تکوّن کے شروع سے رحمِ عالم میں بھی نوعِ ممتاز یعنی انسان تھا، اور بتدریج ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں بدلتا رہا۔ پس یہ تغیر ہیئت ترقیٔ اعضاء اور نشو و نما اصالتِ نوع کی مانع نہیں ہوتی۔ یہ تو اُس حالت میں ہے جب ہم انواع کی نشو و ترقی بالفرض تسلیم بھی کرلیں، حالانکہ انسان شروع ہی سے اس ہیئت اور ترکیب کاملہ میں تھا اور صوری و معنوی کمالات کے حاصل کرنے کی استعداد رکھتا تھا۔ اور (نَعْمَلَنَّ الانسانَ علیٰ صورتنا ومثالنا) تھا۔ انتہیٰ یہ ہے کہ اَب خوشتر، ظریف تر اور خوبصورت تر ہوگیا ہے۔ اور تمدن کے سبب جنگلی حالت سے باہر آگیا ہے۔ اُن جنگلی پھلوں کی طرح جو باغبان کی تربیت کے سبب خوش تر اور میٹھے ہو جاتے ہیں اور زیادہ لطافت و طراوت پاتے ہیں۔ عالمِ انسان کے باغبان انبیائے الٰہی ہیں ۞

(ن)

انسان کے اصل اور مبدأ کے بارے میں رُوحانی دلیلیں

جو دلیلیں ہم نے اب تک اصلیتِ نوعِ انسان کے بارہ میں دیں عقلی تھیں۔ اَب رُوحانی دلیلیں دیتے ہیں۔ اور یہی اصلی دلیلیں ہیں۔ کیونکہ جس طرح ہم نے عقلی دلیلوں سے خدا کے ہونے کو ثابت کیا، اسی طرح عقلی دلیلوں سے ثابت کردیا کہ انسان شروع ہی سے انسان تھا، اور اس کی نوع قدیم سے ہے۔ اَب رُوحانی دلیلیں دیتے ہیں کہ وجودِ انسان یعنی نوعِ انسان لازم الوجود ہے۔ انسان کے بغیر خدائی کمالات جلوہ نما نہیں ہوسکتے۔ مگر یہ دلیلیں رُوحانی ہونگی عقلی نہیں۔

ہم نے بار بار دلائل و براہین سے ثابت کردیا ہے کہ انسان اشرفِ ممکنات اور جامعِ جمیعِ کمالات ہے

یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام کائنات و موجودات تجلّیِ الٰہی کے جلوہ گاہ ہیں یعنی خدا کی اُلوہیت کے آثار تمام موجودات و کائنات کے حقائق سے ظاہر ہیں۔ جیسا کہ کرۂ ارض آفتاب کی شعاعوں کا جلوہ گاہ ہے۔ یعنی نور و حرارت و تاثیرِ آفتاب کرۂ ارض کے تمام ذرّات سے ظاہر و عیاں ہیں۔ اِسی طرح اِس فضائے نامتناہی میں تمام کائناتِ عمومیہ کے ذرّات کا ہر ایک ذرّہ کمالاتِ ربّانی میں سے ایک کمال ظاہر کرتا ہے۔ کوئی چیز بھی محروم نہیں ہے۔ کوئی آیت رحمتِ خدا ہے یعنی خدا کی رحمت کو ظاہر کرتی ہے۔ کوئی آیت قدرتِ خدا ہے۔ کوئی آیت عظمتِ خدا ہے۔ کوئی آیتِ عدلِ خدا ہے، کوئی آیتِ ربّانیتِ خدا ہے یعنی پرورش کرتی ہے۔ کوئی آیت کرمِ خدا ہے۔ کوئی آیت بصرِ خدا ہے۔ کوئی آیتِ سمعِ خدا ہے۔ کوئی آیتِ علمِ خدا ہے۔ کوئی آیت نعمتِ خدا ہے۔ وقِس علی ذٰلک۔ مُراد یہ ہے کہ ہر ایک کائن لابُد تجلّیِ الٰہی کا جلوہ گاہ ہے۔ یعنی کمالاتِ الٰہیہ اُس میں ظاہر اور متجلّی ہیں مثلاً آفتاب اِس صحرا اور اِس دریا میں۔ اِن درختوں، پھلوں، شگوفوں میں، الغرض زمین کی کُل اشیاء میں جلوہ نما ہے۔

فی الحقیقت اِس دُنیا یعنی موجودات کا ہر کائن اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر حقیقت ایک حقیقتِ جامعۂ کُلّیہ ہے اور تمام کمالاتِ ربّانی کی تجلّی گاہ ہے۔ یعنی ہر ایک اسم اور ہر ایک صفت اور ہر ایک کمال جو ہم خدا کے بارے میں ثابت کرتے ہیں اُس کی ایک ایک آیت انسان میں موجود ہے۔ اگر کوئی صفت انسان میں موجود نہ ہوتی تو وہ اُس کمال کا تصوّر نہ کرسکتا۔ اور اُس کے سمجھنے سے محروم رہتا۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ خدا بصیر ہے، یہ آنکھ اُس کے بصر کی آیت ہے۔ اگر یہ بصر انسان میں نہ ہوتی تو ہم خدا کے بصیر ہونے کا کیسے تصوّر کرسکتے تھے۔ کیونکہ اَکمہ یعنی مادرزاد اندھا بصارت کا تصوّر نہیں کرسکتا۔ مادرزاد بہرہ سمع کا تصوّر نہیں کرسکتا۔ رُوحانی مُردہ رُوحانی زندگی کا تصوّر نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ربوبیتِ الٰہیہ جو تمام کمالات کی مستجمع ہے حقیقتِ انسانی میں متجلّی ہے یعنی ذاتِ احدیت نے جو تمام کمالات کی مستجمع ہے اِس مقام سے حقیقتِ انسانی میں تجلّی فرمائی ہے۔ یا یوں کہو کہ شمسِ حقیقت اِس آئینہ میں چمک رہا ہے۔ اِسی لئے انسان ایک کامل آئینہ ہی جو آفتابِ حقیقت کے سامنے ہے اور اُس کا جلوہ گاہ ہے۔ کمالاتِ ربّانی کی تجلّی حقیقتِ انسان سے ظاہر ہی اِسی لئے وہ خلیفۃ اللّٰہ و رسول اللّٰہ ہے۔ اگر انسان نہ ہوتا تو تمام عالَم وجود بھی بے فائدہ ہوتا۔ کیونکہ وجود کا مقصد یہی ہے کہ کمالاتِ الٰہیہ ظاہر ہوں۔ پس یہ ممکن نہیں کہ ایک وقت ایسا ہو جب انسان نہ تھا۔ نہایت یہ ہے کہ یہ کرۂ زمین نہ تھا، اور اُس کے شروع ہی میں انسان اُس میں پیدا نہ ہو گیا تھا۔ مگر یہ مظہریتِ کاملہ یعنی انسان اوّلِ لا اوّل سے تھا اور آخرِ لا آخر تک رہیگا۔ یہ انسان جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں اس سے ہر انسان مقصد نہیں۔ بلکہ ہماری مُراد انسانِ کامل ہے۔ درخت کا سب سے

شریف حصّہ اُس کا پھل ہے۔ اور یہی اُس کا مقصدِ اصلی ہے۔ اگر درخت پھل نہ دے تو بے کار ہے۔ پس ممکن نہیں کہ ایسا تصوّر بھی کر سکیں کہ ایک وقت عالمِ وجود میں خواہ عُلوی ہو یا سفلی۔ گدھا۔ گائے چوہا اور بلّی تو تھے مگر انسان نہ تھا۔ ایسا تصوّر باطل ہے۔ مہمل ہے۔ حرفِ حق آفتاب کی طرح روشن ہے

یہ رُوحانی دلیل ہے، مادہ پرستوں کے لئے ابتداء میں یہ دلیل نہیں دی جاسکتی۔ پہلے عقلی دلیل دے کر پھر رُوحانی دلیل دینی چاہئے

۳۱

کیا انسانی رُوح وعقل اَبدی ہیں؟

سوال

کیا انسان ابتداء ہی میں عقل و رُوح رکھتا تھا یا اُن کا ظہور اس کے نموّ تدریجی کے ذریعے ہوا؟

جواب

اِس کُرۂ زمین پر نوعِ انسان کی ابتدا اُسی طرح ہوئی ہے جس طرح ماں کے پیٹ میں تکوّنِ انسان ہوتا ہے رحم مادر میں پیدا ہونے تک نطفہ بتدریج نشو و نما پاتا ہے اور پھر پیدا ہونے کے بعد بڑھتا اور ترقّی کرتا ہے، حتیٰ کہ رُشد و بلوغ کے درجے تک پہنچتا ہے۔ اگرچہ عقل و روح کے آثار بچپن ہی سے انسان میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن رتبۂ کمال میں نہیں ہوتے۔ ناقص ہوتے ہیں۔ جب وہ بلوغ کو پہنچتا ہے تو عقل و رُوح نہایت کمال سے ظاہر و باہر ہوتے ہیں۔

اِسی طرح انسان تکوّن کے وقت رحم دنیا میں پہلے پہل نطفہ کی مانند تھا۔ پھر بتدریج مراتب میں ترقّی کرتا اور نشو و نما پاتا ہوا رتبۂ بلوغ تک پہنچا۔ رتبۂ بلوغ میں عقل و رُوح نہایت کمال کے ساتھ انسان سے ظاہر ہوئیں۔ ابتدائے تکوّن کے وقت بھی عقل و رُوح انسان میں موجود تھیں۔ مگر مخفی تھیں۔ پھر ظاہر ہوگئیں عالمِ رحم میں بھی نطفہ میں عقل و رُوح موجود ہیں مگر مکتوم ہیں۔ پوشیدہ ہیں۔ بعد میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک بیج کی مانند کہ درخت اس میں موجود ہے۔ مگر مکتوم و مستور ہے۔ جب بیج نشو و نما پاتا ہے تو درخت پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اِسی طرح تمام کائنات کی نشو و نما بتدریج ہوتی ہے۔ یہ قانونِ کلّی الٰہی اور نظمِ طبیعی ہے۔ بیج ایک مرتبہ ہی درخت نہیں بن جاتا۔ نہیں بلکہ یہ سب بتدریج نشو و نما پا کر

حدِ کمال تک پہنچتے ہیں - تمام کائنات کلیات ہوں یا جزئیات اول سے کامل پیدا ہوئی ہیں نہایت یہ ہے کہ کمالات بتدریج ظاہر ہوتے ہیں، قانونِ الٰہی ایک ہے - ترقیاتِ وجود ایک ہیں۔ نظامِ الٰہی ایک ہے۔ کائنات صغیرہ ہوں یا کبیرہ سب ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام کے تحت ہیں ہر بیج میں شروع ہی سے تمام کمالاتِ نباتیہ موجود ہیں۔ مگر ظاہر نہیں ۔ بتدریج ظاہر ہوتے ہیں مثلاً بیج سے پہلے تنہ پھر شاخیں پھر پتے پھر شگوفے پھر پھل ظاہر ہوتے ہیں۔ تکون کی ابتدا میں یہ تمام چیزیں دانہ میں بالکل بالقوۃ موجود ہیں۔ اگرچہ ظاہر نہیں ہیں۔ اسی طرح نطفہ شروع ہی سے تمام کمالات مثلاً روح وعقل اور بصر و شامہ و ذائقہ الغرض تمام قوتوں کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر نہیں ہوتیں۔ بہ آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح کرۂ ارض اول ہی سے تمام عناصر اور مواد و معادن اور اجزاء وترکیب سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں سے ہر ایک ظاہر ہوا اور ہو رہا ہے۔ پہلے جماد پھر نبات پھر حیوان اور بعد ازاں انسان ظاہر ہوا۔ مگر شروع ہی سے یہ اجناس و انواع، کمونِ کرۂ ارض میں موجود تھیں۔ بعدہٗ بتدریج ظاہر ہوئیں۔ کیونکہ الٰہی قانونِ اعظم اور عمومی نظامِ طبیعی تمام کائنات پر محیط ہے۔ اور سب کائنات اس کے ماتحت ہیں پس جب ہم اس نظامِ عمومی کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کائن بھی محض تکون کے وقت ہی حدِ کمال تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ بتدریج نشو و نما پاکر درجۂ کمال تک پہنچتا ہے

(الف ب)

جسم میں رُوح کے ظہور کی حکمت

سوال

جسم میں رُوح کے ظاہر ہونے کی کیا حکمت ہے؟

جواب

جسم میں رُوح کے ظاہر ہونے کی یہ حکمت ہے کہ رُوحِ انسانی خُدا کی امانت ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ تمام مراتب کی سیر کرے۔ کیونکہ مراتب وجود میں سیر و حرکت کمالات حاصل کرنے کا سبب ہے جیسے انسان کی مختلف ممالک واقالیم میں باقاعدہ و مُرتب سیر و حرکت اکتساب کمال کا سبب ہوتی ہے۔

کیونکہ مختلف مقامات کو دیکھتا۔ نظاروں کا مزہ اٹھاتا ہے۔ ملکوں کی سیر کرتا ہے۔ دوسری قوموں کے حالات و اطوار کا مشاہدہ کرتا ہے۔ دوسرے ممالک کے جغرافیہ کا عملی سبق حاصل کرتا ہے۔ وہاں کی صنعتوں اور عجائبات کا پتہ لگاتا ہے۔ اُن کے باشندوں کے رویّہ و سلوک اور اُن کی عبادات سے واقف ہوتا ہے۔ زمانہ کے تمدّن اور ترقیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر مملکت کی سیاست و حکومت اور استعداد و قابلیت سے آگاہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح رُوحِ انسانی جب مراتبِ وجود کی سیر کرتی ہے اور ہر رُتبہ و مقام کی مالک بنتی ہے حتّیٰ کہ جب رُتبۂ جسد کی مالک ہوتی ہے تو اکتسابِ کمالات کرتی ہے۔ علاوہ ازیں لازم ہے کہ کمالاتِ رُوح کے آثار اِس دنیا میں ظاہر ہوں تاکہ عالمِ آفرینش نتیجۂ نامتناہی حاصل کرے اور یہ جسم جان پائے۔ اور فیوضاتِ ربّانی جلوہ نما ہوں۔ مثلاً آفتاب کی شعاعوں کے لئے لازم ہے کہ زمین پر چمکیں اور اُن کی حرارت کائناتِ زمین کی تربیت کرے۔ اگر آفتاب کی شعاعیں اور حرارت زمین پر نہ ہو تو زمین بے کار اور فضول رہے۔ اِسی طرح اگر کمالاتِ رُوح اِس دُنیا میں ظاہر نہ ہوں تو یہ دُنیا سراسر ایک تاریک جہانِ حیوانی بن جاوے۔ ہیکلِ جسمانی میں رُوح کا ظہور اِس دُنیا کو نورانی بناتا ہے۔ رُوحِ انسان، جسدِ انسان کی زندگی کا باعث ہے۔ اِسی طرح دُنیا بمنزلہٗ جسد اور انسان بمنزلہٗ رُوح ہے۔ اگر انسان نہ ہو اور کمالاتِ رُوح کا ظہور نہ ہوتا اور عقل کے انوار اِس دُنیا میں جلوہ نما نہ ہوتے تو یہ دُنیا ایک بے جان جسم کی طرح ہوتی۔ اِسی طرح یہ دُنیا ایک درخت کی مانند ہے اور انسان اُس کا ثمر ہے۔ اگر ثمر نہ ہو تو درخت بے کار ہے۔

علاوہ ازیں یہ اعضاء۔ اجزاء، و ترکیب جو انسان کے جسم میں پائی جاتی ہے یہ رُوح کی جاذب اور مقناطیس ہے۔ اِس لئے رُوح کا ظہور لابُد ہے۔ مثلاً آئینہ جب صاف ہوتا ہے تو لازماً آفتاب کی روشنی کو جذب کرتا ہے اور روشن ہوتا ہے اور بڑے بڑے عکس اُس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ یہ عناصرِ کونیہ جب نظمِ طبیعی کے مطابق نہایت مضبوطی سے جمع اور مرکّب ہوتے ہیں تو رُوح کے لئے مقناطیس بن جاتے ہیں اور رُوح تمام کمالات کے ساتھ اُن میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ اَب اِس جگہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آفتاب کی روشنی کو آئینہ میں اُترنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ تمام حقائق اشیاء کا جسمانی ہوں یا رُوحانی باہمی ارتباط اِس بات کا مقتضی ہے کہ جب آئینہ صاف ہوتا ہے اور آفتاب کے سامنے آتا ہے تو آفتاب کی روشنی اُس میں ظاہر ہوتی ہے۔ اِسی طرح عناصر جب بہترین انتظام و ترتیب اور کیفیت و ترکیب کے ساتھ امتزاج پاتے ہیں تو رُوحِ انسان اُن میں ظاہر و آشکار ہوتی ہے۔ ذالک تقدیر العزیز العلیم ایسا ہی اُس غالب اور دانا خدا کا مقدر کیا ہوا امر ہے۔

(نبج)

حق کا خلق سے کیسا تعلق ہے؟

سوال

خدائے بلند و برتر کا تعلق کائنات کے ساتھ کیسا ہے؟

جواب

حق کا خلق کے ساتھ وہی تعلق ہے جو موجد کا موجود کے ساتھ ہے یا جیسا آفتاب کا ممکنات کے اجسامِ مظلمہ کے ساتھ ہے۔ صانع کا مصنوعات کے ساتھ ہے۔ آفتاب اپنی حیز ذات میں اُن اجسام سے مقدس ہے جنھیں یہ روشن کرتا ہے۔ کیونکہ وہ بذاتِ خود روشن ہے اور کُرۂ زمین سے بالکل مقدس و مستغنی ہے۔ اگرچہ کرۂ ارض آفتاب کے زیرِ تربیت اور اُس کے انوار سے مستفیض ہوتا ہے لیکن آفتاب اور شعاع اس سے مقدس ہیں۔ اگر آفتاب نہ ہوتا تو کرۂ ارض اور تمام موجوداتِ زمینی ظاہر نہ ہوتیں۔

خلق کا حق سے قیام، قیامِ صدوری ہے، یعنی خلق حق سے صادر ہوئی ہے ظاہر نہیں ہوئی تعلق صدوری رکھتی ہے تعلق ظہوری نہیں رکھتی۔ انوارِ آفتاب آفتاب سے صادر ہوتے ہیں۔ ظاہر نہیں ہوتے۔ تجلیِ صدوری ایسی ہی ہے جیسے نیرِ آفاق سے شعاع کی تجلی یعنی شمسِ حقیقت کی ذاتِ مقدس تجزّی نہیں پاتی اور رتبۂ خلق میں تنزّل نہیں کرتی۔ جیساکہ قرصِ آفتاب کرۂ ارض میں تجزّی و تنزّل نہیں پاتا۔ بلکہ آفتاب کی روشنی جو اُس کا فیض ہے آفتاب سے صادر ہوتی ہے اور تمام تاریک اجسام کو روشن کرتی ہے۔ مگر تجلیِ ظہوری ایسی ہے جیسے بیج سے شاخوں، پتّوں، شگوفوں اور پھلوں کا ظاہر ہونا۔ بیج بذاتِ خود شاخیں اور پھل بن جاتا ہے۔ اُس کی حقیقت شاخ، پتّوں اور میووں میں تنزّل کرتی ہے۔ اس قسم کی تجلّی بارِیتعالیٰ کے لئے سراسر نقص اور ممتنع و محال ہے۔ کیونکہ پھر یہ لازم آتا ہے کہ قِدمِ محض صفتِ حدوث سے متصف ہو۔ غنائے صرف فقرِ محض بنے اور حقیقتِ وجود عدم ہو جائے۔ یہ باتیں بالکل محال ہیں۔

لہٰذا سب کائنات حق سے صادر ہوئی ہیں یعنی وہ جس سے کہ اشیا تحقّق اور ممکنات وجود پاتی ہیں حق یعنی خدا ہے۔ سب سے پہلے جو چیز خدا سے ظاہر ہوئی وہ حقیقتِ کلیہ ہے جسے پہلے فلاسفروں کی اصطلاح میں عقلِ اوّل کہتے ہیں، اور اہلِ بہآ کی اصطلاح میں مشیتِ اولیہ نام ہے۔ یہ صدور عالمِ حق میں من حیث الفعل زمان و مکان میں محدود نہیں ہے۔ لا اوّل لہٗ و لا آخر لہٗ ہے۔ خدا کے لئے اوّل اور آخر یکساں ہے

قِدمِ حق قدم ذاتی و زمانی ہے۔ حدُوثِ اِمکان حدوثِ ذاتی ہے۔ زمانی نہیں۔ جیسا پہلے ہم نے ایک دن نہار کے وقت بیان کیا تھا، عقلِ اوّل کی لااوّلیت اُسے قدم میں حق کا شریک نہیں بناتی۔ کیونکہ حقیقتِ کُلیہ کا وجود وجودِ خدُا کے مقابل سراسر عدم ہے۔ اس میں یہ طاقت نہیں کہ قِدم میں خدا کا شریک و مثیل ہو۔

یہ مسئلہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اشیاء کے وجود اور زندگی سے مُراد ترکیب ہے۔ اور موت کا مطلب تحلیل ہے۔ مادّہ اور عناصرِ کُلیہ بالکل محو و معدوم نہیں ہوتے۔ ان کے انعدام سے مُراد انقلاب ہے۔ مثلاً انسان جب مر جاتا ہے تو خاک ہو جاتا ہے۔ بالکل نابود نہیں ہو جاتا۔ پھر بھی وجودِ خاکی رکھتا ہے۔ انقلاب واقع ہوا ہے اور اس ترکیب پر تحلیل عارض ہو گئی ہے۔ اِسی طرح تمام دوسری کائنات کا انعدام ہے۔ کیونکہ وجود عدمِ محض نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی عدمِ محض وجود پا سکتا ہے۔

(نل)

قیامِ ارواح بحق

سوال

تورات میں لکھا ہے کہ "خدُا نے آدم کے جسم میں رُوح پھونکی"۔ اِس کے کیا معنی ہیں؟

جواب

یاد رکھئے۔ قیام دو قسم کا ہے۔ (۱) قیام و تجلّیِ صدوری (۲) قیام و تجلّی ظہوری۔

قیامِ صُدوری ایسا ہے جیسے صنعت کا قیام صانع سے۔ کتابت کا کاتب سے۔ کتابت کاتب سے صادر ہوتی ہے۔ بات بولنے والے سے صادر ہوتی ہے۔ اِسی طرح یہ رُوحِ انسان خدُا سے صادر ہوتی ہے۔ ظاہر نہیں ہوتی۔ یعنی یہ نہیں کہ حقیقتِ اُلوہیت (خدُا) کا ایک جُز علیحدہ ہو کر آدم کے جسم میں داخل ہوا تھا۔ بلکہ جس طرح بات بولنے والے سے صادر ہوتی ہے، رُوح خدُا سے صادر ہوئی اور جسمِ آدم میں ظاہر ہوئی۔

قیامِ ظہوری سے مُراد حقیقتِ شئ کا دوسری صورتوں میں ظاہر ہونا ہے۔ مثلاً اِس درخت کا قیام اِس کے بیج سے ہوا ہے۔ اِس پھول کا قیام اِس پھول کے بیج سے ہوا۔ یعنی خود بیج شاخوں،

پتّوں اور پھول کی صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ اِس قسم کے قیام کو قیامِ ظہوری کہتے ہیں۔

اَرواحِ انسانی کا خُدا سے قیام، قیامِ صدوری ہے۔ جیسا کہ بات کا بولنے والے سے اور کتابت کاتب سے۔ یعنی بولنے والا خود بات نہیں بن جاتا۔ یا کاتب خود کتابت نہیں ہو جاتا، اُن کا قیام، قیامِ صدوری ہے، کیونکہ بولنے والا کمال قوّت و قدرت میں ہے۔ مگر بات اُس سے صادر ہوتی ہے۔ جیسے فعل فاعل سے ظاہر ہوتا ہے۔ ناطقِ حقیقی ذاتِ احدیت ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہا ہے، جس میں نہ تغییر و تبدیل ہی ہے اور نہ تحویل و انقلاب۔ وہ ابدی سرمدی ہے۔ لہٰذا رُوحِ انسانی کا خُدا سے قیام، قیامِ صدوری ہے۔ پس تورات میں جو فرمایا ہے کہ خُدا نے آدم میں رُوح پھونکی۔ یہ رُوح مانندِ نُطق ہے۔ جس نے ناطقِ حقیقی سے صادر ہو کر حقیقتِ آدم میں تاثیر دکھائی۔

قیامِ ظہوری سے (جبکہ مقصد تجلّی ہو تجزّی نہ ہو) مُراد جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رُوح القدس اور کلمہ کا قیام ہے۔ جو خُدا سے ہوتا ہے۔ انجیلِ یوحنا میں فرماتا ہے "ابتداء میں کلام تھا۔ کلام خُدا کے ساتھ تھا۔ پس رُوح القدس اور کلمہ تجلّیِ خُدا ہے۔ رُوح اور کلمہ سے مُراد کمالاتِ الٰہیہ ہیں جو حقیقتِ مسیح میں جلوہ نما ہوئے۔ اور یہ کمالات خُدا کے ساتھ تھے آفتاب کی مانند جو آئینہ میں تمام ظہور کے ساتھ جلوہ نما ہو۔ کلمہ سے مُراد مسیح کا جسم نہیں۔ بلکہ اِس کا مقصد وہ کمالاتِ الٰہیہ ہیں جو مسیح میں ظاہر ہوئے۔ کیونکہ مسیح ایک مصفّا آئینہ کی طرح تھے، جو شمسِ حقیقت کے مقابل تھا۔ اور شمسِ حقیقت کے کمالات یعنی نور و حرارت اِس آئینہ میں ظاہر و عیاں تھے۔ جب ہم آئینہ میں نظر کرتے ہیں تو آفتاب کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آفتاب ہے۔ پس کلمہ اور رُوح القدس جس سے مُراد کمالاتِ الٰہیہ ہیں، تجلّیِ الٰہی ہے۔ یہی انجیل کی اِس آیۂ مُبارکہ کے معنی ہیں جو فرمایا کہ "کلمہ خُدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خُدا تھا" کیونکہ کمالاتِ الٰہیہ ذاتِ احدیت (خُدا) سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اور کمالاتِ عیسویہ کو کلمہ کہا ہے۔ کیونکہ کُل کائنات بمنزلہٗ حروف ہیں۔ حرف سے پورے پورے معنے حاصل نہیں ہوتے۔ لیکن کمالاتِ مسیحیہ، رتبۂ کلمہ میں ہیں۔ کیونکہ کلمہ سے پورے پورے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ چونکہ حقیقتِ مسیحیہ کمالاتِ الٰہی کا ظہور تھی اِس لئے کلمہ کی مانند تھی یعنی پورے پورے معانی کی جامع تھی۔ اس لئے اُسے کلمہ کہا ہے۔

یہ بھی یاد رکھئے کہ کلمہ اور رُوح القدس کا خدا سے جو تجلّیِ ظہوری کا قیام ہے اُس سے یہ گمان نہ ہو کہ خُدا جزء جزء ہو کر یا بٹ کر یا یہ کہ اپنی تقدیس و تنزیہہ کی بلندیوں سے گر کر نیچے آ گیا ہے۔ حاشا ثمّ حاشا۔ اگر ایک صاف و شفّاف آئینہ آفتاب کے سامنے ہو جائے تو آفتاب کے انوار، اُس کی حرارت اور صورت و مثال اُس آئینہ میں ایسی تجلّیِ ظہوری کرتے ہیں کہ اگر اُس صاف شفّاف آئینہ میں چمکتے ہوئے

اور ظاہر آفتاب کو دیکھنے والا کہے کہ یہ آفتاب ہے تو وہ سچا ہے۔ مگر آئینہ آئینہ ہے اور آفتاب آفتاب۔ شمسِ واحد اگرچہ متعدد آئینوں میں جلوہ نما ہوتا ہے، مگر پھر بھی واحد ہی رہتا ہے۔ یہ مقام نہ حلول کا ہے نہ دخول کا۔ نہ امتزاج کا نہ نزول کا۔ کیونکہ دخول و حلول و نزول و خروج و امتزاج اجسام کے لوازم و خواص ہیں۔ ارواح کے نہیں۔ پھر حضرتِ الوہیت (خدا) کی پاک و منزہ حقیقت کا تو ذکر ہی کیا۔ تبارك الله عن كلّ مالا ينبغى لتنزيهه وتقديسه وتعالىٰ علوًّا كبيرًا (اللہ پاک ہے اُن سب چیزوں سے جو اُس کی بلند و اعلیٰ تنزیہہ و تقدیس کے لائق نہیں)

شمسِ حقیقت جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ایک حالتِ واحد میں رہا ہے۔ اس میں نہ تغیر ہے نہ تبدل ہے اور نہ تحویل و انقلاب۔ وہ ازلی ہے۔ سرمدی ہے۔ مگر کلمۃ اللہ کی حقیقت مقدسہ صاف و لطیف آئینہ کی طرح ہے۔ اور نورانی ہے۔ حرارت اور نور اور صورت و مثال یعنی کمالاتِ شمسِ حقیقت اُس میں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ اسی لئے حضرت مسیح انجیل میں فرماتے ہیں "باپ بیٹے میں ہے"۔ یعنی شمسِ حقیقت اس آئینہ میں جلوہ نما ہے سبحان من اشرق علىٰ هذه الحقيقة المقدسة من الكائنات (تعریف اور پاکی اُس کی جو کائنات میں سے اس حقیقتِ مقدسہ پر چمکا۔

---

(۳۸)

عقل و رُوح و نفس میں کیا فرق ہے؟

جواب

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عام طور سے اَرواح پانچ قسموں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ رُوحِ نباتی، رُوحِ حیوانی، رُوحِ انسانی، رُوحِ ایمانی، رُوح القدس۔

رُوحِ نباتی قوتِ نامیہ ہے جو دوسری کائنات کی تاثیر سے بیج میں حاصل ہوتی ہے۔ رُوحِ حیوانی قوۃ جامعہ حساسہ ہے جو عناصر کی ترکیب و امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ ترکیب تحلیل ہو جاتی ہے تو یہ قوت بھی محو و فانی ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال اِس چراغ کی سی ہے کہ جب یہ تیل۔ بتی اور آگ جمع ہو کر ترکیب پاتی ہیں تو یہ چراغ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب یہ ترکیب تحلیل ہو جاتی ہے یعنی اجزائے مرکبہ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں تو یہ چراغ بھی خاموش ہو جاتا ہے۔

رُوحِ انسانی جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے نفسِ ناطقہ ہے۔ یہ دو نام یعنی رُوحِ انسانی اور نفسِ ناطقہ ایک ہی چیز کے نام ہیں۔ یہ رُوح جسے حکماء کی اصطلاح میں نفسِ ناطقہ کہتے ہیں دوسری کُل کائنات پر محیط ہے۔ اور بشری استطاعت کے مطابق حقائقِ اشیاء کا انکشاف کرتی ہے۔ ممکنات کے خواص و تاثیر اور موجودات کی کیفیت و خصائص پر اطلاع پاتی ہے۔ مگر جب تک رُوحِ ایمانی سے مؤید نہیں ہوتی اسرارِ الٰہیہ اور حقائقِ لاہوتیہ سے مطلع نہیں ہوتی۔ آئینہ کی مانند جو خواہ کتنا بھی صاف و لطیف و شفاف ہو پھر بھی انوار کا محتاج ہے۔ جب تک آفتابِ حقیقت کا پرتو اُس پر نہیں چمکتا اسرارِ الٰہی کا انکشاف نہیں کر سکتی۔

عقل رُوحِ انسانی کی قوت ہے۔ رُوح بمنزلہ چراغ ہے اور عقل بمنزلہ انوار جو چراغ سے چمکتے ہیں۔ رُوح بمنزلہ درخت ہے اور عقل مانندِ ثمر۔ عقل رُوح کا کمال اور اُس کی صفتِ متلازمہ ہے۔ جیسے شعاع جو آفتاب کا لزومِ ذاتی ہے۔

یہ بیان اگرچہ مختصر ہے مگر مکمل ہے۔ آپ اس میں غور کریں۔ انشاء اللہ اس کی تفاصیل سے مطلع ہو جائیں گے۔

(نو)

جسمانی قوتیں اور رُوحانی قوتیں

انسان میں بظاہر پانچ جسمانی قوتیں ہیں۔ جن کے ذریعے وہ ادراک کرتا ہے۔ یعنی ان پانچ قوتوں کے ذریعہ انسان کائناتِ جسمانیہ کو ادراک کرتا ہے۔ قوتِ باصرہ یعنی دیکھنے کی قوت سے محسوس ہونے والی صورتوں کا ادراک کرتا ہے۔ قوتِ سامعہ یعنی سُننے کی قوت جس سے سُننے کے قابل آواز کا ادراک کرتا ہے۔ قوتِ شامہ یعنی سونگھنے کی قوت جس کے ذریعے سونگھنے کے قابل چیزوں کا ادراک کرتا ہے۔ قوتِ ذائقہ یعنی چکھنے کی قوت جس کے ذریعہ چکھنے کے قابل چیزوں کا ادراک کرتا ہے اور قوتِ لامسہ یعنی چھونے کی قوت جو انسان کے تمام اعضاء میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور جس کے ذریعے چھو کر چیزوں کا ادراک کرتا ہے۔ یہ پانچوں قوتیں بیرونی چیزوں کا ادراک کرتی ہیں۔

اسی طرح انسان ایسی ہی رُوحانی قوتیں بھی رکھتا ہے۔ قوتِ متخیلہ یعنی خیال کرنے کی قوت

جو چیزوں کا خیال کرتی ہے۔ قوّتِ متفکّرہ یعنی سوچنے کی قوّت جو اُمور کی باریکیوں اور اُن کی حقیقتوں میں غور کرتی ہے۔ قوّتِ مدرکہ یعنی سمجھنے کی قوّت جو چیزوں کے حقائق کا ادراک کرتی ہے۔ قوّتِ حافظہ یعنی یاد رکھنے کی قوّت جو اِن سب کو جو انسان نے خیال کیا ہو، سوچا ہو اور سمجھا ہو یاد رکھتی ہے۔

اِن پانچوں ظاہری اور پانچوں باطنی قوّتوں کے درمیان رشتہ حسِ مشترک کہلاتا ہے۔ یعنی باطنی اور ظاہری قوّتوں میں ذریعہ کا کام کرتا ہے۔ اور ظاہری قوّتیں جو کچھ احساس کرتی ہیں اُنھیں پکڑ کر باطنی قوّتوں تک لے جاتا ہے۔ اِسے حسِ مشترک کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ظاہری اور باطنی قوّتوں میں مشترک ہے۔ مثلاً نظر جو ایک ظاہری قوّت ہے اِس پھول کو دیکھتی ہے۔ اور احساس کرتی ہے۔ اِس احساس کو حسِ مشترک باطنی قوّتوں تک لے جاتا ہے یعنی حسِ مشترک اِس مشاہدے کو قوّتِ خیال کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قوّتِ خیال اِس مشاہدے پہ تخیل و تصور کر کے قوّتِ متفکّرہ کے پاس پہنچاتی ہے۔ اور قوّتِ متفکّرہ اس پر غور کرتی ہے۔ اور اس کی حقیقت کو سمجھ کر قوّتِ مُدرکہ کے حوالے کرتی ہے جو اس کی حفاظت کرتی ہے۔ اور یہ قوّتِ حافظہ کے محافظ خانے میں محفوظ رہتا ہے۔ ظاہری قوّتیں پانچ ہیں۔ یعنی قوّتِ باصرہ۔ قوّتِ سامعہ۔ قوّتِ ذائقہ۔ قوّتِ شامّہ اور قوّتِ لامسہ۔ باطنی قوّتیں بھی پانچ ہیں۔ قوّتِ مشترکہ۔ قوّتِ متخیلہ۔ قوّتِ متفکّرہ۔ قوّتِ مدرکہ اور قوّتِ حافظہ۔

(ز)

انسان کے مختلف اخلاق

سوال

اخلاقِ انسانی کے اقسام اور انسانوں میں تفاوت و اختلاف کے اسباب کیا ہیں؟

جواب

انسان اخلاقِ فطری، اخلاقِ ارثی اور اخلاقِ اکتسابی کا مالک ہے۔ اخلاقِ اکتسابی تربیت سے حاصل ہوتے ہیں۔

اخلاقِ فطری۔ اگرچہ خدا کی آفرینش خالص نیک ہے۔ تو بھی انسان میں جو اخلاقِ فطری کا اختلاف ہے وہ تفاوتِ درجات کے سبب ہے۔ سب نہایت ہی عمدہ ہیں۔ مگر بحسبِ درجات و مراتب خوب و خوشتر ہیں۔ تمام انسان سمجھ اور استعداد رکھتے ہیں۔ مگر سمجھ اور استعداد و قابلیت سب میں یکساں نہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے مثلاً چند بچّے ایک ہی خاندان۔ ایک ہی جگہ اور ایک ہی مدرسہ میں ایک ہی معلم سے علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ

سب ایک ہی غذا کھاتے ہیں۔ ایک ہی آب وہوا میں پلتے ہیں۔ ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہیں اور ایک ہی طرح کا سبق پڑھتے ہیں۔ ان بچوں میں سے بعض ماہر فنون ہوجاتے ہیں۔ اور بعض متوسط اور بعض بالکل پھسڈی رہ جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل فطرت میں ہی درجات کا فرق موجود ہے اور استعداد وقابلیت کا تفاوت پایا جاتا ہے۔

یہ فرق ازروئے نیکی وبدی نہیں۔ بلکہ درجات کا فرق ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ میں ہے۔ دوسرا درمیانہ درجہ میں اور تیسرا ادنیٰ درجہ میں۔ مثلاً انسان وجود رکھتا ہے۔ حیوان ونبات وجماد بھی وجود رکھتے ہیں۔ مگر ان چاروں موجودات میں وجود مختلف ہیں۔ کہاں وجودِ انسانی اور کہاں وجودِ حیوانی۔ حالانکہ سب وجود کے مالک ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ وجود میں درجات کا فرق موجود ہے۔

اخلاقِ ارثی — اخلاقِ ارثی میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ مزاج کی قوت اور کمزوری پر موقوف ہے۔ یعنی ماں باپ اگر ضعیف المزاج ہوتے ہیں تو بچے بھی ویسے ہی ہوتے ہیں۔ اگر طاقتور ہوتے ہیں تو بچے بھی دلیر ہوتے ہیں۔ اسی طرح خون کی پاکیزگی بھی کامل اثر رکھتی ہے۔ کیونکہ پاک نطفہ جنسِ اعلیٰ کی مانند ہے جو نبات وحیوان میں بھی موجود ہے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں کہ وہ بچے جو ماں باپ کی کمزوری کے سبب کمزور و بیمار پیدا ہوتے ہیں قدرتاً جسمانی اور عصبی کمزوریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے بچے بے صبر۔ بے تحمل۔ ارادہ کے کچے۔ بے ہمت اور جلد باز ہوتے ہیں۔ کیونکہ کمزوری اور سستی اُنھیں ماں باپ سے ورثہ میں ملتی ہے۔

علاوہ ازیں بعض نسلوں اور خاندانوں پر ایک خاص عنایت ہوتی ہے۔ مثلاً خاندانِ ابراہیمی ایک خاص عنایت کا مالک تھا۔ کہ تمام انبیائے بنی اسرائیل اس خاندانِ ابراہیم سے پیدا ہوئے۔ خدا نے خاندانِ ابراہیم کو یہ خاص برکت بخشی تھی۔ حضرت موسیٰ باپ اور ماں کی طرف سے۔ حضرت مسیح ماں کی طرف سے۔ حضرت محمد اور حضرت اعلیٰ (حضرت باب) اور بنی اسرائیل کے تمام انبیا اور مظاہر مقدسہ اسی خاندان سے تھے۔ حضرت جمال مبارک (حضرت بہاء اللہ) بھی خاندانِ ابراہیمی سے ہیں۔ کیونکہ اسمٰعیل واسحٰق کے علاوہ حضرت ابراہیم کے اور فرزند بھی تھے۔ جو اُس زمانہ میں ممالکِ ایران و افغانستان کی طرف ہجرت فرما گئے تھے۔ حضرت جمال مبارک بھی اسی خاندان سے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ اخلاقِ ارثی بھی موجود ہیں۔ یہانتک کہ اگر اخلاق ملتے جلتے نہیں تو خواہ ایک شخص جسماً ایک خاندان سے ہے مگر رُوحاً اس خاندان سے شمار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً کنعان خاندانِ نوح کی گنا نہیں جاتا (دیکھو کتاب پیدائش باب ۹۔ آیت ۲۵)

اخلاقِ اکتسابی — اخلاق میں جو فرق ازروئے تربیت ہے وہ بہت بڑا ہے۔ کیونکہ تربیت کا اثر گہرا اور پائندہ ہوتا ہے۔ تربیت نادان کو دانا اور بزدل کو دلیر بنا دیتی ہے۔ تربیت ٹیڑھی شاخ کو سیدھی بناتی ہے

جنگلی اور پہاڑی کڑوے اور بدمزہ پھل تربیت سے میٹھے اور مزیدار ہو جاتے ہیں۔ پانچ پنکھڑیوں کا پھول تربیت سے سو پنکھڑیوں والا بن جاتا ہے۔ وحشی قوم تربیت سے متمدن ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ حیوان، تربیت سے انسان کی سی روش سیکھ لیتا ہے۔ تربیت کو نہایت ضروری سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ جس طرح عالمِ اجسام میں بیماریاں ایک دوسرے میں سرایت کرتی ہیں اسی طرح اخلاق ارواح و قلوب میں تیزی سے سرایت کرتے ہیں۔ تفاوتِ تربیت بہت بڑی چیز ہے اور بہت بڑا اثر رکھتی ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جب لوگوں کی استعداد اور ان کی قابلیت میں فرق ہے تو اس تفاوتِ استعداد کے سبب تفاوتِ اخلاق کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ درست نہیں۔ کیونکہ استعداد دو قسم کی ہے۔ استعداد فطری اور استعداد اکتسابی۔ استعداد فطری جو خدا کی پیدا کی ہوئی ہے خیر محض ہے۔ فطرت میں مطلقاً شر نہیں ہے۔ مگر استعدادِ اکتسابی شر کے پیدا ہونے کا سبب ہوتی ہے۔ مثلاً خدا نے تمام انسانوں کو اس طرح پیدا کیا اور ایسی قابلیت و استعداد دی کہ شہد اور شکر سے فائدہ اٹھائیں اور زہر سے نقصان پائیں اور ہلاک ہوں۔ یہ فطری استعداد و قابلیت خدا نے تمام نوعِ انسان کو یکساں عطا کی ہے۔ مگر انسان تھوڑا تھوڑا زہر کھانا شروع کرتا ہے۔ ہر روز زہر کی ایک مقدار استعمال کرتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی بڑھاتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر روز اگر ایک درہم افیون نہ کھائے تو ہلاک ہو جائے۔ اس طرح استعداد فطری بالکل برعکس ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ فطری استعداد و قابلیت، عادت و تربیت کے تفاوت سے کس قدر بدل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بالکل برعکس ہو جاتی ہے۔ شریر لوگوں پر ان کی فطری قابلیت و استعداد کے سبب اعتراض نہیں کیا جاتا بلکہ اعتراض استعداد و قابلیتِ اکتسابی کے سبب ہوتا ہے۔

فطرت میں شر نہیں۔ سراسر نیکی ہی نیکی ہے حتیٰ کہ بعض صفات و عادات جو بعض انسانوں میں لازم و ملزوم ہیں اور جو بظاہر مذموم دکھائی دیتی ہیں حقیقت میں بُری نہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن میں بچہ دودھ پیتے ہوئے لالچ اور قہر و غضب کے آثار ظاہر کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ نیکی و بدی انسان میں پیدائشی ہے اور یہ خلقت و فطرت کے خالص ہونے کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حرص جو زیادہ مانگنے کی خواہش ہے قابلِ تعریف صفت ہے۔ بشرطیکہ اُسے اس کی جگہ استعمال کیا جائے۔ مثلاً اگر انسان علوم و معارف حاصل کرنے کا لالچ رکھے یا رحم و مروت و عدالت میں حرص کرے تو بہت ممدوح ہے۔ اگر خونخوار ظالموں پر جو وحشی درندوں کی مانند ہیں قہر و غضب کرے تو نہایت پسندیدہ ہے۔ ان صفتوں کا بے موقع اور بے محل استعمال بُرا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ آفرینش یا وجود و ایجاد میں بالکل شر موجود نہیں ہے۔ جب انسان کے فطری اخلاق نامناسب مواقع پر صرف ہوتے ہیں تو بُرے ہو جاتے ہیں۔

مثلاً ایک دولتمند سخی ایک فقیر کو کچھ دیتا ہے کہ وہ اُسے اپنی ضروری ضروریات پر خرچ کرے (تو یہ بُرا نہیں) پر اگر یہ فقیر اس روپئے کو نامناسب مواقع میں صرف کرے تو یہ مذموم ہے۔

اسی طرح انسان کے تمام فطری اخلاق جو سرمایۂ حیات ہیں اگر نامناسب مواقع میں استعمال کئے جاتے ہیں تو مذموم ہو جاتے ہیں۔ پس واضح ہوگیا کہ فطرت صرف نیکی ہی نیکی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ سب سے بُری عادت اور سب سے ذلیل صفت جو تمام شرارتوں کی جڑ ہے، جھوٹ ہے۔ دنیا میں اِس سے بُری اور اس سے بڑھ کر مذموم صفت خیال میں نہیں آسکتی۔ یہ تمام کمالاتِ انسانی کو برباد کرنے والی ہے۔ بے انتہا رذیل عادتوں کو پیدا کرتی ہے۔ اِس سے بُری کوئی صفت نہیں۔ یہ تمام بُری عادتوں کی جڑ ہے۔ باوجود اس کے اگر حکیم مریض کو تسلّی دے کہ الحمدللہ تمھاری حالت اب اچھی ہے اور شفایاب ہونے کی امید ہے تو اگرچہ یہ بات سچائی کے خلاف ہے۔ مگر چونکہ مریض کے دِل کی تسلّی کا سبب اور مرض سے شفا پانے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے مذموم نہیں۔ یہ مسئلہ نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ والسّلام۔

(خ)

درجہ ادراکاتِ عالمِ انسانی اور مظاہرِ ظہور

سوال

عالَمِ انسانی کے ادراکات کس درجے تک ہیں۔ کیا اُنھیں کسی حد سے محدود کر سکتے ہیں؟

جواب

ادراکات مختلف ہیں۔ سب سے ادنیٰ درجے کے ادراکات احساساتِ حیوانیہ ہیں یعنی حسیاتِ طبیعت جو حواس کے بَل پر ظاہر ہوتی ہیں اُنھیں حسیات کہتے ہیں۔ اِس ادراک میں انسان اور حیوان دونوں مشترک ہیں۔ بلکہ بعض حیوان انسان سے بڑھ کر ہیں۔ مگر عالمِ انسانی میں اختلافِ مراتب کے سبب ادراکات بھی مختلف اور متفاوت ہیں۔ عالمِ طبیعت میں اوّل نفسِ ناطقہ کے ادراکات ہیں۔ اِس ادراک اور اِس قوّت میں سب انسان مشترک ہیں۔ خواہ غافل ہوں یا ہوشیار۔ مومن ہوں یا گمراہ۔ ایجادِ الٰہی میں یہ نفسِ ناطقہ سب کائنات سے ممتاز اور ان سب پر محیط ہے۔ اس کی شرافت اور اس کا امتیاز ہی اُس کے محیط ہونے

کا سبب ہے۔ نفسِ ناطقہ کی قوّت چیزوں کی حقیقتیں کھولتی ہے۔ کائنات کی خاصیتوں کو سمجھتی ہے۔ موجودات کے بھیدوں کا پتہ لگاتی ہے۔ تمام عُلوم و فنون، صنعتیں اور ایجادیں، ادراکات و اکتشافات، آئین و قوانین سب کے سب نفسِ ناطقہ کے ہی ادراکات سے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک وقت یہ سب رازِ سربستہ، سرِ محفوظ اور غیر معلوم تھے۔ نفس ناطقہ نے بتدریج انھیں معلوم کیا اور پردۂ غیب سے عرصۂ شہود میں پہنچایا۔ عالمِ طبیعت میں یہ سب سے بڑی قوّت ادراک ہے۔ اور اُس کی حد درجہ کی دوڑ اور انتہائی پرواز یہ ہے کہ کائنات کے حقائق و خصائص اور اُن کی تاثیرات کو دریافت کرے۔ لیکن عقل کُلّی الٰہی جو طبیعت سے بالا ہے اُس قوّتِ قدیم کا فیض ہے۔ یہ عقل کُلّی خُدا کی ہے اور تمام حقائقِ عالَم پر محیط ہے۔ یہ خدا کے اسرار کے انوار سے روشنی پاتی ہے۔ یہ قوّت تمام اشیاء کا علم رکھتی ہے۔ یہ قوّت متجسّس اور حسّاسہ نہیں۔ عالمِ طبیعت کی معنوی قوتیں متجسّس قوتیں ہیں۔ تجسّس و تلاش سے موجودات کی خاصیتوں اور کائنات کی حقیقتوں کو جان جاتی ہیں۔ لیکن ملکوتی قوّتِ عاقلہ جو طبیعت سے بالا ہے، اشیاء، اور عالمِ اشیاء پر محیط اور اُن کی مُدرک ہے۔ خدائی اسرار و معانی اور حقائق کو جاننے والی ہے۔ ملکوتی حقائقِ سربستہ کو کھولنے والی ہے یہ الٰہی قوّۂ عقلیہ مظاہرِ مقدّسہ اور مطالع نبوّت کے لئے خاص ہے۔ اِن انوار کا ایک پرتو پاک لوگوں کے دلوں کے آئینوں پر پڑتا ہے، اور یہ لوگ مظاہر مقدسہ کے ذریعے اِس قوّت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مظاہرِ مقدّسہ کے تین مقام ہیں ؛-

ایک مقامِ جسد۔ دوّم مقامِ نفسِ ناطقہ۔ سوّم جلوۂ ربّانی کا پورا پورا ظہور۔ جسدُ عالَم جسمانی کی حیثیت کے مطابق چیزوں کا ادراک کرتا ہے۔ اِس لئے بعض موقعوں پر عجز کا اظہار کرتے تھے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔ "میں بے خبر سویا ہوا تھا۔ نسائمِ الٰہی مجھ پر سے ہوکر گذریں اور مجھے ہوشیار کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں ندا بلند کروں"۔ یا مثلاً حضرت مسیح نے تیس برس کی عمر میں بپتسمہ پایا اور روح القدس کا آپ پر نزول ہوا۔ اِس سے پہلے رُوح القدس کا ظہور مسیح میں نہ ہوا تھا۔ یہ سب باتیں اُن کے مقامِ جسدی سے متعلق ہیں۔ لیکن اُن کا مقامِ ملکوتی سب چیزوں پر محیط۔ تمام بھیدوں کا بھیدی۔ کُل تاثیرات کا جاننے والا اور کُل چیزوں پر حاکم ہے۔ بعثت سے پہلے پیچھے سب ایک ہے۔ اِسی مقام میں فرمایا ہے میں الف و یای، اوّل و آخر ہوں۔ تبدیلی نہ میرے لئے ہوتی ہے نہ ہوگی۔

---

(۴۲)

(نظ)

خُدا کے بارے میں انسان کا علم :-

سوال

انسانی عقل کس حد تک خُدا کو پہچان سکتی ہے؟

جواب

اِس سوال کے جواب کے لئے فرصت کا وقت چاہیئے۔ ناہار کے وقت اس کا پورا پورا بیان مشکل ہے۔ پھر بھی ہم مختصر سا جواب دیتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ عرفان دو قسم کا ہے۔ ایک تو چیز کی ذات کا۔ دوسرا اُس کی صفات کا۔ کسی چیز کی ذات کا علم اس کی صفات سے حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ ذات مجہول وغیر معلوم ہے۔ پس جب چیزوں کا علم حالانکہ مخلوق ومحدود ہیں ذات سے نہیں بلکہ بذریعہ صفات حاصل ہوتا ہے تو پھر کس طرح حقیقتِ اُلوہیت (خُدا) کا عرفان جو نامحدود ہے ذات سے حاصل ہوسکتا ہے۔

دُنیا کی ہر چیز کا کنہ ذات اُس کی صفات ہی سے معروف ومعلوم ہے۔ مثلاً کنہ آفتاب نامعلوم و مجہول ہے۔ مگر گرمی اور روشنی کے سبب جو اُس کی صفات ہیں معروف ومعلوم ہے۔ اسی طرح کنہ ذاتِ انسان بھی مجہول وغیر معروف ہے۔ مگر اپنے صفات کے سبب معروف وموصوف ہے۔ اب دیکھئے حالانکہ عقل کائنات پر محیط ہے اور کائناتِ خارجہ محاط ہیں۔ پھر بھی ہر شے کا علم اس کی ذات سے نہیں بلکہ اُس کی صفات سے حاصل ہوتا ہے۔ کُل اہل کائنات از روئے ذات مجہول اور از روئے صفات معروف ہیں۔ پس ربّ قدیم لایزال جو اوہام وادراک سے مقدس ہے، کس طرح اپنی ذات سے معروف ہوسکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب ایک چیز کا علم ذات سے نہیں بلکہ صفات سے ہوسکتا ہے تو حقیقتِ ربوبیت بھی از روئے ذات مجہول اور از روئے صفات معروف ہے۔ علاوہ ازیں ایک حقیقتِ مخلوق کس طرح ایک حقیقتِ قدیم کو جان سکتی ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی سمجھ اُس چیز پر پوری طرح احاطہ کرنے سے آتی ہے یعنی علم احاطہ کا نتیجہ ہے۔ خدا محیط ہے۔ محاط نہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ خدا سب چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ چیزوں سے گھرا ہوا نہیں۔

اِسی طرح عالمِ خلق میں درجات کا فرق بھی عرفان کو مانع ہوتا ہے۔ مثلاً جمادات جب تک درجۂ جماد میں ہیں خواہ کتنی بھی ترقی کریں نباتات کی قوۂ نامیہ کو نہیں سمجھ سکتے۔

نباتات یعنی اشجار کتنی بھی ترقی کریں قوتِ بصارت کا تصور نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی دوسرے احساسات کو سمجھ سکتے ہیں۔ حیوان بھی درجہ انسان یعنی اُس کی قوتِ روحانی کو نہیں سمجھ سکتے۔ درجات کا فرق عرفان میں روک ہے۔ ہر ادنیٰ درجہ والا اپنے سے اوپر کے درجے والے کو نہیں سمجھ سکتا۔ پس ایک حقیقتِ حادثہ کس طرح ایک حقیقتِ قدیمہ کا ادراک کر سکتی ہے۔ اسلئے ادراک سے مُراد حقیقتِ الٰہیہ کا ادراک نہیں۔ بلکہ صفاتِ ربانی کا ادراک و عرفان ہے۔ یہ عرفانِ صفات بھی قوتِ بشر کی استطاعت کے مطابق جیسا کہ ہونا چاہیئے ویسا نہیں۔

حکمت سے مراد حقائق اشیاء کا علم ہے یعنی قوتِ بشر کی استطاعت کے مطابق اُن کی اصلیت کو جاننا اور سمجھنا۔ لہٰذا حقیقتِ حادثہ کے لئے بجز اس کے کہ وہ قوتِ بشر کی طاقت کے مطابق صفات کو سمجھے اور کوئی راہ نہیں۔ غیب اُلوہیت موجودات کے ادراک سے مقدّس و منزّہ ہے۔ جو کچھ تصور میں آتا ہے وہ انسان کے اپنے ادراکات ہیں۔ انسانی قوتِ ادراک حقیقتِ ذاتِ الہیۃ پر محیط نہیں۔ جو کچھ انسان سمجھ سکتا ہے وہ صفاتِ اُلوہیت کا ادراک ہے جن کا نور آسمانوں اور زمین میں ظاہر ہو رہا ہے۔

جب ہم آسمان و زمین میں نظر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ خدا کے کمالات کی نشانیاں واضح و آشکار ہیں۔ کیونکہ حقائق اشیاء حقیقتِ کُلیہ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ خدا آفتاب کی مانند اپنی تقدیس کی بلندیوں سے سب آسمانوں اور زمینوں پر چمکتا ہے۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ اُن میں ہے سب اس چمک سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر یہ چمک اور نورانیت نہ ہوتی تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی۔ سب کائنات اس کا انعکاس ہے۔ سب چیزیں اُس کے نور سے منور ہوتی ہیں اور اُس سے فائدہ اُٹھاتی ہیں مگر خدا کی صفات اور اُس کے کمالات و فیوضات انسانِ کامل کے ذریعے پورے پورے طور سے ظاہر ہوتے ہیں یعنی وہ بے نظیر انسان خدا کا پورا پورا روشن اور منور ظہور ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری کائنات صرف ایک پرتو کو اقتباس کرتی ہیں مگر مظہرِ کُلی اُس آفتاب کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور آفتاب کی تمام خوبیاں، اُس کی صفتیں، اُس کی تاثیریں اُس میں ظاہر و آشکار ہوتی ہیں۔ خدا کی ذات کا عرفان ناممکن و محال ہے۔ مگر مظاہرِ خدا کا عرفان خدا کا عرفان ہے۔ کیونکہ خدا کی صفات، اُس کی تجلیات اور اُس کے فیوضات اُن میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پس اگر انسان مظاہرِ خدا کو جان جائے تو وہ خدا کی معرفت تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اگر اِن پاک مظاہر سے غافل رہتا ہے تو عرفانِ الٰہی سے بھی محروم رہتا ہے۔ پس ثابت و محقق ہوگیا کہ مظاہرِ مقدسہ خدا کی خوبیوں اور اُس کے فیوض و آثار کے مرکز ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اِن نورانی نفوس سے خدائی فیوضات کے انوار کا اقتباس کرتے ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں احبائے الٰہی قوتِ جاذبہ کی مانند

اِن فیوضات کو اس منبع فیض سے حاصل کرینگے اور ایسے انوار و آثار سے اُٹھیں گے کہ آفتاب حقیقت کی ظاہر و روشن نشانیاں بنیں گے۔

(س)

بقائے رُوح

(حصّہ اوّل)

ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ روحِ انسان وجود رکھتی ہے۔ اَب ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ رُوح ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

آسمانی کتابوں میں بقائے رُوح کا ذکر ہے۔ بقائے رُوح ہی ادیانِ الٰہی کی بُنیاد ہے۔ کیونکہ سزا و جزا دو قسم کی بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو اِس دُنیا کا دُکھ اور سُکھ دوسرا اُس دُنیا کا عذاب و ثواب۔

وجودی جنّت و دوزخ خدُا کی تمام دُنیاؤں میں موجود ہیں۔ اِس دُنیا میں بھی اور عوالمِ رُوحانی وملکوتی میں بھی۔ اِن مکافات کا حاصل کرنا ہمیشہ کی زندگی پانے کا سبب ہے۔ اسی لئے حضرت مسیح نے فرمایا ہے "ایسے عمل کرو تاکہ تم ہمیشہ کی زندگی پاؤ۔ اور پانی اور رُوح سے پیدا ہو تاکہ تم ملکوت میں داخل ہو" یہ مکافاتِ وجودی وہ خوبیاں اور کمالات ہیں جو حقیقت انسانیہ کو خوبصورت بناتے ہیں۔ انسان ظلمانی ہوتا ہے نورانی بنا دیتے ہیں۔ جاہل ہوتا ہے دانا بن جاتا ہے۔ غافل سے ہوشیار ہو جاتا ہے۔ سوتا ہو تو جاگ اُٹھتا ہے مُردہ ہوتا ہے۔ زندہ ہو جاتا ہے۔ اندھا ہوتا ہے آنکھوں والا بن جاتا ہے۔ بہرا ہوتا ہے سُننے لگتا ہے۔ زمینی ہے آسمانی ہو جاتا ہے۔ ناسوتی سے ملکوتی بن جاتا ہے۔ اِن مکافات سے رُوحانی زندگی پاتا ہے۔ خلقِ جدید ہو جاتا ہے اور انجیل کی اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے جو حواریوں کے حق میں فرمائی گئی کہ وہ خون اور گوشت اور انسانی ارادے سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ خدُا سے پیدا ہوئے ہے یعنی حیوانی صفات و اخلاق سے جو انسانی طبیعت کا خاصہ ہیں نجات پا کر صفاتِ رحمانی سے مُتصف ہو گئے ہیں۔ دوبارہ پیدا ہونے کے یہی معنی ہیں۔

اِن نفوس کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں کہ وہ خدا سے محجتب رہیں۔ اور اس سے شدید کوئی عقوبت نہیں کہ نفس کی رذیل خواہشات کے شکار ہوں۔ تاریکی کی صفات کو ظاہر کریں۔ فطرت کی پستی میں پڑیں۔ اور شہوات میں منہمک ہیں۔ جب نورِ ایمان کے ذریعے اِن رذائل کی تاریکی سے چھوٹ جاتے ہیں اور آفتاب حقیقت کی چمک سے منوّر ہو جاتے ہیں تو تمام فضائل سے مشرف ہو جاتے ہیں۔ اِسی کو وہ سب سے بڑا انعام سمجھتے ہیں اور جنّتِ حقیقی جانتے ہیں۔

اسی طرح وہ مکافاتِ روحانی کو سمجھتے ہیں کہ زندگی کا بدترین عذاب اور دُکھ اور عالمِ طبیعت میں مبتلا ہونا، خدا سے دور و محجوب رہنا۔ جہالت اور نادانی میں پھنسے رہنا۔ شہواتِ نفسانی میں منہمک اور خواہشاتِ حیوانی میں گرفتار رہنا۔ صفاتِ ظلمانی یعنی جھوٹ، ظلم و جفا۔ دُنیوی کاموں میں انہماک اور خیالاتِ شیطانی میں غرق رہنا، ان کو وہ بدترین عقوبت اور عذاب سمجھتے ہیں۔

مکافاتِ اُخروی یعنی اُس دُنیا کی جزا حیاتِ ابدی ہے۔ حیاتِ اَبدی کی تصریح تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے کہ یہ کمالاتِ الٰہیہ ہیں۔ ہمیشہ کا فضل اور دائمی سعادت ہے۔ مکافاتِ اُخروی وہ کمالات و انعامات ہیں جو اس دُنیا سے گذر جانے کے بعد عوالمِ رُوحانی میں حاصل ہوتے ہیں۔ مگر مکافاتِ وجودی یعنی اس زندگی کے انعامات وہ حقیقی اور نورانی خوبیاں ہیں جو اسی دُنیا میں مل جاتی ہیں اور حیاتِ ابدی یا ہمیشہ کی زندگی کا سبب ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ نفسِ وجود کی عین ترقی ہیں جس طرح انسان عالمِ نطفہ سے بڑھ کر جوان ہوتا ہے اور فتبارک اللہ احسن الخالقین کا مظہر بنتا ہے۔

مکافاتِ اُخروی انعامات و الطاف رُوحانی ہیں۔ مثلاً ملکوتِ الٰہی میں قسم قسم کی رُوحانی نعمتیں، دل و جان کی آرزوئیں حاصل ہونا اور جہانِ ابدی میں خدا کا دیدار پانا ہے۔ ایسے ہی مجازاتِ اُخروی یعنی اِس دُنیا کا عذاب یہ ہے کہ خُدا کی خاص عنایتوں سے محروم رہے۔ اُس کے فضل کو نہ پائے اور زندگی کے پست ترین درجات میں گر جائے۔ ہر نفس جو ان الطافاتِ الٰہی سے محروم رہتا ہے۔ اگرچہ موت کے بعد زندہ رہتا ہے مگر اہلِ حقیقت کے نزدیک مُردوں میں ہی گنا جاتا ہے۔

بقائے روح کی عقلی دلیل یہ ہے کہ شئی معدوم سے کسی قسم کا اثر ظاہر نہیں ہو سکتا یعنی ممکن نہیں کہ نیستیِ محض سے آثار ظاہر ہوں۔ کیونکہ آثار فرع وجود ہیں اور فرع بغیر اصل کے نہیں ہو سکتی۔ مثلاً آفتاب معدوم سے کوئی چیز روشنی نہیں پا سکتی۔ بحرِ معدوم سے کوئی موج پیدا نہیں ہو سکتی۔ کسی ابرِ معدوم سے بارش نہیں گرتی شجرِ معدوم سے پھل پیدا نہیں ہوتا۔ ایک شخصِ معدوم سے کوئی ظہور و بروز ظاہر نہیں ہوتا پس آثار کا یہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ صاحبِ اثر موجود ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ مسیح کی سلطنت اس وقت موجود ہے۔ کس طرح ایک سُلطانِ معدوم سے ایسی عظیم سلطنت ظاہر ہو سکتی ہے؟ کس طرح ایک بحرِ معدوم سے ایسی موجیں اُٹھ سکتی ہیں؟ کس طرح ایک گلشنِ معدوم سے ایسی خوشبوئیں پھیل سکتی ہیں؟ ملاحظہ فرمائیں کہ سب کائنات میں اعضا کے جدا ہوتے ہی اور ترکیبِ عنصری کے بگڑتے ہی اُن کا اثر یا نشان باقی نہیں رہتا۔ خواہ وہ چیز جمادی ہو یا نباتی۔ اور یا حیوانی ہو مگر انسانی حقیقت اور روحِ بشری کا اعضاء کے بکھرنے، اجزاء کے ٹوٹنے اور بناوٹ کے بگڑنے کے بعد بھی اثر و نفوذ

وتصرّف باقی و برقرار رہتا ہے۔

یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے۔ خوب غور سے مُلاحظہ ومطالعہ کریں۔ یہ دلیل عقلی ہے۔ ہم نے اِسے اِس لئے بیان کیا ہے کہ اہلِ عقل اِسے عقل والنصاف کے ترازو سے تولیں۔

اگر رُوح انسانی بشارت پاکر ملکوتِ خُدا کی طرف منجذب ہو جاتے۔ اس کی بصیرت تیز ہو جائے۔ اُس کے رُوحانی کان کُھل جائیں اور اُس کے رُوحانی احساسات تیز ہو جائیں تو وہ بقائے رُوح کو آفتاب کی مانند مشاہدہ کرے گی اور بشارات و اشاراتِ الہٰی اُسے گھیر لینگے۔ دوسری دلیلیں اَب کل بیان کرینگے۔

---

(۱۳)

بقای رُوح

(حصہ دوّم)

کل بقائے رُوح کے بارے میں بات چیت ہوئی تھی۔ اَب جاننا چاہئے کہ رُوحِ انسانی کا تصرّف اور ادراک دو طرح کا ہے یعنی دو قسم کے عمل کرتی ہے۔ ایک اوزار و آلات کے ذریعے مثلاً اِن آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اِن کانوں سے سُنتی ہے۔ اِس زبان سے بولتی ہے۔ یہ رُوح یعنی حقیقتِ انسان کے اعمال ہیں جو وہ آلات و اَوزار کے ذریعے کرتی ہے۔ یعنی دیکھنے والی تو رُوح ہے۔ مگر آنکھوں کے ذریعے دیکھتی ہے۔ سُننے والی رُوح ہے مگر کانوں کے ذریعے سُنتی ہے۔ بولنے والی رُوح ہے مگر ذریعہ زبان ہے۔

رُوح کے دوسرے اعمال و تصرفات بغیر آلات و اَوزار کے ہیں۔ اُن میں سے ایک خواب کی حالت ہے جس میں بے آنکھ کے دیکھتی ہے۔ بے کان کے سُنتی ہے۔ بے زبان کے بولتی ہے اور بے پاؤں کے چلتی ہے۔ الغرض رُوح کی یہ طاقتیں بغیر آلات و اَوزار کے مستعمل ہوتی ہیں۔ کتنی ہی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص حالتِ خواب میں ایک رُویا دیکھتا ہے اور اس کے آثار ایک سال کے بعد ظاہر ہوتے ہیں کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک مشکل سوال کو ہم بیداری میں تو حل نہیں کر سکتے۔ مگر عالمِ رؤیا میں حل کر لیتے ہیں۔ عالمِ بیداری میں آنکھ بہت کم فاصلہ تک دیکھ سکتی ہے۔ لیکن عالمِ رؤیا میں انسان مشرق میں بیٹھا ہوا مغرب کو دیکھتا ہے۔ عالمِ بیداری میں صرف زمانۂ حال کو دیکھتی ہے۔ مگر عالمِ رؤیا میں زمانۂ مستقبل کا بھی مشاہدہ کرتی ہے۔ عالمِ بیداری میں تیز و تُند چلنے والے وسائل کے ذریعے ایک گھنٹے میں زیادہ سے زیادہ بیس فرسخ طے کر سکتی ہے۔ مگر عالمِ خواب میں ایک پل کے اندر مشرق و مغرب کو طے کر جاتی ہے کیونکہ رُوح کی دو سیریں ہیں۔ ایک بے واسطہ یعنی سیرِ رُوحانی۔ دوسری بالواسطہ یعنی سیرِ جسمانی ایک پرندگی

مانند جو یا تو خود اُڑتا ہے یا کوئی شخص اُٹھا کر اُسے لئے پھرتا ہے۔ نیند کی حالت میں یہ جسم مُردہ کی مانند ہوتا ہے۔ نہ دیکھتا ہے نہ سُنتا ہے نہ احساس کرتا ہے۔ شعور و ادراک نہیں رکھتا یعنی جس قدر انسانی قوتیں ہیں سب بے کار ہوتی ہیں لیکن رُوح زندہ اور باقی رہتی ہے۔ بلکہ اس حالت میں اس کا اثر زیادہ، اس کی پرواز زیادہ اور اُس کا ادراک زیادہ ہوتا ہے۔ اگر جسم کے فنا ہونے کے بعد رُوح کو فنا ہو تو ایسا ہے کہ ایک پرندہ پنجرے میں تھا۔ پنجرے کے ٹوٹنے کے ساتھ پرندہ بھی مر گیا۔ حالانکہ پرندہ کو پنجرے کے ٹوٹنے کا کیا ڈر۔ یہ جسم بھی پنجرے کی مانند ہے اور رُوح پرندے کی طرح ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پرندہ اس پنجرے کے بغیر عالَم خواب میں اُڑ سکتا ہے۔ پس اگر پنجرہ ٹوٹ جائے پرندہ زندہ اور برقرار رہتا ہے۔ بلکہ پرندے کے احساسات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے ادراکات تیز ہو جاتے ہیں اس کی بشاشت زیادہ ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت ایک قید جحیم سے نکل کر جنّتِ نعیم میں پہنچتا ہے۔ کیونکہ طیور شکور کے لئے اِس پنجرۂ جسم سے آزادی سے بڑھ کر اور کوئی جنّت بڑی نہیں۔ اِس لئے شہداء نہایت طرب وسرور کے ساتھ میدانِ قربانی کی طرف بڑھتے ہیں۔

عالَم بیداری میں انسان کی آنکھ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے فاصلے تک دیکھ سکتی ہے۔ کیونکہ جسم کے ذریعے رُوح کی اتنی ہی طاقت ہے لیکن بصیرت اور عقل کی آنکھوں سے امریکہ کو دیکھتی ہے۔ وہاں کے حالات کا پتہ لگاتی ہے۔ انھیں سمجھتی ہے اور کاموں کی سربراہی کرتی ہے۔ اب اگر رُوح جسم ہی ہوتی تو اس کی قوتِ بصیرت بھی لازماً اُسی قدر ہوتی۔ پس ثابت ہوا کہ رُوح اور ہے اور جسم کچھ اور۔ یہ پرندہ قفس سے علیحدہ ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ رُوح کی طاقت اور اس کا اثر جسم کے وسیلے بغیر شدید تر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اوزار بیکار ہو جائے تو صاحب اوزار بے کار نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر قلم ٹوٹ جائے تو کاتب زندہ اور موجود رہتا ہے۔ اگر گھر خراب ہو جائے تو گھر کا مالک باقی اور برقرار رہتا ہے۔ یہ بقائے رُوح کے بارے میں عقلی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جسم کبھی دُبلا ہو کر موٹا ہوتا ہے اور کبھی بیمار ہوتا ہے اور کبھی تندرست کبھی تھک جاتا ہے تو آرام پاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ہاتھ کٹ جاتا ہے۔ پاؤں ٹوٹ جاتا ہے۔ جسمانی قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔ کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ زبان گونگی ہو جاتی ہے۔ اعضاء مرض فالج میں مُبتلا ہوتے ہیں۔ الغرض جسم نقصان کُلّی اٹھاتا ہے مگر رُوح پھر بھی اصلی حالت پر رہتی ہے۔ اس کے ادراکات باقی و برقرار رہتے ہیں۔ نہ اِسے کچھ نقصان ہی پہنچتا ہے نہ وہ بے کار ہی ہوتی ہے۔ جسم جب آفت و مرض میں مُبتلا ہوتا ہے تو رُوح کے فیض سے محروم ہو جاتا ہے۔ آئینہ کی طرح کہ جب ٹوٹ جاتا ہے یا غُبار آلودہ اور زنگ زدہ ہو جاتا ہے تو آفتاب کی شعاع اُس میں ظاہر نہیں ہوتی اور اس کا فیض اس میں نمودار نہیں ہوتا۔ ہم پہلے بیان

کرچکے ہیں کہ روحِ انسانی جسم میں داخل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دخول و خروج سے مقدس و مجرد ہے۔ دخول و خروج اجسام کی شان ہے۔ روح کا جسم سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا آفتاب کا آئینے سے۔ مختصر یہ کہ انسانی روح ایک ہی حالت میں رہتی ہے۔ نہ تو جسم کی بیماری سے بیمار ہوتی ہے نہ صحتِ جسم سے صحیح ہوتی ہے۔ نہ مریض ہوتی ہے نہ کمزور۔ نہ ذلیل ہوتی ہے نہ حقیر۔ نہ پتلی ہوتی ہے نہ چھوٹی۔ یعنی روح میں فتورِ جسم کے سبب کوئی خلل عارض نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ جسم خواہ زار ہو جائے یا ضعیف۔ خواہ ہاتھ پاؤں اور زبان کٹ جائیں، سننے اور دیکھنے کی قوتیں بے کار ہو جائیں روح ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔

پس معلوم اور ثابت ہو گیا کہ روح اور ہے اور جسم کچھ اور۔ اس کی بقا جسم کی بقا سے مشروط نہیں۔ بلکہ روح نہایت شان و جلال کے ساتھ عالمِ جسد میں حکمرانی کرتی ہے اور اس کا اقتدار و نفوذ ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے جیسے آفتاب کا فیض آئینے میں ظاہر و ہویدا ہوتا ہے۔ آئینہ جب غبار آلود ہو جاتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے تو آفتاب کی شعاع سے محروم ہو جاتا ہے

(سبب)

کمالاتِ وجود غیر متناہی ہیں

جاننا چاہیئے کہ مراتبِ وجود مرتبۂ عبودیت، مرتبۂ نبوت و مرتبۂ ربوبیت سے محدود ہیں۔ مگر کمالاتِ الٰہیہ و امکانیہ غیر متناہی ہیں۔ اگر خوب غور سے دیکھا جائے تو بظاہر ظاہر بھی کمالاتِ وجود بے انتہا ہیں۔ کیونکہ کائنات کا کوئی کائن بھی ایسا نہیں ملتا جس سے بڑھ کر دوسرا نہ ہو۔ مثلاً عالمِ جماد کا کوئی یاقوت یا عالمِ نبات کا کوئی پھول یا عالمِ حیوان میں سے کوئی بلبل ایسی نظر نہیں آتی جس سے بہتر اور بڑھ کر نہ پایا جانا متصور ہو۔ چونکہ فیضِ الٰہی لا انتہا ہے، کمالاتِ انسانی بھی بے انتہا ہیں۔

اگر کمالات کی کوئی حد ممکن ہوتی تو حقائقِ اشیا میں سے کوئی حقیقت اس درجہ تک پہنچ جاتی کہ خدا سے بھی مستغنی ہو جاتی اور امکان، درجۂ وجوب حاصل کر لیتا۔ مگر کائنات کے ہر کائن کے لئے ایک مرتبہ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ جو مرتبۂ عبودیت میں ہے خواہ کتنی بھی ترقی کرے اور کمالاتِ غیر متناہی حاصل کرے تب بھی درجۂ ربوبیت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح کائناتِ جماد، عالمِ جماد میں کتنی بھی ترقی کرے

قوۂ نامیہ نہیں پا سکتی۔ یہ پودے عالمِ نبات میں کتنی بھی ترقی کرے قوۂ حسّاسہ اس میں ظاہر نہیں ہو سکتی۔ یا مثلاً چاندی کان اور آنکھیں نہیں پا سکتی۔ سُن اور دیکھ نہیں سکتی۔ نہایت یہ ہے کہ اپنے ہی رُتبہ میں ترقی کر کے کامل دھات بن سکتی ہے۔ پطرس مسیح نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مراتبِ عبودیت میں بے انتہا کمالات کا مالک بن سکتا ہے۔ پس ہر ایک حقیقت موجودہ ترقی کے قابل ہے، رُوحِ انسانی چونکہ اس قالب عنصر کو چھوڑنے کے بعد ہمیشہ کی زندگی کی وارث ہے اس لئے بلا شک شئ موجود ہے اور ترقی کے قابل۔ اسی لئے مرنے کے بعد انسان کے لئے عفو و عنایت، رحم اور مہربانیوں کا مانگنا جائز ہے۔ کیونکہ وجود ترقی کے قابل ہے۔ اسی لئے جمالِ مُبارک (حضرت بہاء اللہ) کی مُناجات میں مرے ہوئے لوگوں کے لئے عفو و غفران مانگا گیا ہے علاوہ ازیں جس طرح اس دُنیا میں خلق خُدا کی محتاج ہے اُس دُنیا میں بھی محتاج ہے۔ خلق ہمیشہ محتاج ہے اور خدا ہمیشہ غنیِ مطلق۔ اِس دُنیا میں بھی اور اُس دُنیا میں بھی۔ اس دُنیا کی غنا خُدا کا تقرب ہے۔ اِس صورت میں مقرّبانِ بارگاہِ الٰہی شفاعت کر سکتے ہیں اور خدا بھی اُن کی اس شفاعت کو قبول کرتا ہے۔ مگر اُس دُنیا کی شفاعت اس دُنیا جیسی نہیں ہے۔ وہ ایک کیفیت ہی دوسری ہے۔ ایک حقیقت ہی علیحدہ ہے۔ جو احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ پس اگر ایک شخص دولت مند مرنے کے وقت فقیروں اور کمزوروں کی مدد کے لئے اپنی دولت میں سے کچھ بخش جائے اور وصیت کر جائے ممکن ہے اس کا یہ عمل خُدا کی بادشاہت میں عفو و مغفرت و ترقی کا باعث ہو۔ اسی طرح ماں باپ اپنی اولاد کے لئے نہایت مشقت و مصیبت اٹھاتے ہیں اور اکثر اولاد کے جوان ہونے تک مر جاتے ہیں۔ ایسا بہت ہی کم واقع ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنی مشقات و زحمات کے مقابل اس دنیا میں اولاد سے کچھ بدلا چاہتے ہوں۔ پس اولاد کو چاہیئے کہ ماں باپ کی مشقات و زحمات کے بدلے میں خیرات کریں اور عفو و غفران کے طلبگار ہوں۔ مثلاً آپ کو چاہیئے کہ اپنے والدِ مرحوم کی محبّت و مہربانی کے بدلے میں فقیروں کو کچھ دیں اور نہایت تضرّع و ابتہال کے ساتھ عفو و غفران اور رحمتِ کبریٰ کے ملتجی ہوں۔

یہانتک ممکن ہے کہ وہ لوگ بھی جو گناہ اور عدمِ ایمان کی حالت میں مرے ہیں بدل جائیں یعنی غفران حاصل کریں۔ یہ فضلِ الٰہی سے ہو سکتا ہے عدل سے نہیں۔ کیونکہ فضل وہ عطا ہے جو بلا استحقاق دی جائے اور عدل وہ عطا ہے جو استحقاق پر بخشی جاوے۔ جس طرح ہم اِس دُنیا میں یہ قوّت رکھتے ہیں کہ اُن لوگوں کے حق میں دُعا کریں۔ اسی طرح اس دُنیا میں بھی اس طاقت کے مالک ہونگے۔ کیا اس دُنیا کی تمام مخلوق خُدا کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ پس اُس دُنیا میں بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ جس طرح یہاں تضرّع کے ساتھ اقتباسِ انوار کر سکتے ہیں اسی طرح وہاں بھی طلبِ غفران کر سکتے ہیں۔ اور تضرّع و زاری کے ساتھ انوار حاصل کر سکتے ہیں

پس جس طرح لوگ اس دُنیا میں تضرّع و ابتہال یا مقدسین کی دُعاؤں کے ذریعے ترقی حاصل کر سکتے ہیں، اسی طرح مرنے کے بعد بھی دُعا والتجا کے ذریعے ترقی کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جب مظاہرِ مقدسہ کی شفاعت اُن کے لئے جلوہ گر ہو۔

(سج)

اِنسان کی اُس دنیا میں ترقی

جاننا چاہئے کہ ہر موجود شئ ایک جگہ پر نہیں ٹھہر سکتی یعنی تمام چیزیں متحرک ہیں۔ ہر چیز یا رو بترقی ہے یا رو بتنزّل۔ تمام چیزیں یا نیستی سے ہستی کی طرف آتی ہیں یا ہستی سے نیستی کی طرف جاتی ہیں۔ مثلاً یہ پھول اور سنبل کبھی تو عدم سے وجود کی طرف آیا تھا اور اب وجود سے عدم کی جانب روانہ ہو رہا ہے۔ اس حرکت کو حرکتِ جوہری یعنی حرکتِ طبیعی کہتے ہیں۔ کائنات سے یہ حرکت علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اُن کا مقتضای ذاتی ہے۔ جیسے آگ کا مقتضائے ذاتی جلانا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حرکت وجود کا لازمہ ہے۔ یا ترقی کرنا یا تنزّل کرنا۔ پس رُوح چونکہ صعود یا موت کے بعد زندہ رہتی ہے لازماً یا ترقی کرتی ہے یا تنزّل۔ اِس دُنیا میں ترقی کا نہ ہونا عین تنزّل ہے۔ مگر اپنے رتبہ سے نہیں نکلتی۔ اپنے ہی درجہ میں ترقی کرتی ہے۔ مثلاً پطرس کی رُوح کتنی بھی ترقی کرے حقیقتِ مسیحی کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اپنے ہی دائرے میں ترقی کر سکتی ہے۔ ملاحظہ کریں کہ یہ پتھر کتنی بھی ترقی کرے اپنے رتبہ میں ہی کرتا ہے۔ مثلاً اس بلور کو اس درجہ تک نہیں لا سکتے کہ بصر پیدا کرے۔ یہ ممکن نہیں۔ بالکل مستحیل ہے۔ مثلاً یہ آسمانی چاند کتنی بھی ترقی کرے آفتاب نورانی نہیں ہو سکتا۔ اپنے ہی رتبہ میں بڑھتا اور گھٹتا ہے۔ حواری کتنے بھی ترقی کرتے مسیح نہ بن سکتے تھے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئلہ ہیرا بن جائے۔ مگر دونوں پتھر کے درجے میں ہیں اور اُن کے اجزائے مترکبہ ایک ہی ہیں۔

(سل)

اِنسان کا مقام اور موت کے بعد ترقی

ہم جب کائنات میں غور سے نظر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سب کائنات تین قسم کی ہیں جماد، نبات،

حیوان، تین جنس ہیں۔ اور ہر جنس کی مختلف قسمیں ہیں۔ انسان نوعِ ممتازہ ہے۔ کیونکہ سب قسموں کے کمالات اور خوبیوں کا مالک ہے۔ یعنی جسم بھی ہے۔ نمو اور بڑھنے کی قوّت بھی رکھتا ہے۔ اور حسّاس بھی ہے۔ جمادی و نباتی و حیوانی خوبیوں کے ساتھ ایک خاص خوبی بھی رکھتا ہے۔ جس سے دوسری کائنات محروم ہیں۔ اور وہ کمالاتِ عقلیہ ہیں پس انسان اشرفِ موجودات ہے۔ انسان جسمانیات کے آخری درجے اور رُوحانیات کے اوّل درجہ میں ہے یعنی نقص کا آخری درجہ اور کمال کا آغاز۔ رتبۂ ظلمت کی آخری حدّ اور نورانیت کا پہلا درجہ ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ انسان کا مقام رات کا اختتام اور دِن کا آغاز ہے۔ یعنی مراتبِ نقص کا جامع اور مراتبِ کمال کا مالک ہے۔ جنبۂ حیوانیت بھی رکھتا ہے اور جنبۂ ملکیت کا بھی مالک ہے۔ مُربّی سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ انسانوں کے نفوس کی ایسی تربیت کرے کہ جنبۂ ملکیت جنبۂ حیوانیت پر غالب ہو جائے۔ پس اگر انسان میں قوائے رحمانیہ جو عین کمال ہیں قوائے شیطانیہ پر جو عینِ نقص ہیں غالب ہو جائیں تو وہ اشرف موجودات ہے۔ پر اگر قوائے شیطانیہ قوائے روحانیہ پر غالب ہو جائیں تو انسان اسفل موجودات ہے۔ اسی لئے نقص کی آخری حد ہے اور کمال کا آغاز ہے۔ عالمِ وجود کی کسی نوع میں بھی ایسا تفاوت و تباین و تضاد و تخالف نہیں جیساکہ نوعِ انسان میں ہے۔ مثلاً خدا کے انوار کی تجلّی مسیح جیسے انسان پر بھی تھی۔ مُلاحظہ کریں کہ وہ کس قدر عزیز و شریف ہے پتھروں درختوں کی پرستش و عبادت بھی انسان ہی کرتا ہے۔ مُلاحظہ کریں کہ کس قدر ذلیل ہے کہ اس کا معبود ادنیٰ ترین موجودات ہے۔ یعنی بے جان اینٹ پتھر۔ پہاڑ۔ جنگل اور درخت اس کے معبود ہیں۔ اِس سے بڑھ کر بھلا کون سی ذلت ہوسکتی ہے کہ موجودات کی پست ترین چیز انسان کی معبود بنے۔

اسی طرح علم انسان کی صفت ہے۔ جہل بھی انسان کی صفت ہے۔ سچائی انسان کی صفت ہے۔ جھوٹ انسان کی صفت ہے۔ امانت انسان کی صفت ہے۔ خیانت انسان کی صفت ہے۔ عدل انسان کی صفت ہے۔ ظلم انسان کی صفت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ ہے کہ تمام کمالات اور خوبیاں انسان کی صفات ہیں اور تمام رذائل اور بُرائیاں بھی انسان کی صفات ہیں۔

افرادِ نوعِ انسان میں بھی فرق مُلاحظہ کیجئے کہ حضرت مسیح بھی بشر کی صورت میں تھے اور قیافا بھی صورتِ بشر میں ہی تھا۔ حضرت موسیٰ انسان تھے۔ اور فرعون بھی انسان تھا۔ ہابیل بھی انسان تھا اور قابیل بھی۔ جمالِ مبارک (حضرت بہاء اللہ) بھی انسان تھے اور یحییٰ بھی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ انسان خدا کی سب سے بڑی آیت ہے یعنی کتابِ تکوین ہے۔ کیونکہ تمام کائنات کے اسرار خدا میں موجود ہیں۔ پس اگر بچے مُربّی کی تربیت کے سایہ تلے آجاتا ہے اور تربیت پالیتا ہے تو جوہر الجواہر۔ نورالانوار۔ رُوح الارواح۔ خدا کی

مہربانیوں کا مرکز۔ رُوحانی صفات کا مصدر۔ انوارِ ملکوت کا مشرق اور الہاماتِ ربّانی کا جاذب ہوتا ہے۔ پر اگر محروم رہتا ہے تو صفاتِ شیطانی کا مظہر، حیوانی نقائص کا جامع اور تاریکی کی صفات کا مصدر ہو جاتا ہے۔ انبیاء کے آنے کی یہی حکمت ہے۔ وہ انسان کی تربیت کے لئے ظاہر ہوتے ہیں تاکہ یہ کوئلے ہیرے بن جائیں اور یہ بے پھل درخت پیوند پاکر نہایت لذیذ و شیریں میوے دیں۔ جب عالمِ انسانی کے اعلیٰ ترین مقامات پر پہنچ جاتے ہیں اُس وقت مراتب کمالات میں ترقی کرتے ہیں۔ مرتبہ میں نہیں۔ کیونکہ مراتب ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن کمالاتِ الٰہیہ غیر متناہی ہیں۔ انسان اس عنصری قالب کو خالی کرنے کے پہلے اور بعد رتبہ میں نہیں، کمالات میں ترقی کرتا ہے۔ مثلاً کائنات کی انتہا انسان کامل ہے۔ کوئی موجود بھی انسانِ کامل سے بڑھ کر نہیں۔ مگر انسان رتبۂ انسان میں پہنچ کر کمالات میں ترقی کر سکتا ہے مرتبہ میں ترقی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسانِ کامل سے بالاتر کوئی رتبہ نہیں ہے کہ انسان اُس رُتبے میں انتقال کر جائے۔ فقط رتبۂ انسانیت میں ہی ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ کمالاتِ انسانیہ غیر متناہی ہیں۔ مثلاً کتنا بھی کوئی عالِم ہو اس سے بڑھ کر بھی تصور میں آ سکتا ہے۔ چونکہ کمالاتِ انسانیہ غیر متناہی ہیں اِس لئے اِس عالَم سے گذرنے کے بعد بھی کمالات میں ترقی کر سکتا ہے۔

---

(۵۸)

کتابِ اقدس کی آیۂ اِنَّہٗ مِنْ اَهْلِ الضَّلَالِ وَلَوْ يَأْتِیْ بِكُلِّ الْاَعْمَالِ کے معنی

سوال

کتاب اقدس میں فرمایا ہے اِنَّہٗ مِنْ اَهْلِ الضَّلَالِ وَلَوْ يَأْتِیْ بِكُلِّ الْاَعْمَالِ (بتحقیق وہ گمراہوں میں سے ہے اگرچہ وہ تمام اعمال بجالائے) اس آیت کے کیا معنی ہیں؟

جواب

اس آیۂ مبارکہ کا مقصد یہ ہے کہ فوز و فلاح کی جڑ خُدا کا عرفان ہے۔ اور عرفان کے بعد اعمالِ حسنہ جو ایمان کا پھل ہیں اس جڑ کی شاخ ہیں۔ اگر عرفان حاصل نہیں ہوتا، انسان خدا سے محجوب رہتا ہے۔ اِس احتجاب کی موجودگی میں نیک اعمال پورا پورا پھل نہیں دیتے۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ خُدا سے محتجب اشخاص خواہ نیک ہوں خواہ بَد سب مساوی ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ خُدا کا عرفان جڑ ہے اور

اعمال اِس جڑ کی شاخیں ہیں۔ باوجود اِس کے وہ لوگ جو خُدا کے عرفان سے محجتب ہیں، اُن میں نیکوں، بدکرداروں اور گنہگاروں میں البتہ فرق ہے۔ کیونکہ ایک نیک خصلت۔ نیک رفتار محجتب خدا کی مغفرت کا سزاوار ہے۔ اور ایک گنہگار۔ بدکار۔ بدخو اور بدرفتار محجتب پروردگار کے فضل اور اُس کی عنایت سے محروم ہے۔ فرق یہاں ہے۔

پس آیۂ مبارکہ سے مقصد یہ ہے کہ عرفانِ الٰہی کے بغیر صرف نیک اعمال نجات ابدی اور فوز و فلاح سرمدی کا سبب نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی وہ ملکوتِ پروردگار میں داخل ہونے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

(سو)

جسد کو چھوڑنے اور رُوح کے صعود کے بعد نفسِ ناطقہ کہاں جاتا ہے؟

سوال

اجساد کو چھوڑنے اور ارواح کے آزاد ہونے کے بعد نفسِ ناطقہ کہاں رہتا ہے؟ فرض کریں کہ نفوسِ مؤیدہ رُوح القدس کے فیوض سے وجودِ حقیقی اور ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں تو نفسِ ناطقہ یعنی ارواحِ محجتبہ کہاں رہتی ہیں؟

جواب

بعض کا یہ خیال ہے کہ جسم جوہر ہے اور قائم بالذات ہے۔ اور رُوح عرض ہے اور جوہر بدن سے قائم ہے۔ حالانکہ نفسِ ناطقہ جوہر ہے اور جسم اُس سے قائم ہے۔ اگر عرض یعنی جسم بکھر جائے جوہر رُوح باقی رہتا ہے۔ دُوم یہ کہ نفسِ ناطقہ یعنی رُوحِ انسانی اِس جسم کے اندر نہیں رہتی یعنی اِس جسم میں داخل نہیں ہے، کیونکہ حلول و دخول اجسام کی خاصیتیں ہیں۔ اور نفسِ ناطقہ اُن سے پاک ہے۔ وہ شروع ہی سے اِس جسم میں داخل نہیں کہ خروج کے بعد کسی جگہ کی محتاج ہو۔

رُوح کا جسم سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا اِس چراغ کا آئینہ سے۔ جب تک آئینہ صاف اور کامل ہو چراغ کی روشنی اُس میں ظاہر ہے۔ جب آئینہ غُبار آلود ہو جاتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے تو نور بھی پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اوّل ہی سے نفسِ ناطقہ یعنی رُوحِ انسانی نے اِس جسم میں حلول نہیں کیا اور اِس جسم سے قائم نہ تھا کہ اِس جسم کی ترکیب تحلیل ہونے کے بعد ایک ایسے جوہر کا محتاج ہو جس سے قائم رہے۔ بلکہ نفسِ ناطقہ جوہر ہے اور جسد اِس سے قائم ہے۔ نفسِ ناطقہ کی شخصیت ذاتی ہے۔ اِس جسد کے ذریعے حاصل کی ہوئی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ اِس دُنیا میں نفسِ ناطقہ کے تعینات و تشخصات رونما ہو کر قوت حاصل کرتے ہیں۔ اور

ترقی ومراتب کمال حاصل کرتے ہیں۔ یا یہ کہ جہل کے پست ترین درجات میں رہ جاتے ہیں اور آیاتِ الٰہی کے مشاہدات سے محجوب ومحروم ہو جاتے ہیں۔

سوال

رُوح انسانی یعنی نفسِ ناطقہ اِس عالمِ فانی سے گذرنے کے بعد کن وسائط سے ترقی پاتی ہے؟

جواب

اِس جسدِ خاکی سے علیحدہ ہونے کے بعد رُوحِ انسانی عالمِ الٰہی میں یا تو صرف خدا کے فضل اور اُس کی مہربانی سے یا اُس کے لئے لوگوں کی نیک دُعا اور طلبِ مغفرت یا اُن بڑی بڑی خیرات اور تبرات کے سبب سے جو اُس کے نام پر جاری کی جاتی ہیں ترقی پاتی ہے۔

بقائے رُوحِ اطفال

سوال

وہ بچے جو بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی مرجاتے ہیں یا مدّت کے پورا ہونے سے پہلے ہی رحم سے ساقط ہو جاتے ہیں اُن کے کیا حالات ہونگے؟

جواب

یہ بچے پروردگار کے فضل کے سایہ تلے ہیں۔ چونکہ اُن سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا اور عالمِ طبیعت کی کثافت سے آلودہ نہیں ہوتے اِس لئے خدا کے فضل کے مظاہر ہوتے ہیں اور چشمِ رحمت کی نگاہیں اُن کے شاملِ حال ہوتی ہیں۔

---

(۶۱)

حیاتِ ابدی اور ملکوتِ الٰہی میں داخل ہونا

آپ نے ہمیشہ کی زندگی اور ملکوت میں داخل ہونے کے متعلق سوال کیا ہے۔ اصطلاحِ ظاہری میں ملکوت آسمان کو کہتے ہیں۔ مگر یہ تعبیر و تشبیہ ہے۔ حقیقی و واقعی نہیں۔ کیونکہ ملکوت کوئی جسمانی جگہ نہیں ہے۔ یہ زمان و مکان سے پاک ہے۔ یہ جہانِ رُوحانی اور عالمِ رحمانی ہے۔ اور سلطنتِ یزدانی کا مرکز ہے جسم

وجسمانیت سے مجرّد اور اوہام عالمِ انسانی سے پاک و مقدّس ہے۔ کیونکہ مکان میں محصور ہونا اجسام کی خاصیتوں میں سے ہے، اَرواح کی نہیں، مکان و زمان تن پر محیط ہیں عقل و جان پر نہیں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ انسان کا جسم ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے اور دو گز زمین میں سکونت کر لیتا ہے۔ اِس سے زیادہ قبضہ نہیں کر سکتا۔ مگر انسان کی رُوح و عقل تمام ممالک و اقالیم بلکہ اِس آسمان نامتناہی کی فضا میں سیر کرتی ہے اور کُل دُنیا پر قابض ہے۔ اور طبقاتِ عُلیا میں بے انتہا کشفیات کرتی ہے۔ اِسی لئے کہ رُوح کوئی مکان نہیں رکھتی بلکہ لامکان ہے۔ اور رُوح کے لئے زمین و آسمان یکساں ہیں۔ کیونکہ دونوں میں اکتشافات کرتی ہے۔ مگر یہ جسم مکان میں محصور ہے اور اس کے علاوہ اور سب چیزوں سے بے خبر ہے۔

زندگی دو قسم کی ہے۔ زندگیٔ جسم اور زندگیٔ رُوح۔ زندگیٔ جسم سے مُراد حیاتِ جسمانی ہے۔ مگر زندگیٔ رُوح سے مُراد ہستیٔ ملکوتی ہے۔ اور ہستیٔ ملکوتی کے معنیٰ رُوحِ الٰہی سے فیض حاصل کرنا، اور نفحۂ روح القدس سے زندہ ہونا ہے۔ حیاتِ جسمانی اگرچہ وجود رکھتی ہے۔ لیکن رُوحانی مقدّسین کے نزدیک سراسر نیستی اور محض مَوت ہے۔ مثلاً انسان موجود ہے، یہ پتھر بھی موجود ہے، مگر کہاں انسانی وجود اور کہاں اس پتھر کا وجود اِس میں شک نہیں کہ پتھر وجود رکھتا ہے مگر انسان کے وجود کے مقابل بالکل معدوم ہے۔

حیاتِ ابدی کا مقصد فیضِ رُوح القدس سے ایسے ہی فائدہ اٹھانا ہے، جیسے پھول فصل و نسیم اور نفحۂ بہار سے فائدہ اُٹھاتا ہے، مُلاحظہ فرمایئے کہ یہ پھول پہلے حیاتِ جمادی رکھتا تھا۔ مگر موسمِ بہار کے آنے اور ابرِ بہاری کے برسنے اور آفتابِ نورانی کے چمکنے سے ایک نئی زندگی کا مالک بنتا ہے اور نہایت طراوت و لطافت سے مہک رہا ہے، اِس پھول کی پہلی زندگی اُس کی دوسری زندگی کی نسبت موت تھی، مقصد یہ ہے کہ حیاتِ ملکوت، حیاتِ رُوح ہے اور حیاتِ ابدی ہے جو زمان و مکان سے منزّہ۔ رُوحِ انسان کی مانند جو مکان نہیں رکھتی۔ کیونکہ انسان کے جسم میں اگر غور سے آپ سوچیں تو کوئی خاص جگہ رُوح کو نہیں دے سکتے۔ کیونکہ رُوح مطلقاً مکان نہیں رکھتی۔ بالکل مجرّد ہے۔ اِس جسم سے اُس کا ایسا تعلق ہے۔ جیسا آفتاب کا تعلق اِس آئینہ سے ہے۔ سورج آئینہ میں نہیں ہے۔ مگر آئینہ سے تعلق رکھتا ہے، اِسی طرح عالمِ ملکوت ہر اُس چیز سے مقدّس ہے جو آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے یا دوسرے حواس مثلاً سُننے، سونگھنے اور چکھنے اور چھونے سے محسوس ہوتی ہے۔ یہ عقل جو انسان میں ہے اور جس کا ہونا مسلّم ہے، انسان میں کہاں ہے؟ اگر انسان کے تمام جسم میں آنکھ، کان، اور دوسرے حواس سے تلاش کریں تو کہیں اُسے نہ پا سکیں گے۔ حالانکہ موجود ہے۔ پس عقل کا جسم میں کوئی مکان نہیں۔ مگر دماغ سے تعلق رکھتی ہے۔ ملکوت بھی ایسا ہی ہے،

اسی طرح محبت کے لئے بھی کوئی خاص جگہ مقرر نہیں۔ بلکہ دل سے تعلق رکھتی ہے، اسی طرح ملکوت بھی کوئی مکان نہیں رکھتا، مگر انسان سے تعلق رکھتا ہے۔

محبت اللہ، انقطاع، تقدیس، تنزیہہ، صدق وصفا، استقامت و وفا اور جانفشانی سے ملکوت میں داخل ہو سکتے ہیں۔

پس اِن بیانات سے واضح ہوگیا کہ انسان باقی اور ہمیشہ زندہ رہتا ہے، لیکن وہ جو خدا کے مومن، محبت اللہ والیقان رکھتے ہیں اُن کی زندگی پاک اور طیّب ہے یعنی ابدی کہی جاتی ہے، مگر وہ نفوس جو خدا سے محتجب ہیں باوجودیکہ زندگی رکھتے ہیں مگر اُن کی زندگی ظلمانی ہے اور مومنین کی زندگی کے مقابل نیستی ہے۔ مثلاً آنکھ زندہ ہے، ناخن بھی زندہ ہے، مگر آنکھ کی زندگی کے سامنے ناخن کی زندگی عدم ہے۔ یہ پتھر بھی وجود رکھتا ہے اور انسان بھی وجود رکھتا ہے، مگر پتھر انسان کے وجود کے سامنے عدم ہے، وجود نہیں رکھتا، کیونکہ انسان جب مرجاتا ہے تو یہ جسم بکھر جاتا ہے اور معدوم ہو جاتا ہے، خاک اور پتھر کی مانند جماد ہو جاتا ہے۔ پس ظاہر ہوگیا کہ وجود جمادی اگرچہ وجود ہے مگر وجود انسانی کی نسبت نیستی ہے۔ اسی طرح خدا سے محتجب نفوس اگرچہ اس دنیا میں اور موت کے بعد اُس دنیا میں وجود رکھتے ہیں مگر ابنائے ملکوت کے پاک وجود کے مقابل معدوم ومفقود ہیں۔

---

(۳۷)

قضا کے بارے میں سوال

سوال

تقدیر یا قسمت جو آسمانی کتابوں میں مذکور ہے کیا اٹل اور فیصلہ شدہ حکم ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس سے گریز کرنا بے فائدہ اور فضول ہے۔

جواب

تقدیر دو قسم کی ہے، ایک اٹل جو مُبرم کہلاتی ہے اور ایک مشروط جسے معلق بھی کہتے ہیں۔ اٹل تقدیر وہ ہے جس میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا، اور تقدیر مشروط وہ ہے جو واقع ہو سکتی ہے یعنی ممکن الوقوع ہے۔ مثلاً اس چراغ کی اٹل تقدیر یہ ہے کہ جب تیل ختم ہو جائے گا تو یہ

بجھ جائے گا۔ پس اس صورت میں اس کا بجھنا اٹل ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کی اٹل تقدیر ہے۔ اسی طرح انسانی جسم میں ایک قوت پیدا کی گئی ہے کہ جب وہ قوت زائل ہو کر ختم ہو جاتی ہے تو جسم خود بخود ہی تحلیل ہو جاتا ہے۔ جس طرح یہ تیل جب اس چراغ میں جل چکتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے تو چراغ یقیناً بجھ جاتا ہے۔

تقدیر مشروط یہ ہے کہ تیل ابھی باقی ہے۔ مگر تیز ہوا نے چراغ کو خاموش کر دیا۔ یہ تقدیر مشروط ہے، اس سے بچنا۔ حفاظت، پرہیز اور احتیاط فائدہ مند اور مفید ہے۔ مگر تقدیر مبرم تیل کے ختم ہونے پر نہ بدلتی ہے نہ اس میں کچھ تغیر ہوتا ہے اور نہ تاخیر ہوتی ہے۔ یہ تقدیر حتماً واقع ہوتی ہے اور چراغ بجھ جاتا ہے۔

---

(۶۰)

ستاروں کی تاثیر

سوال

کیا یہ آسمانی ستارے انسانی نفوس پر کچھ روحانی اثر رکھتے ہیں یا نہیں؟

جواب

بعض آسمانی ستاروں کا جسمانی اثر کرۂ زمین اور اس کی کائنات پر ظاہر اور روشن ہے۔ اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ سورج خدا کی عنایت و مدد سے کرۂ زمین اور اس کی کائنات کو پالتا ہے۔ اگر سورج کی گرمی اور روشنی نہ ہوتی تو زمین کی سب چیزیں معدوم ہو جاتیں۔

ستارے روحانی تاثیرات بھی رکھتے ہیں اور اگرچہ عالم انسانی میں ستاروں کی روحانی تاثیرات عجیب سی نظر آتی ہیں۔ مگر جب غور سے اس مسئلہ کو سوچا جاتا ہے تو چنداں عجیب معلوم نہیں ہوتا۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ پہلے نجومی جو ستاروں کی حرکات کو دیکھ کر کچھ کہا کرتے تھے وہ صحیح ہوتا تھا۔ کیونکہ جو کچھ یہ پہلے نجومی کہتے تھے وہ اوہام کی ایک صورت تھی جس کے موجد مصری، اشوری اور کلدانی کاہن تھے۔ ان میں ہندوؤں کے اوہام، یونانیوں، رومیوں اور دوسرے ستارہ پرستوں کی خرافات بھی شامل تھیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ غیر متناہی جہان جسم انسان کی طرح ہے۔ سب اجزاء ایک دوسرے سے ملے ہوئے

اور ایک دوسرے کے ممدّ و معاون ہیں اور ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح اِس کون نامتناہی کے اجزاء جسم انسان کے اعضاء و اجزاء کی طرح ایک دوسرے سے مرتبط ہیں۔ اور جسماً و روحاً ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔ مثلاً آنکھ دیکھتی ہے، سارا جسم متأثر ہوتا ہے۔ کان سُنتے ہیں، تمام ارکان پر اثر پڑتا ہے۔ اس مسئلہ میں کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ عالم وجود بھی ایک زندہ شخص کی مانند ہے۔ پس اس ارتباط کے سبب جو اجزائے کائنات کے درمیان ہے تاثیر و تاثر لازم و ملزوم ہیں، خواہ جسمانی ہو خواہ رُوحانی۔

اُن لوگوں کے لئے جو جسمانیات میں رُوحانی تاثیرات کے منکر ہیں ہم یہ مختصر سی مثال بیان کرتے ہیں کہ عجیب عجیب آوازیں اور الحان اور پیارے اور سُریلے راگ اور نغمے ایک عرض یا حادثہ ہیں جو ہوا پر عارض ہوتے ہیں، کیونکہ آواز سے مُراد تموّجاتِ ہوائیہ ہیں۔ ہوا کی موجوں کی تھرتھراہٹ کان کے پردہ کی رگوں پر اثر ڈالتی ہے۔ اور استماع (سُننا) حاصل ہوتا ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیں کہ تموّجِ ہوا جو ایک نہایت ہی چھوٹا سا حادثہ یا عرض ہے رُوحِ انسان کو جذب و جوش میں لاتا اور حد درجہ کا اثر کرتا ہے یہ اثر رُلاتے ہیں، ہنساتے ہیں اور کبھی کبھی اس درجے تک پہنچاتے ہیں کہ خطرہ میں ڈال دیتے ہیں پس دیکھئے کہ تموّجِ ہوا اور رُوحِ انسان میں کیا رشتہ ہے کہ ہوا کی تھرتھراہٹ انسان کو ایک حالت سے دوسری حالت میں لے جانے کا سبب ہوتی ہے۔ بالکل منقلب کر دیتی ہے۔ بلکہ صبر و قرار بھی اُس کے پاس نہیں چھوڑتی۔ ملاحظہ کیجئے کہ یہ بات کس قدر عجیب ہے کیونکہ نہ تو گانے والے سے کوئی چیز خارج ہوتی ہے اور نہ سُننے والے میں کوئی چیز داخل ہوتی ہے۔ باوجود اس کے بہت بڑی رُوحانی تاثیرات رونما ہوتی ہیں پس کائنات کا یہ بڑا ارتباط لازماً رُوحانی تاثیر و اثر کے سبب ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ جس طرح انسان کے اعضا و اجزا ایک دوسرے سے متاثر و مؤثر ہوتے ہیں اسی طرح اِس کون نامتناہی کے ارکان و اعضا و اجزا بھی ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ مثلاً آنکھ دیکھتی ہے، دِل پر اثر ہوتا ہے، کان سُنتا ہے، روح متأثر ہوتی ہے۔ دل فارغ ہوتا ہے خیال میں پرواز پیدا ہوتی ہے۔ اور تمام اعضاءِ انسان کے لئے خوشی کی حالت نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ کیا رشتہ ہے؟ یہ کیا مناسبت ہے؟ جب انسان کے اعضاءِ جسمانی میں جو چھوٹی سی کائنات میں کا ایک کائن ہے ایسا ارتباط اور ایسی رُوحانی ترقیات ہیں تو بلا شک بڑی اور نامتناہی کائنات میں بھی جسمانی اور رُوحانی ارتباط دونوں موجود ہیں۔ اگرچہ موجودہ قواعد اور آجکل کے علم ان روابط کو کھول نہیں سکتے۔ مگر بڑی کائنات کے درمیان روابط کا ہونا واجب و مسلّم ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کائنات خواہ کُلّی ہوں خواہ جزئی، خُدا کی حکمتِ بالغہ سے باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں اور متأثر ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نظامِ عمومی اور عالَم بالا کی ترتیباتِ کُلّی

میں خلل و فتور پیدا ہو جاتا۔ چونکہ یہ کائنات نہایت خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ باہم مربوط ہے، اس لئے منتظم، مرتب اور مکمل ہے۔ یہ بیان شانِ تحقیق کے شایاں ہے ؛

(ع)

مسئلۂ جبر و اختیار

سوال

کیا انسان اپنے تمام اعمال میں فاعلِ مختار ہے یا مجبورِ بے اختیار؟

جواب

یہ مسئلہ مسائل الٰہیہ میں سب سے اہم اور نہایت ہی پیچیدہ ہے۔ انشاء اللہ کسی اور دن ناہار کے شروع ہی سے اس مسئلہ کو مفصل بیان کریں گے۔ اس وقت مختصر چند باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ کچھ اُمور انسان کے اختیار میں ہیں مثلاً عدل و انصاف اور ظلم و اعتساف۔ مختصر الفاظ میں یعنی نیک اعمال اور بد افعال۔ یہ صاف ظاہر و واضح ہے کہ ان اعمال میں انسان کا ارادہ بہت بڑا دخل رکھتا ہے مگر ایسے اُمور بھی ہیں جن پر انسان مجبول و مجبور ہے۔ مثلاً سونا۔ مرنا۔ بیمار ہونا۔ قوتوں کا گھٹنا۔ ضرر و نقصان پہنچنا۔ یہ اُمور انسان کے ارادہ کے ماتحت نہیں۔ اور نہ انسان اُن کے لئے جوابدہ ہے۔ کیونکہ وہ اُن پر مجبور ہے۔ مگر نیک اعمال اور بُرے اعمال کے کرنے میں وہ آزاد ہے۔ اور اپنے ارادہ و اختیار سے اُن کا ارتکاب کرتا ہے۔ مثلاً اگر چاہے تو یادِ خدا میں مشغول ہو۔ اور اگر چاہے تو یادِ غیر میں مصروف ہو۔ ممکن ہے کہ خدا کی محبت کی آگ سے ایک شمع روشن کرے اور تمام عالم کا محبّ و خیر خواہ بنے۔ یا انسانوں کا دشمن اور دُنیا پرست ہو جائے۔ عادل بنے یا ظالم۔ چونکہ یہ اعمال و افعال خود انسان کے اختیار میں ہیں۔ اس لئے وہ ان کا جوابدہ ہے۔

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان خالص عجز۔ اور سراسر فقر ہے۔ توانائی اور قدرت صرف حضرتِ پروردگار کے لئے مخصوص ہے۔ بڑھانا اور گھٹانا جناب کبریا کے ارادہ پر منحصر ہے۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے کہ "خداوند کوزہ گر کی طرح ایک برتن کو عزیز اور دوسرے برتن کو ذلیل بناتا ہے۔ وہ برتن جو ذلیل بنایا گیا اُس کو حق نہیں کہ کوزہ گر پر اعتراض کرے کہ کیوں مجھے جامِ عزیز نہیں بنایا کہ میں ہاتھوں ہاتھ پھرتا۔ اس عبارت کا یہ مطلب ہے کہ نفوس کے مقامات مختلف ہیں۔ جو ادنیٰ مقام میں ہیں جیسے جماد یہ اعتراض

کرنے کا حق نہیں رکھتے کہ خدا نے کیوں مجھے نبات کی خوبیاں نہیں دیں۔ اسی طرح نبات کو اعتراض کا کا حق حاصل نہیں کہ کیوں مجھے عالَمِ حیوان کے کمالات سے محروم رکھا۔ اسی طرح حیوان کو یہ سزاوار نہیں کہ کمالاتِ انسانی کے نہ ہونے کی شکایت کرے۔ یہ تمام اشیاء اپنے اپنے رُتبہ میں کامل ہیں۔ ان پر واجب ہے کہ اپنے رتبہ کے اندر ہی اُس کی خوبیوں کو ڈھونڈھیں۔

ایک ادنیٰ درجے والے کو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اپنے سے اوپر کے مقام و کمالات کی نہ تو صلاحیت ہی ہے اور نہ ہی حق حاصل ہے۔ اُنھیں صرف اپنے ہی درجہ میں ترقی کرنی چاہیئے۔

اِسی طرح انسانی سکون و حرکت خُدا کی تائید پر موقوف ہے۔ اگر مدد نہ پہنچے تو نہ نیکی کرنے پر قادر ہو نہ بدی پر۔ جب خدا کی مدد سے وجود پاتا ہے تو نیکی اور بدی دونوں کے کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اگر مدد منقطع ہو جائے تو بالکل عاجز رہ جاتا ہے۔ اِسی لئے پاک کتابوں میں تائید و توفیق الہیٰ کا ذکر ہے۔

اِس مقام کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک کشتی کو حرکت دینے والی ہوا کی قوت حاصل ہے۔ اگر یہ قوت نہ ہو تو کشتی بالکل حرکت نہیں کر سکتی۔ باوجود اس کے کشتی کے بیٹھنے والے جس طرف چاہیں بھاپ کی قوت اُسی طرف اُس کو چلاتی ہے۔ اگر مشرق کی طرف پھیر دیں تو مشرق کی طرف جاتی ہے اور اگر مغرب کی طرف موڑ دیں تو مغرب کی جانب چلتی ہے۔ یہ حرکت کشتی کی نہیں بلکہ ہوا اور بھاپ سے ہے۔ اِسی طرح انسان کے تمام حرکات و سکنات خُدا کی مدد سے وابستہ ہیں۔ مگر نیکی اور بدی کرنے کا اختیار انسان کے ہاتھ میں ہے۔

اِسی طرح بادشاہ ایک شخص کو اِس شہر کا حاکم بنائے اور اُسے اختیار عطا کرے اور قانون کے بموجب عدل و ظلم کا طریق اُسے سمجھا دے۔ اب اگر یہ حاکم ظلم کرے تو اگرچہ وہ بادشاہ کی قوت اور اُس کے اختیار سے کرتا ہے۔ مگر بادشاہ اس کے ظلم سے بیزار ہے۔ اگر عدل کرے تو وہ بھی بادشاہ کے اختیار سے کرتا ہے۔ اور بادشاہ اُس کے عدل سے راضی اور خوش ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بدی کرنے کا اختیار انسان کے ہاتھ میں ہے اور ہر صورت میں خُدا کی تائید و توفیق پر موقوف ہے۔ خُدا کی سلطنت بہت بڑی ہے اور سب اُس کے قبضۂ قدرت میں اسیر ہیں۔ بندہ اپنے ارادے سے کسی امر کے کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ خدا مقتدر و توانا ہے اور تمام کائنات کو مدد بخشتا ہے یہ مسئلہ واضح اور صاف ہو گیا۔ والسلام۔

(۲۱)

الہام ۔ کشف ۔ رُویاء ۔ تسخیرِ ارواح

سوال

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ رُوحانی کشفیات ۔ یعنی اَرواح سے بات چیت کرتے ہیں ۔ اَرواح سے یہ میل جول کس قسم کا ہے ؟

جواب

رُوحانی انکشافات دو قسم ہیں ۔ ایک وہ اوہام ہیں جو بعض لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ دوسری قسم جیسے خواب ۔ یہ حقیقت رکھتی ہے ۔ مثلاً رُویائے اشعیا ۔ رُویائے ارمیا ۔ اور رویائے یوحنا جو حقیقی اور سچے ہیں ۔

مُلاحظہ فرمائیے کہ انسان کی قوتِ متفکرہ دو قسم کے تصوّر رکھتی ہے ۔ ایک قسم کا تصوّر صحیح ہے ۔ جب وہ عزمِ مصمم کے ساتھ ہوتا ہے تو ظاہر میں بھی ظہور پذیر ہو جاتا ہے ۔ جیسے صحیح تدبیریں ۔ درست رائیں ۔ انکشافات ، فنون ، نئی ایجادیں ۔

دوسری قسم کا تصوّر وہ فاسد افکار اور بیہودہ خیالات ہیں ۔ جن سے مطلقاً کوئی نتیجہ یا ثمرہ حاصل نہیں ہوتا ۔ یہ بالکل بے حقیقت ہوتے ہیں ، دریائے اوہام کی موجوں کی مانند چڑھتے اُترتے ہیں اور بیہودہ خوابوں کی طرح مٹ جاتے ہیں ۔

اِسی طرح رُوحانی کشفیات بھی دو طرح کی ہیں ۔ ایک قسم تو نبیوں کے رُویا ، اور برگزیدہ لوگوں کے کشوف ہیں ۔ انبیاء کے رُویاء خواب نہیں ہوتے ۔ بلکہ رُوحانی انکشافات ہوتے ہیں اور ایک حقیقت رکھتے ہیں مثلاً نبی فرماتا ہے کہ ایک شخص کو ایسی صورت میں دیکھا ۔ میں نے یہ کہا اور اُس نے یہ جواب دیا ۔ یہ رُویاء عالمِ بیداری میں ہوتی ہے ۔ عالمِ خواب میں نہیں ۔ بلکہ یہ ایک رُوحانی مکاشفہ ہوتا ہے جسے وہ رُویاء کے نام سے پیش کرتے ہیں ۔

دوسری قسم رُوحانی کشفیات خالص اوہام ہیں ۔ مگر یہ اوہام اِس طرح ظاہر ہوتے ہیں کہ بعض سادہ دِل اُنھیں سچا خیال کرتے ہیں ۔ اس کی صاف اور واضح دلیل یہ ہے کہ اس تسخیرِ ارواح سے مطلقاً کوئی نتیجہ یا ثمرہ حاصل نہیں ہوتا ۔ بلکہ صِرف ایک قصہ کہانی ہوتی ہے ۔

جاننا چاہیئے کہ حقیقتِ انسان تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے اور تمام چیزوں کی اصلیت اور اُن کے بھیدوں اور خاصیتوں کو کھولتی ہے ، جیسا کہ تمام نئی نئی ایجادوں اور دستکاریوں اور علوم

و معارف کو حقیقتِ انسان نے ہی منکشف کیا ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب یہ تمام ایجادیں اور دستکاریاں علوم و فنون ایک پوشیدہ و سربمہر راز تھے۔ حقیقتِ انسانیہ نے بتدریج اُنھیں کشف کیا۔ اور عالمِ غیب سے عرصۂ شہود میں اُنھیں لے آئی۔ پس ثابت ہو گیا کہ حقیقتِ انسانی سب چیزوں پہ محیط ہے۔ کیونکہ یورپ میں بیٹھی ہوئی امریکا کا پتہ لگاتی ہے۔ زمین پہ رہتی ہوئی آسمان کے انکشافات کرتی ہے۔ اسرارِ اشیاء ظاہر کرنے والی اور حقائقِ موجودات سے باخبر ہے۔

یہ کشفیات جو حقیقت کے مطابق ہوتی ہیں، رُویاء کی مانند ہیں جو ایک قسم کا ادراکِ رُوحانی، الہامِ رحمانی اور اُلفتِ ارواحِ انسانی ہے۔ جیسا کہ صاحبِ الہام و کشف کہتا ہے۔ ایسا دیکھا۔ یہ کہا اور یہ سُنا۔ پس معلوم ہوا کہ رُوح، حواسِ خمسہ کان اور آنکھ وغیرہ کے وسائط کے بغیر بھی ادراکاتِ عظیمہ کی مالک ہے

رُوحانی ادراکات اور وجدانی مکاشفات روحانیوں کے درمیان ایک ایسا اتحاد ہیں جو وہم و قیاس سے مقدس اور ایک ایسی اُلفت ہیں جو زمان و مکان سے منزّہ ہے۔ مثلاً انجیل میں لکھا ہے کہ کوہِ طابور میں موسیٰ اور ایلیا مسیح کے پاس آئے۔ یہ ظاہر ہی ہے کہ یہ مُلاقات جسمانی نہ تھی، بلکہ ایک روحانی کیفیت تھی جسے مُلاقات سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری قسم مثلاً ارواح کو بُلانا۔ اُن سے بات چیت کرنا اور خبریں منگوانا سراسر اوہام اور فاسد خیالات ہیں۔ مگر ایسا گُمان ہوتا ہے کہ یہ باتیں بھی ایک حقیقت رکھتی ہیں۔

اِنسان کی عقل و فکر کبھی کبھی حقائق کو معلوم کرتی ہے۔ اور اِس فکر سے اثر و نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اِس اَمر کی بنیاد تو ہے۔ مگر بہت سی باتیں انسان کے دِل میں ایسی گذرتی ہیں جو بحرِ اوہام کی موجوں کی مانند بالکل بے اثر و بے نتیجہ ہیں۔

اِسی طرح انسان عالمِ خواب میں رویاء دیکھتا ہے جو بعینہٖ ظاہر ہوتا ہے، مگر دوسرے وقت خواب دیکھتا ہے جس کا کچھ بھی نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ حالت جسے ارواح سے خبریں منگوانا یا ارواح سے بات چیت کرنا کہتے ہیں، اوہام کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔

دوسری قسم جسے رویاء کہتے ہیں اور جس کا ذکر کتابِ مقدس میں آیا ہے جیسا کہ اشعیاء اور یوحنا کے رویاء، مسیح کی موسیٰ و ایلیا سے مُلاقات، حقیقت رکھتا ہے۔ اور عقول و افکار میں عجیب اثر انداز ہوتا ہے، اور دِلوں میں بہت انجذاب پیدا کرتا ہے۔

وسائط رُوحانیہ سے شفا دینا

سوال

بعض لوگ وسائط رُوحانی سے یعنی بغیر دَوا مریضوں کو شفا دیتے ہیں۔ یہ کس طرح ہے؟

جواب

اِس کیفیت کا مفصّل حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگر آپ نے ٹھیک طور سے نہیں سمجھا تو ہم پھر بیان کرتے ہیں تاکہ آپ اچھی طرح سمجھ جائیں۔

جاننا چاہئے کہ دوا کے بغیر شفا اور علاج چار قسم کا ہے۔ دو قسم مادّیات کے ذریعے اور دو قسم روحانیات کے وسیلے۔ مادّیات کی دو قسم میں سے ایک یہ ہے:۔

اِنسان میں مرض وصحت دونوں متعدّی یعنی سرایت کرنے والے ہیں۔ مرض کی سرایت شدید اور سریع ہے۔ مگر صحت کی سرایت نہایت خفیف ہے۔ جب دو جسم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ایک کے اجزائے میکروب دوسرے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ جس طرح مرض ایک جسم سے دوسرے جسم میں سریع وشدید سرایت کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک تندرست شخص کی شدید صحت ایک مریض کے خفیف مرض کی تخفیف کا بھی سبب ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مرض کی سرایت شدید اور بہت جلد تاثیر کرنے والی ہے۔ مگر صحت کی سرایت بہت ہی آہستہ اثر کرتی ہے اور اُس کی تاثیر بھی بہت کمزور ہوتی ہے۔ لہٰذا بہت ہی کمزور بیماریوں میں کچھ یوں ہی سی تاثیر پیدا کرتی ہے یعنی ایک تندرست جسم کی شدید قوت ایک بیمار جسم کے کمزور مرض پر غلبہ پاتی ہے اور صحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو ایک قسم ہے۔ دوسری قسم قوتِ مقناطیس ہے۔ ایک جسم کی قوتِ مقناطیس دوسرے جسم پر تاثیر کرتی ہے اور شفا، کا سبب ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر بھی بہت خفیف ہے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص ایک بیمار کے سَر پر یا دِل پر ہاتھ رکھ کر اُسے اچھا کر دے۔ سبب یہ ہے کہ مقناطیس کی تاثیر اور مریض کے اپنے تاثرات، مرض کو دور کرنے کا سبب ہوتے ہیں۔ یہ تاثیر بھی بہت کمزور وخفیف ہے۔

دوسری دو قسم جو رُوحانی ہیں یعنی روحانی قوتیں جن سے شفا حاصل ہوتی ہے یہ ہیں کہ ایک تندرست شخص ایک مریض کی طرف پوری توجہ کرتا ہے۔ مریض بھی نہایت زور کے ساتھ شفا کے انتظار میں رہتا ہے کہ اس تندرست شخص کی رُوحانی قوت سے اُسے صحت حاصل ہو۔ اور پورا پورا اعتقاد رکھے کہ اُسے شفا حاصل ہوگی۔ اِس حد تک کہ شخص تندرست اور مریض کے درمیان ایک قلبی رشتہ پیدا ہو جائے۔ وہ تندرست شخص بھی

اپنی تمام ہمت کو مریض کی شفا پر لگا دے۔ مریض بھی شفا کا پورا پورا یقین رکھے۔ جب یہ حالت پیدا ہوتی ہوتی ہے تو نفسانی تاثیر و تاثرات سے اعصاب میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور عصبی تاثر و ہیجان سبب ہوتا ہے اور مریض شفا پالیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مریض کسی چیز کے لئے ترس رہا ہے اور نہایت خواہش اور آرزو سے کچھ مانگتا ہے۔ اب اگر دفعتاً اُسے اس چیز کے ملنے کی خوش خبری دے دی جائے تو اُس کے اعصاب میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اور اس ہیجان سے مرض بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک پُروحشت بات دفعتاً رونما ہو جس سے شاید ایک تندرست شخص کے اعصاب میں ایک ہیجان پیدا ہو اور اس سے فوراً مرض پیدا ہو جائے، اِس مرض کا سبب کوئی مادی چیز نہیں۔ کیونکہ نہ تو اُس نے کچھ کھایا ہے اور نہ ہی کوئی دوسری چیز اُسے پہنچی ہے۔ صرف اعصاب کے ہیجان سے اُسے وہ مرض لگ گیا ہے اب اسی طرح اپنی انتہائی آرزو حاصل ہونے سے اُسے دفعتاً ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اُس کے اعصاب میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے اور اس ہیجان سے صحت حاصل ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ طبیب روحانی اور مریض کے درمیان ایسا پورا اور کامل ارتباط کہ طبیب مریض کی طرف پوری توجہ لگائے اور مریض بھی اپنی تمام توجہ طبیب کی طرف لگا دے اور صحت کا منتظر رہے۔ ایسا ارتباط اعصاب کے ہیجان کا سبب ہوتا ہے اور اس ہیجان سے صحت حاصل ہوتی ہے۔ مگر یہ سب ایک حد تک تاثیر رکھتے ہیں۔ ہمیشہ مؤثر نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر کوئی بہت سخت مرض میں مبتلا ہے اور کسی کو سخت زخم لگا ہے تو اِن وسیلوں سے نہ تو ایسا مرض ہی دور ہوتا ہے نہ زخم اچھا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے وسائل سخت بیماریوں میں کچھ اثر نہیں رکھتے۔ تاوقتیکہ قوتِ روحانی مدد نہ کرے۔ کیونکہ قوتِ روحانی اکثر اوقات مرض کو دور کر دیتی ہے۔ یہ تیسری قسم تھی۔

چوتھی قسم وہ ہے کہ روح القدس کی قوت سے شفا حاصل ہو۔ یہ نہ تو چھونے پہ اور نہ نظر کرنے اور نہ حاضر رہنے پر منحصر ہے۔ کسی شرط سے مشروط نہیں ہے۔ خواہ مریض کمزور ہو خواہ طاقت ور۔ دونوں جسم باہم ایک دوسرے کو چھوئیں یا نہ۔ مریض و طبیب کے درمیان ارتباط حاصل ہو یا نہ ہو۔ مریض خواہ حاضر ہو یا غائب۔ یہ شفا روح القدس کی طاقت سے حاصل ہوتی ہے۔

(ج)

مادّی وسائط سے علاج

مسئلہ طب و علاج روحانی کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ روحانی قوت سے امراض کا علاج ہو سکتا ہے۔

اَب مادّی علاج کا کچھ بیان کرتے ہیں۔ طب ابھی اپنے بچپن میں ہے۔ جوانی تک نہیں پہنچی۔ جب اپنی جوانی کو پہنچ جائے گی تو ایسی چیزوں سے علاج ہوگا کہ انسان کی قوتِ ذائقہ اور قوتِ شامہ اُن سے کراہت نہ کریں گی یعنی ایسی غذاؤں، پھلوں اور نباتات سے ہوگا جو مزیدار خوشبودار ہونگی۔ کیونکہ جسم انسان میں مرض کے داخل ہونے کا سبب یا تو موادِ جسمانیہ ہیں یا عصبی تاثر و ہیجان ہے۔

موادِ جسمانیہ جو امراض کا اصلی سبب ہیں اُن کی حقیقت یہ ہے کہ جسم انسان متعدّد عناصر سے مل کر بنا ہے اور ان عناصر کی ترکیب کی میزان ایک خاص اعتدال پر ہے۔ جب تک یہ اعتدال قائم ہے، انسان امراض سے بچا رہتا ہے۔ جب اصلی موازنہ میں جس پر مزاج کے اعتدال کا مدار ہے خلل عارض ہوتا ہے تو مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اور امراض لگ جاتے ہیں۔ مثلاً جسم انسان کے اجزائے مرکبہ میں سے ایک چھوٹا سا جزو بگڑ جاتا ہے یا گھٹ جاتا ہے اور دوسرا جزو بڑھ جاتا ہے تو میزانِ اعتدال ٹوٹ جاتی ہے۔ پس مرض عارض ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک جزو کو ہزار درہم ہونا چاہئے اور دوسرے جزو کو پانچ درہم تاکہ اعتدال حاصل ہو۔ اب اگر وہ جزو ہزار درہمی گھٹ کر سات سو درہم رہ جائے اور پانچ درہم والا جزو بڑھ جائے تو میزانِ اعتدال ٹوٹ جاتی ہے پس مرض عارض ہوتا ہے۔ اور جب دواؤں اور معالجات کے ذریعے اعتدال پیدا کیا جاتا ہے تو مرض دور ہو جاتا ہے۔ مثلاً شکر کا جزو بڑھ جائے تو صحت بگڑ جاتی ہے۔ اور جب حکیم میٹھی چیزوں کے کھانے سے روکتا ہے تو اعتدال حاصل ہوتا ہے۔ شکر کا جزو گھٹ جاتا ہے اور مرض دور ہو جاتا ہے۔

اَب انسان کے جسم کی تعدیل دو طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یا تو دواؤں سے یا غذاؤں سے۔ اور جب مزاج اعتدال حاصل کر لیتا ہے تو مرض دفع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام عناصر مرکب جو انسان میں ہیں نباتات میں بھی ہیں۔ لہٰذا جب جسم انسان کے اجزائے مرکبہ میں سے کوئی جزو ناقص ہو جاتا ہے تو وہ غذا کھائی جاتی ہے جس میں وہ ناقص شدہ جزو زیادہ ہوتا ہے۔ پس اعتدال پیدا ہوتا ہے اور شفا حاصل ہوتی ہے۔ جب تک تعدیل اجزا مطلوب ہو تو یہ یا تو دوا سے ممکن ہے یا غذا سے۔

بیماریاں جو انسان پر عارض ہوتی ہیں وہی اکثر حیوان پر بھی عارض ہوتی ہیں۔ مگر حیوان دوا سے علاج نہیں کرتا۔ کوہ و بیابان میں حیوان کا طبیب اُس کی قوتِ شامہ اور قوتِ ذائقہ ہیں۔ بیابان میں جو نباتات اُگی ہوئی ہوتی ہیں مریض حیوان اُنھیں سونگھتا ہے۔ جو کوئی اُس کے ذائقے میں میٹھی اور سونگھنے میں خوشبودار ہوتی ہے اُسے کھاتا اور شفا پاتا ہے۔ اُس کی شفا کا سبب یہ ہے کہ جب مٹھاس کا جزو اُس کے مزاج میں کم ہو جاتا ہے تو اُسے مٹھاس کی خواہش ہوتی ہے۔ اور وہ میٹھی نباتات کھاتا ہے۔ کیونکہ طبیعت اُنھیں پسند کرتی ہے اور اُن کی طرف لے جاتی ہے۔ اُن کی بو اور ذائقہ اُسے اچھا لگتا ہے۔ اُسے کھاتا ہے تو مٹھاس کا جزو بڑھ جاتا ہے۔

اور صحت حاصل ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ غذاؤں اور پھلوں سے معالجہ ہو سکتا ہے۔
چونکہ طب ابھی ناقص ہے اس لئے پوری طرح اس بات کو نہیں سمجھے ہیں۔ جب طب درجۂ کمال کو پہنچ جائے گی تو غذاؤں، پھلوں اور خوشبودار نباتات اور مختلف گرم و سرد پانی سے علاج ہوا کرے گا۔
یہ بیان مختصر ہے۔ انشاء اللہ کسی دوسرے وقت مفصل بیان کیا جائے گا۔

مقالات مختلف

گفتگوئے بر سرِ ناہار

(۶۸)

وجود میں شر نہیں

اس مسئلہ کی حقیقت کا بیان بہت مشکل ہے۔ جاننا چاہیئے کہ کائنات دو قسم کی ہے۔ جسمانی و روحانی، محسوس و معقول یعنی کائنات کی ایک قسم محسوس ہے۔ دوسری محسوس نہیں بلکہ معقول ہے۔ محسوس وہ ہے جو ظاہری حواسِ خمسہ سے ادراک ہوتی ہے۔ مثلاً یہ اشیائے خارجہ جنھیں آنکھ دیکھتی ہے انھیں محسوس کہتے ہیں معقول وہ ہیں جن کا ظاہری وجود نہ ہو اور عقل اُنھیں ادراک کرتی ہو۔ مثلاً خود عقل معقول ہے۔ کوئی ظاہری وجود نہیں رکھتی۔ تمام اخلاق و صفاتِ انسانی عقلی وجود رکھتے ہیں۔ حسی نہیں یعنی صفات ایک ایسی حقیقت ہیں جو معقول ہیں۔ محسوس نہیں۔

مختصر یہ کہ حقائق معقولہ جیسا کہ انسان کے قابلِ تعریف صفات و کمالات خالص خیر ہیں اور وجود رکھتے ہیں، ان کا نہ ہونا شر ہے۔ مثلاً جہالت علم کے نہ ہونے کا نام ہے۔ گمراہی عدمِ ہدایت ہے۔ بھولنا، یاد نہ رکھنے کو کہتے ہیں۔ عدمِ درایت۔ نافہمی، کو بلاہت (حماقت) کہتے ہیں۔ یہ اعدام ہیں۔ وجود نہیں رکھتیں۔

حقائقِ محسوسہ بھی سراسر خیر ہیں اور ان کے اعدام شر ہیں۔ یعنی اندھاپن، عدمِ بینائی ہے۔ بہرہ پن، عدمِ سمع ہے۔ فقر، عدمِ غنا ہے۔ صحت کا نہ ہونا مرض ہے۔ زندگی کے نہ ہونے کو موت کہتے ہیں۔ کمزوری عدمِ قوت ہے۔

ایک شبہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بچھو اور سانپ کو ڈنک جو دیا گیا ہے یہ خیر ہے یا شر؟ کیونکہ وہ وجود رکھتے ہیں۔

بچھو کا ڈنک شر ہے۔ مگر صرف ہمارے لئے: سانپ شر ہے مگر ہمارے واسطے۔ اپنے لئے وہ شر نہیں بلکہ یہ زہر اُس کے بچاؤ کا ہتھیار ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنی حفاظت کرتا ہے۔ چونکہ اس زہر کا عنصر ہمارے عنصر کے مطابق نہیں ہوتا۔ یعنی ہمارے عنصر اور اُس کے عنصر کے درمیان مخالفت ہے اس لئے شر ہے۔ باہمی ایک دوسرے کی نسبت سے شر ہیں ورنہ فی الحقیقت اپنی اپنی جگہ خیر ہیں۔

خلاصۂ کلام۔ یہ ممکن ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کی نسبت شر ہو۔ مگر اپنی ذات کے دائرے میں شر نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ وجود میں شر نہیں۔ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے خیر پیدا کیا ہے۔ شر اعدام کا نام ہے مثلاً موت عدمِ حیات ہے۔ حیات کی مدد جب انسان کو نہیں پہنچتی تو وہ مر جاتا ہے۔ تاریکی عدمِ نور ہے

جب نور نہیں ہوتا تو تاریکی ہوتی ہے۔ نور امرِ وجودی ہے۔ تاریکی امرِ وجودی نہیں ہے۔ بلکہ عدمی ہے۔ غِنا امرِ وجودی ہے۔ فقر امرِ عدمی ہے پس معلوم ہوا کہ تمام شر اَعدام کے نام ہیں۔ خیر امرِ وجودی ہے اور شر امرِ عدمی۔

(۲۵)

عذاب دو قسم کا ہے

جاننا چاہیئے کہ عذاب دو قسم کا ہے۔ عذابِ لطیف اور عذابِ غلیظ۔ مثلاً جہالت کا ہونا عذاب ہے۔ جھوٹ عذاب ہے۔ ظلم عذاب ہے۔ خیانت عذاب ہے۔ تمام نقائص عذاب ہیں۔ نہایت یہ ہے کہ عذاب لطیف ہیں البتہ عقلمند انسان کے نزدیک مر جانا گناہ سے بہتر ہے۔ زبان کا کاٹ ڈالنا جھوٹ اور بہتان سے بہتر ہے۔

دوسری قسم کا عذاب، عذابِ غلیظ ہے۔ جیسے مختلف قسم کی سزائیں۔ مثلاً قید کرنا۔ بید لگانا۔ دیس نکالا۔ جلاوطنی اور قید تنہائی۔

مگر اہل اللہ کے نزدیک خدا سے دوری ان تمام عذابوں سے بڑا عذاب ہے۔

(۲۶)

خدائی عدل ورحمت

جاننا چاہیئے کہ عدل اِسے کہتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو اُسے وہ دیا جائے۔ مثلاً ایک مزدور جس نے صبح سے شام تک کام کیا ہے، عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اُسے اُس کی مزدوری دی جائے۔ فضل سے کہتے ہیں کہ بغیر کوئی کام کئے یا تکلیف اٹھائے عنایت کا مورد ہو۔ مثلاً آپ ایک فقیر کو بغیر اس کے کہ وہ کوئی تکلیف اُٹھائے۔ خیرات یا صدقہ دیتے ہیں۔ حالانکہ اُس نے آپ کے لئے کچھ کام نہیں کیا ہے، جو استحقاق رکھتا ہو۔ یہ فضل ہے۔ جیسے حضرت مسیح نے اپنے قاتلوں کے لئے بخشش چاہی تھی، اسے فضل کہتے ہیں۔

اب مسئلہ حُسن و قبحِ اشیاء کو لیجئے۔ یہ مسئلہ یا تو عقل پر مبنی ہے یا آئین و قوانین پر۔ بعض کہتے

ہیں کہ یہ بھلائی اور برائی کا خیال قوانین اور آئین پر مبنی ہے۔ مثلاً یہودی جن کا اعتقاد یہ ہے کہ چونکہ تورات کے سب احکام کی تابعداری فرض ہے۔ اس لئے یہ سب مشروع ہیں۔ معقول نہیں ہیں۔ یعنی یہ سب احکام آئین و قوانین ہیں اور عقل کا ان میں کچھ دخل نہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ تورات کا ایک حکم یہ ہے کہ :۔

گوشت روغن کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ "طرفت" ہے۔ عبرانی زبان میں "طرفت" ناپاک کو اور "کشر" پاک کو کہتے ہیں۔ اُن کا یہ قول ہے کہ یہ امر مشروع ہے معقول نہیں۔ مگر الہیون کا قول ہے کہ حسن و قبح اشیاء معقول بھی ہے اور مشروع بھی۔ یعنی عقل پر بھی مبنی ہے اور آئین و قوانین پر بھی۔ اسی لئے قتل، چوری، خیانت، جھوٹ، نفاق، ظلم کی ممنوعیت معقول ہے۔ ہر عقل یہ سمجھ سکتی ہے کہ قتل، چوری، خیانت، جھوٹ، نفاق، ظلم سب کے سب برے اور مذموم ہیں۔ کیونکہ اگر ایک کانٹا بھی ایک انسان کے چھویا جاتا ہے تو وہ چلاتا ہے، روتا ہے، اور چیخیں مارتا ہے، پس معلوم ہے کہ وہ سمجھتا ہے قتل کرنا عقلاً برا اور مذموم ہے۔ اگر اس کا ارتکاب کرتا ہے تو پکڑا جاتا ہے۔ خواہ نبوت کی آواز اُس تک پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ چونکہ اُس کی عقل اُس کی برائی کو سمجھ سکتی ہے اس لئے قابلِ مواخذہ ہے۔ ایسے لوگ جب اِن برے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں تو لازماً وہ زیرِ مواخذہ آتے ہیں۔ اگرچہ احکام نبوت اُن تک نہیں پہنچے ہوتے اور وہ تعالیم الٰہیہ کے مطابق نہیں چلتے۔ مثلاً مسیح نے فرمایا ہے کہ "جفا کے بدلے وفا کرو"۔ اب اگر یہ حکم اُس تک نہیں پہنچا، اور وہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے موجب چلتا ہے یعنی اگر اُسے کوئی دکھ دیتا ہے تو وہ بھی اُسے دکھ دیتا ہے۔ تو یہ شخص دیناً معذور ہے۔ کیونکہ خدا کا حکم اُس تک نہیں پہنچا۔ ایسا شخص اگرچہ عنایت و مہربانی کا حق نہیں رکھتا۔ مگر خدا اپنے فضل سے اسے معاف فرماتا ہے۔ بدلہ لینا عقلاً بھی مذموم ہے۔ کیونکہ بدلہ لینے سے بدلہ لینے والے کو بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا مثلاً اگر ایک شخص دوسرے کو مارے اور وہ مار کھایا ہوا شخص بدلہ لینے کے لئے اُٹھے اور مارنے والے کو بھی مارے تو اُسے کیا حاصل ہوگا۔ کیا اُس کے زخم پر مرہم لگ جائیگا۔ اور اس کے درد کا علاج ہو جائیگا۔ استغفر اللہ۔ فی الحقیقت دونوں عمل ایک ہی ہیں۔ دونوں دکھ ہیں۔ فرق صرف پہلے اور پیچھے کا ہے۔ یعنی ایک کو پہلے دکھ ہوتا ہے اور دوسرے کو کچھ دیر بعد۔ اس لئے اگر مار کھایا ہوا شخص معاف کردے بلکہ اُلٹا معاملہ کرے، یعنی بدی کے بدلے نیکی کرے تو قابلِ تعریف ہے۔ مگر ہیئتِ اجتماعیہ اُس مارنے والے شخص سے قصاص لیگی۔ انتقام یا بدلہ نہ لے گی۔ یہ قصاص اس لئے لیا جاتا ہے کہ فتنوں کا انسداد ہو اور آگے کو ایسے کام نہ ہوں۔ اور ظلم و دست درازی کا مقابلہ کیا جائے۔ تاکہ دوسرے لوگ ظلم کے ہاتھ دراز نہ کریں۔ مار کھایا ہوا شخص اگر معاف کرے اور بدلہ نہ لے۔ بلکہ نہایت مہربانی سے پیش آئے تو یہ بات نہایت پیاری اور قابلِ تعریف ہے۔

(۲۶)

مجرم کا صحیح طریقۂ علاج

سوال

کیا مجرم سزا کا مستحق ہے یا معافی اور درگذر کا؟

جواب

سزائیں دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم انتقام ہے اور دوسری قسم قصاص ہے۔ کوئی انسان انتقام لینے کا حق نہیں رکھتا۔ مگر ہیئتِ اجتماعیہ مجرم سے قصاص لینے کی حقدار ہے۔ اور یہ قصاص آئندہ کی روک ٹوک کے لئے ہے۔ تاکہ کوئی دوسرا شخص اس جرم کی جسارت نہ کرے۔

قصاص، حقوقِ بشر کو محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔ انتقام لینے کے لئے نہیں۔ کیونکہ انتقام، دل کی تشفی ہے جو بالمثل مقابلہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ جائز نہیں۔ کیونکہ انسان انتقام کا حق نہیں رکھتا۔ باوجود اس کے اگر مجرموں سے بالکل باز پرس نہ ہو تو دنیا کا انتظام درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے قصاص ہیئتِ اجتماعیہ کے لوازمِ ضروریہ میں سے ہے۔ مگر شخصِ مظلوم جس پر دست درازی کی گئی بدلہ لینے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کے لئے معاف کرنا اور مہربانی کرنا لازم ہے۔ اور یہی انسان کی شان کے شایاں ہے۔ مگر ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے فرض ہے کہ وہ ظالم اور قاتل اور مارنے والے سے قصاص لے۔ تاکہ آگے کے لئے روک ٹوک ہو۔ اور دوسرے ان جرائم کی جسارت نہ کریں۔

مگر اصل بات تو یہ ہے کہ لوگوں کی ایسی تربیت کی جائے کہ جرم واقع ہی نہ ہو۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک گروہ کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ ارتکابِ جرائم سے ایسا پرہیز کریں اور اس قدر نفرت کریں کہ ان کے نزدیک خود جرم ایک بہت بڑا دکھ اور سخت عذاب و قصاص ہو۔ اس لئے جرم واقع نہ ہوگا۔ اور جب جرم واقع نہ ہوگا تو قصاص کے جاری کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ایسی بات کہیں جس کا دنیا میں جاری ہونا ممکن ہو۔ بہت سے بڑے بڑے تصورات اور تخیلات ہیں۔ مگر وہ قابلِ اجرا نہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ایسی بات کہیں جو ممکن الاجرا ہو۔ مثلاً اگر ایک شخص دوسرے شخص پر ظلم کرے۔ ستم اور تعدّی کرے اور وہ شخص بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کرے

تو یہ انتقام ہے اور یہ بُرا ہے۔کیونکہ زید اگر عمر کے بیٹے کو مار دے عمر کا حق نہیں کہ زید کے بیٹے کو مار ڈالے۔اگر وہ ایسا کرتا ہے تو بدلہ لیتا ہے۔ اور یہ بہت مذموم ہے۔بلکہ اُسے چاہئے کہ بالعکس معاملہ کرے معاف کرے۔بلکہ اگر ممکن ہو تو ظلم کرنے والے کی تکلیف میں مدد کرے۔یہ انسان کی شان کے شایاں ہے۔ کیونکہ انتقام سے اُسے کیا پھل مل سکتا ہے۔ دونوں عمل ایک سے ہیں۔اگر مذموم ہیں دونوں مذموم ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ وہ پہلا ہے اور یہ پچھلا۔

ہیئاتِ اجتماعیہ مدافعت ومحافظت کا حق رکھتی ہیں۔کیونکہ ہیئتِ اجتماعیہ قاتل سے بُغض یا عداوت نہیں رکھتی۔صرف دوسروں کی حفاظت کے لئے قاتل کو قید کرتی ہے یا قصاص لیتی ہے۔اُس کا مقصد اِس سے انتقام نہیں، بلکہ دوسروں کی حفاظت کے لئے قصاص لینا ہے۔اگر مقتول کے وارث بھی معاف کردیں اور ہیئتِ اجتماعیہ بھی قاتل کو چھوڑ دے تو وہ ستمگار ہمیشہ ظلم کرتا رہیگا۔ اور ہر وقت قتل واقع ہونگے۔ بلکہ بدمعاش اشخاص بھیڑئے کی طرح خُدا کی بھیڑوں کو ملیامیٹ کردیں گے۔ہیئتِ اجتماعیہ کسی بدنیتی سے قصاص نہیں لیتی۔ اُسسے کچھ غرض نہیں ہے۔نہ ہی یہ اپنے دل کی تشفی کے لئے قصاص لیتی ہے۔ بلکہ اس کا مقصد قصاص لینے سے یہ ہے کہ دوسروں کی حفاظت کرے۔تاکہ کوئی دوسرا اُس بُرے کام کا مُرتکب نہ ہو۔پس یہ جو حضرت مسیح نے فرمایا ہے کہ "اگر کوئی تیرے داہنی جانب طمانچہ مارے تو تو اُس کی طرف بائیں جانب بھی پھیر دے۔" اس سے آپ کا مقصد لوگوں کی تربیت کرنا تھا۔ یہ مقصد نہ تھا کہ اگر ایک بھیڑیا گلے کے درمیان آگھسے اور بکریوں کے تمام گلے کو پھاڑے تو تم اُس کی مدد کرو۔ اگر حضرت مسیح دیکھتے کہ ایک بھیڑیا گلے میں گھُس کر تمام گلے کو ملیامیٹ کرنا چاہتا ہے تو وہ ضرور ضرور اس بھیڑئیے کو روکتے۔جس طرح عفو خُدا کی صفت ہے اُسی طرح عدل بھی خُدا کی صفت ہے۔ دُنیا کا خیمہ عدل پہ قائم ہے۔عفو پر نہیں۔ اور انسان کی بقا عدل پر مبنی ہے عفو پر نہیں۔ مثلاً اس وقت اگر تمام ممالکِ دُنیا میں عفو کا قانون جاری کردیا جائے تھوڑی ہی مدّت میں دُنیا درہم برہم ہو جائے گی۔ اور حیاتِ انسانی کی جڑ کھوکھلی ہو جائے گی۔مثلاً اگر یورپ کی حکومتیں اٹیلائی مشہور کا مقابلہ نہ کرتیں تو وہ ایک انسان کو بھی نہ چھوڑتا۔بعض انسان بھیڑئے کی مانند ہیں۔جب دیکھتے ہیں کہ قصاص درمیان میں نہیں تو صرف سرور اور خوشی اور دل کو بہلانے کے لئے انسان کو قتل کرتے ہیں۔ستمگارانِ ایران میں سے ایک نے صرف ہنسنے کے لئے شوخی اور مذاق میں اپنے اُستاد کو مار ڈالا۔ مشہور خلیفہ متوکّل عبّاسی وزیروں، امیروں اور سرداروں کو اپنی مجلس میں بلاتا اور پھر بچھوؤں کے ایک ڈبے کو کھول کر مجلس میں چھوڑ دیتا اور حکم کرتا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اور جب یہ بچھو وزیروں کے ڈنک مارتے تو قہقہہ مار مار کر ہنستا۔

الغرض ہیئتِ اجتماعیہ کی قوت، عدل سے ہے۔ عفو سے نہیں۔ پس معاف کرنے اور بخش دینے سے حضرت مسیح کا مقصد یہ نہیں کہ اگر دوسرے لوگ تم پر چڑھائی کرکے آئیں۔ تمھارے گھروں کو جلائیں۔ تمھارے مال و دولت کو لوٹیں۔ تمھارے اہل و عیال پر ظلم کریں۔ اور تمھاری عورتوں کی عصمت دری کریں تو تم اُس ستمگار لشکر کے مقابلہ میں سر جھکائے کھڑے رہو۔ اور جو ظلم وستم وہ چاہیں انھیں کرنے دو۔ حضرت مسیح کی مُراد تو صرف دو شخصوں کے درمیان کسی خاص معاملہ کے بارے میں ایسا رویہ اختیار کرنا تھی، کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے پر ظلم کرے تو جس پر ظلم ہوا ہے اُسے لازم ہے کہ ظلم کرنے والے کو معاف کر دے۔ مگر ہیئتِ اجتماعیہ کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ مثلاً اگر کوئی شخص مجھ پر دست درازی کرے۔ ظلم و جفا کرے اور میرے جگر پہ خنجر چلائے تو میں بالکل اُس سے جھگڑا نہ کرونگا بلکہ اُسے معاف کر دونگا۔ پر اگر کوئی چاہے (حضرت عبدالبہاء نے حاضرین مجلس میں سے ایک بزرگ کی طرف اشارہ فرمایا۔ مترجم) کہ اِس سیدِ منشادی پر ظلم کرے تو میں فوراً اُس کے روکنے اور منع کرنے پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اگرچہ ظالم کو نہ روکنا بظاہر اُس پر مہربانی کرنا ہے، مگر جناب منشادی پر ظلم کرنا ہے۔ مثلاً اگر اس وقت ایک وحشی عرب اس جگہ آئے اور یہ چاہے کہ ننگی تلوار سے تم سے لڑے۔ زخمی کرے اور مار ڈالے تو میں البتہ اُسے روکوں گا۔ اگر میں تمھیں اُس کے ہاتھ میں چھوڑ دوں تو یہ ظلم ہے، عدل نہیں۔ پر اگر خود مجھے کچھ اذیت دے تو میں اُسے معاف کر دوں گا۔

ایک بات اور باقی رہ گئی۔ اور وہ یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ ہمیشہ دن رات سزا کے قوانین بنانے اور قصاص کے اوزار و آلات تیار کرنے میں مشغول ہے۔ جیلخانے بنائے جاتے ہیں۔ بیڑیاں اور ہتھکڑیاں تیار کراتے ہیں۔ قسم قسم کی مشقتیں اور سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ جلاوطنی اور قید وغیرہ کے لئے طرح طرح کے مقامات اور جیلخانے بناتے ہیں۔ تاکہ ان وسائل سے اہل جرم کی تربیت کریں۔ حالانکہ یہ وسائل، اخلاق کو بگاڑنے اور عادات کو بُرا بنانے کا سبب ہوتے ہیں۔ ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے تو لازم ہے کہ دن رات کوشش کرے اور اپنی تمام ہمت کو اس پر لگا دے کہ لوگ تربیت پائیں اور روز بروز ترقی کریں اور علوم و معارف میں بڑھتے چلے جائیں۔ اچھی عادتوں کو حاصل کریں۔ آداب سیکھیں اور درندگی سے پرہیز کریں تاکہ جرم واقع ہی نہ ہو۔ اس وقت تو اس کے برعکس ارباب حل و عقد ہمیشہ اِس خیال میں ہیں کہ سزاؤں کے قوانین کو مضبوط کریں۔ قصاص کے اسباب کو مہیا کریں۔ قتل و مجروح کرنے کے آلات رکھیں۔ جلاوطنی اور قید کے مقامات کو درست بنائیں۔ اور ہمیشہ جرم کے واقع ہونے کے منتظر رہیں۔ ایسا رویہ بہت ہی بُری تاثیر ظاہر کرتا ہے۔ اگر وہ پبلک کی تربیت میں کوشش کریں تاکہ

روز بروز معارف و علوم زیادہ ہوں۔ سمجھ بڑھتی جاوے۔ احساسات ترقی کریں۔ اخلاق اعتدال پر آتے جائیں۔ عادتیں سنورتی جائیں۔ الغرض سب قسم کی خوبیوں میں ترقی کرتے جائیں تو جرم کا واقع ہونا بہت کم ہو جائے گا۔ یہ تجربہ شدہ بات ہے کہ اقوامِ متمدّنہ کے درمیان جرم بہت کم واقع ہوتا ہے یعنی اُن لوگوں میں جنھوں نے کہ صحیح مدنیت حاصل کر لی ہے۔ تمدّنِ صحیح آسمانی تمدّن ہے۔ جیسے اُن لوگوں کا تمدّن جو تمام جسمانی و رُوحانی کمالات کے جامع ہوتے ہیں۔ چونکہ جرائم کے واقع ہونے کا سبب جہالت ہے۔ اِس لئے علم و فضل جس قدر بڑھے گا، اُسی قدر جرائم کم ہوتے جائینگے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ افریقہ کے وحشیوں میں کتنے قتل واقع ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کو مار کر اُن کا گوشت اور خون کھاتے ہیں۔ سوئیزرلینڈ میں بھلا ایسے وحشیانہ وقوعات کیوں واقع نہیں ہوتے۔ سبب صاف ظاہر ہے کہ یہ تربیت ہے۔ فضیلت ہے۔ پس ہیئتِ اجتماعیہ کو چاہئے کہ وہ اِس فکر میں رہے کہ جرم واقع نہ ہو۔ اِس فکر میں نہ رہے کہ جرائم کے لئے سخت سزائیں تجویز کرے اور سخت سے سخت قصاص کو جاری کرے۔

---

(۷۸)

مسئلہ اعتصاب

آپ نے مسئلہ اعتصاب کے متعلق سوال کیا ہے۔ اِس مسئلہ میں بہت بڑی بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اِن مشکلات کا موجب دو چیزیں ہیں۔ ایک تو کارخانوں کے مالکوں کی بڑھی ہوئی طمع اور حرص۔ دوسری مزدوروں کی زیادتی، سرکشی اور اُن کا لالچ۔ پس لازم ہے کہ دونوں کا علاج کیا جائے مگر اِن مشکلات کا اصلی سبب موجودہ تمدّن کے طبیعی قوانین ہیں۔ کیونکہ یہ انھی قوانین کا نتیجہ ہے کہ کچھ تھوڑے سے لوگ ضرورت سے زیادہ بے حساب دولت پا لیتے ہیں اور زیادہ لوگ ننگے، بھوکے اور بے سروسامان رہتے ہیں۔ یہ عدالت اور مروّت و انصاف کے مخالف اور سراسر ظلم ہے۔ خُدا کی مرضی کے خلاف ہے۔ یہ تفاوت صرف انسان میں ہی ہے۔ تمام دوسری کائنات یعنی سب حیوانوں میں تقریباً ایک ہی قسم کی عدالت و مساوات موجود ہے۔ مثلاً جنگل میں بکریوں کے گلے اور ہرنوں کے ریوڑ اپنے اندر مساوات رکھتے ہیں۔ اِسی طرح باغ و کوہسار صحرا و چمن میں پرندوں کے درمیان بھی مساوات پائی جاتی ہے حیوانوں کی ہر قسم میں تقریباً ایک قسم کی مساوات پائی جاتی ہے۔ کیونکہ روزی کمانے میں ایک دوسرے سے

فرق نہیں رکھتے۔ اس لئے نہایت آرام سے رہتے ہیں اور خوشی و خرمی میں زندگانی گذارتے ہیں۔ برخلاف اس کے نوع انسان میں حد درجہ کا ظلم اور ناانصافی موجود ہے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ انسانوں میں سے ایک انسان خزانے جمع کرتا ہے اور ایک ملک کو اپنی ملکیت بناتا ہے۔ بے حساب دولت پاتا ہے اور منافع اور آمدنی سیل رواں کی طرح مہیا کرتا ہے۔ مگر لاکھوں بیچارے کمزور، و ناتوان ایک لقمۂ نان کے بھی محتاج ہیں۔ مساوات و مواسات درمیان میں نہیں ہیں۔ اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں آسائش و آرام کا نام نہیں اور نوع انسان کی راحت اس قدر مسلوب ہے کہ ایک جمّ غفیر کی زندگی بے فائدہ بسر ہو رہی ہے۔ کیونکہ دولت و عزت و تجارت و کارخانہ جات کے مالک گنتی کے چند شخص ہیں۔ باقی سب نامحدود مشقت و زحمت کے تلے جان توڑ رہے ہیں۔ اور اپنی مشقت و زحمت کے فوائد و منافع سے بھی محروم ہیں اور راحت و آرام سے دور۔

پس لازم ہے کہ ایک قانون و انتظام ایسا ترتیب دیا جائے جو ان معدودے چند لوگوں کی کثیر دولت کو اعتدال پہ لائے اور کروڑہا فقیروں اور مسکینوں کی احتیاج کو روکنے کا سبب ہو۔ اس سے کچھ تو اعتدال حاصل ہو جائے گا۔ مساوات تام کا ہونا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ دولت و عزت، تجارت و کاشتکاری اور دستکاری میں پوری پوری مساوات لوگوں کی ناکامی، پریشانی اور کھلبلی کا سبب ہوگی۔ اور روزی کمانے میں ابتری کا باعث بنے گی۔ جمہور کے کاموں کا انتظام بالکل الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ کیونکہ غیر مشروع مساوات کے جاری ہونے میں بھی خطرہ مستور ہے۔

پس بہتر یہ ہے کہ اعتدال جاری ہو۔ اور اعتدال یہ ہے کہ ایسے قوانین و آئین بنائے جائیں جو بعض لوگوں کے بے ضرورت حد سے زیادہ ثروت جمع کرنے کے روکنے والے اور جمہور کی احتیاج ضروری کو پورا کرنے والے ہوں۔ مثلاً اہل تجارت اور کارخانوں کے مالک ہر روز ایک اچھا خاصہ خزانہ جمع کر لیتے ہیں۔ مگر بیچارے عملہ والے اتنی بھی اجرت نہیں پاتے جو اُن کی روزانہ روزی کے لئے کافی ہو۔ یہ سخت بے انصافی ہے۔ ایک منصف شخص اسے کبھی پسند نہ کرے گا۔ پس یا تو ایسے قوانین بنائے جائیں کہ عملہ والے اہل کارخانہ سے اجرت یومیہ بھی لیں اور کام کی وسعت کے مطابق منافع میں بھی چوتھے یا پانچوں حصے کے شریک ہوں، یا فوائد و منافع میں عملہ والے اور اہل کارخانہ ایک معتدل طریقہ پر شریک ہوں۔ یعنی سرمایہ اور کارخانہ تو صاحب کارخانہ کا ہو اور شغل و کام اہل عملہ کا ہو۔ یا یہ کہ عملہ والوں کی اجرت یومیہ ایک معتدل رقم ہو۔ اور جب وہ بے کار یا کسی اور طرح سے معذور یا کمزور ہو جائیں تو کارخانہ کی آمدنی سے انہیں اتنا ملتا رہے کہ جس سے وہ اپنے آپ کو پال سکیں۔ یا اجرت اس اندازہ پر ہو کہ اہل عملہ کچھ تو اپنی روزانہ ضروریات پر خرچ کریں اور کچھ ضعف و ناتوانی کے ایام کے لئے جمع کرتے رہیں۔ جب کام اس طرح پر چلے گا تو نہ تو

صاحبِ کارخانہ ہی ہر روز ایک خزانہ جمع کر سکے گا جو کسی طرح بھی اُس کے لئے فائدہ مند نہیں (کیونکہ ثروت جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو صاحبِ ثروت شخص ایک بھاری بوجھ کے نیچے دب جاتا ہے اور نہایت تکلیف و محنت میں پڑ جاتا ہے اور اس کثیر دولت کے دائرہ کا انتظام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور انسان کی ذاتی طاقتیں کمزور پڑ جاتی ہیں) اور نہ عملہ والے اور مزدور محنت و مشقت کی سختی کے سبب کمزور ہونگے۔ اور نہ تمام عمر احتیاج کی سختیوں میں مبتلا رہیں گے۔ پس معلوم و مسلم ہو گیا کہ جمہور کی احتیاج کے ہوتے ہوئے صرف چند لوگوں کا بے حساب دولت رکھنا ظلم و بے انصافی ہے۔

اسی طرح مساواتِ تام بھی نوعِ انسان کی زندگانی اور اُس کی راحت و آرام وانتظام و آسایش میں خلل ڈالنے والی ہے۔

اس صورت میں اعتدال سب سے بہتر ہے۔ اور یہ ہے کہ اہلِ ثروت کو چاہئے کہ اکتسابِ منافع میں اعتدال کو نظر کے سامنے رکھیں۔ اور فقیروں اور حاجتمندوں کی رعایت کو منظور رکھیں۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ عملہ والوں اور مزدوروں کے لئے ایک اچھی خاصی روزانہ اُجرت بھی مقرر کریں۔ اور کارخانہ کے منافع میں سے بھی اُنھیں کچھ حصّہ دیا جائے۔

المختصر یہ ہے کہ اہلِ کارخانہ اور عملہ اور مزدوروں کے حقوق مشترکہ کے بارے میں ایک قانون بنایا جائے جو اہلِ کارخانہ کے معتدل منافع کا سبب ہو۔ اور مزدوروں کی معیشتِ ضروری کا کفیل اور اُن کے مستقبل کا نگہبان ہو۔ کہ اگر عملہ میں سے کوئی عاجز یا بے کار ہو جائے یا بوڑھا اور ناتوان ہو جائے۔ یا مر جائے اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جائے تو وہ مفلسی کی سختی سے در بدر و خاک بسر نہ ہوں۔ لازم ہے کہ کارخانے کی آمدنی سے کچھ نہ کچھ اُنھیں حق ملتا رہے۔ اسی طرح اہلِ عملہ کو بھی چاہئے کہ وہ غدر اور سرکشی نہ کریں اور اپنے حق سے زیادہ نہ مانگیں اور جبر و اعتصاب سے کام نہ لیں۔ اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنا پیشہ بنائیں اور حد سے بڑھی ہوئی اُجرت نہ مانگیں بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ طرفین کے معتدل حقوق عدل و حقانیت کے قانون کی بنا پر محقق و مسلم ہو جائیں۔ اور اُن میں سے جو فریق زیادتی کرے فیصلہ کے بعد ملزم قرار دیا جائے اور پوری پوری قوت کے ساتھ قطعی سزا کو جاری کریں۔ تاکہ کاروبار منتظم ہو جائے اور مشکلات ہٹ جائیں۔

اہلِ عملہ اور اہلِ کارخانجات کے درمیان مشکلات میں حکومت و عدالت کا مداخلہ بالکل قانون کے اندر ہے۔ اِس معمولی معاملہ کی طرح نہیں ہے جو مزدور اور جزئی کاروبار والوں کے درمیان ہو جسے پبلک سے تعلق نہیں ہوتا جس میں حکومت کو مداخلت کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ اگرچہ اہلِ عملہ اور صاحبانِ کارخانجات کا مسئلہ ایک مخصوص مسئلہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر جو مشکلات اس سے پیدا ہوتی ہیں وہ تمام پبلک پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ تجارت، صنعت

اور فلاحت کے امور بلکہ ملت کا عام کاروبار سب ایک دوسرے سے مرتبط ہیں۔ اگر ایک میں فتور واقع ہوتا ہے تو اس کا مضر اثر عام لوگوں پر پڑتا ہے۔ لہٰذا عملہ اور صاحبانِ کارخانجات کے درمیان جو مشکلیں پیدا ہوتی ہیں اُن کا اثر چونکہ عوام پر پڑتا ہے۔ اس لئے حکومت و عدالت کو حق ہے کہ وہ اس میں دخل دے۔ اور جب دو شخصوں کے درمیان جزئی حقوق کے بارے میں اختلاف واقع ہوتا ہے تو ایک ثالث کی ضرورت پڑتی ہے جو مقدمہ کا فیصلہ کرے۔ یہ ثالث حکومت ہے۔

پس مسئلہ اعتصاب جو تمام مملکت میں خلل انداز ہوتا ہے اور جو کبھی اہل عمل کی بے انصافی سے اور کبھی صاحبانِ کارخانجات کی طمع سے پیدا ہوتا ہے کس طرح حکومت کے زیر اثر نہیں آسکتا۔

سبحان اللہ! ایک انسان اپنی نوع کے ایک شخص کو بھوکا، ننگا اور بے سروسامان دیکھ کر کس طرح خود ایک عالیشان قصر میں راحت و آسائش سے رہ سکتا ہے۔ اور کسی کو نہایت احتیاج کی حالت میں دیکھ کر کس طرح اپنی ثروت سے ممنون و خوشنود ہو سکتا ہے۔ اسی لئے خدائی شریعتوں میں یہ قانون مقرر ہے کہ اہل ثروت محض فقیروں کی مدد اور ضعیفوں کی دستگیری کے لئے ہر سال کچھ روپیہ اپنے مال سے خرچ کریں۔ یہ شریعتِ الٰہی کے بنیادی اصول میں سے ہے اور ہر ایک پر فرض ہے۔ چونکہ اس کے بارے میں انسان بظاہر حکومت کی طرف سے مجبور و محکوم نہیں ہوتا۔ بلکہ خوشدلی اور نہایت رَوح و ریحان سے فقیروں کے لئے خرچ کرتا ہے۔ اس لئے یہ نہایت محبوب و مرغوب اور شیریں ہے۔ اور کتب و الواحِ الٰہی میں جو پاک اعمال مذکور ہیں اُن کا مقصود یہی ہے۔ والسلام

(عط)

موجودات کی حقیقت

فرقہ سوفسطائیہ کا خیال ہے کہ یہ سب موجودات اوہام ہیں۔ ہر موجود ایک وہم محض ہے۔ بالکل وجود نہیں رکھتا۔ یعنی موجودات کا وجود سراب کی طرح ہے۔ یا پانی اور آئینہ میں نظر آنے والی صورتوں کی مانند ہے۔ جو صرف نمائش ہی نمائش ہیں۔ اِن کی جڑ بُنیاد یا حقیقت مطلقً نہیں ہے۔ ان کا خیال باطل ہے۔ کیونکہ موجودات کی ہستی وجودِ حق کے مقابلے میں اوہام ہے۔ مگر رتبہ امکان میں موجودات کا وجود ثابت و محقق ہے اور قابلِ انکار نہیں۔ مثلاً جمادات کا وجود، انسانی وجود کے مقابلے میں عدم ہے۔ کیونکہ انسان جب بظاہر معدوم ہو جاتا ہے تو اس کا جسم جماد ہو جاتا ہے۔ مگر جماد، عالَمِ جماد میں وجود رکھتا ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ مٹی وجودِ انسان کے مقابلے میں

معدوم ہے۔ اور اُس کا وجود وہم ہے۔ مگر مرتبۂ جمادی میں مٹی وجود رکھتی ہے۔ اسی طرح موجودات کا وجود حق کے وجود کے مقابلے میں سراسر وہم اور بالکل معدوم ہے، اور واقعی اُس نمائش کی مانند ہے جیسی صورت کی آئینے میں ہوتی ہے۔ مگر وہ صورت جو آئینہ میں دکھائی دیتی ہے اگرچہ اوہام میں سے ہے مگر اس موہومہ صورت کی اصل حقیقت وہ شخص عاکس ہے جس کی صورت آئینہ میں ظاہر ہوتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ عکس، عاکس کے مقابلے میں وہم ہے۔ پس واضح ہوگیا کہ اگرچہ موجودات حق کے وجود کے مقابلے میں وجود نہیں رکھتیں بلکہ مانند سراب اور اُن صورتوں کی مانند ہیں جو آئینہ میں دکھائی دیتی ہیں تو بھی اپنے رتبہ میں وجود رکھتی ہیں۔ اسی لئے خدا سے غافل رہنے والوں اور منکروں کو حضرت مسیح مردہ کہتے تھے۔ حالانکہ وہ لوگ بظاہر زندہ تھے۔ مگر اہل ایمان کے مقابلے میں مُردہ اور گونگے اور اندھے اور بہرے تھے۔ یہی مُراد حضرت مسیح کے اس قول سے تھی کہ "مُردوں کو اپنے مُردے دفن کرنے دے۔"

(ف)

قدیم وحادث

سوال

قدیم و حادث کتنی قسم کے ہیں؟

جواب

بعض حکیموں اور فلاسفروں کا قول ہے کہ قدیم کی دو قسمیں ہیں۔ قدیم ذاتی وقدیم زمانی۔ حادث کی بھی دو قسمیں ہیں۔ حدوثِ ذاتی و حدوثِ زمانی۔ قدیم ذاتی وہ وجود ہے جو کسی علت سے مسبوق نہ ہو۔ حدوثِ ذاتی جو علت سے مسبوق ہے۔ قدیم زمانی لا اوّل ہے۔ حدوثِ زمانی کا اوّل و آخر ہے۔ کیونکہ ہر چیز کے وجود کی چار علتیں ہیں۔ علتِ فاعلی۔ علتِ مادّی۔ علتِ صوری اور علتِ غائی۔ مثلاً یہ اس تخت کا بنانے والا بڑھئی ہے۔ مادّہ لکڑی ہے اور صورت جو خود تخت ہے۔ اور اس کی علتِ غائی اس پر بیٹھنا ہے۔ پس یہ تخت حادثِ ذاتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی علت ہے اور اس کا وجود بھی علت سے مشروط ہے۔ اس کو حادثِ ذاتی و حادثِ حقیقی کہتے ہیں۔ یہ عالم کون اپنے بنانے والے کے مقابلے میں حادثِ حقیقی ہے چونکہ جسم رُوح سے مدد پاتا ہے اور رُوح سے ہی قائم ہے۔ اِس لئے رُوح کے

مقابلے میں جسم حادث ذاتی ہے اور رُوح جسم سے مُستغنی ہے۔ جسم کے مقابلے میں قدیم ذاتی ہے۔ اگرچہ روشنی آفتاب کے لئے لازم ملزوم ہے مگر آفتاب قدیم اور روشنی حادث ہے۔ کیونکہ روشنی کا وجود آفتاب کے وجود پر موقوف ہے۔ مگر آفتاب کا وجود شعاع کے وجود پر موقوف نہیں۔ وہ فائض ہے اور یہ اُس کا فیض ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وجود و عدم دونوں اضافی ہیں۔ اگر کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز عدم سے وجود میں آئی ہے، اس سے مقصود عدمِ محض نہیں ہے۔ یعنی حالِ قدیم حالِ حاضر کی نسبت عدم تھا۔ کیونکہ عدمِ محض استعدادِ وجود نہ رکھنے کے سبب وجود نہیں پا سکتا۔ انسان موجود ہے۔ جماد بھی موجود ہے۔ مگر جماد کا وجود انسان کے وجود کی نسبت عدم ہے۔ کیونکہ انسان کا جسم جب معدوم ہو جاتا ہے تو خاک و جماد ہو جاتا ہے۔ اور جب خاک عالمِ انسان میں آتی ہے تو وہ مُردہ جسم زندہ ہوتا ہے اور انسان موجود ہو جاتا ہے۔ اگرچہ خاک اپنے مقام میں وجود رکھتی ہے مگر انسان کے وجود کی نسبت عدم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دونوں موجود ہیں لیکن خاک و جماد کی ہستی انسان کی ہستی کے مقابلے میں عدم و منفی ہے۔ کیونکہ انسان معدوم ہو کر خاک و جماد ہو جاتا ہے۔

پس عالمِ امکان اگرچہ موجود ہے۔ مگر وجودِ حق کے مقابلہ میں معدوم و نابود ہے۔ انسان و خاک دونوں موجود ہیں مگر کہاں وجودِ جمادی اور کہاں وجودِ انسانی۔ وہ اس کے مقابلہ میں عدم ہے۔ اسی طرح خلق کا وجود حق کے وجود کے مقابلے میں عدم ہے۔ پس اگرچہ عالمِ کون ہستی رکھتا ہے مگر حق کے مقابلہ میں عدم ہے۔ اس سے واضح و مشہود ہو گیا کہ کائنات وجود رکھتے ہوئے حق اور کلمۃ اللہ کے مقابلے میں معدوم ہے۔ یہ ہے کلمۃ اللہ کی اوّلیت اور آخریت کہ فرمایا ہے کہ "میں الف اور یٰ ہوں"۔ کیونکہ وہ فیض کا سرچشمہ اور انتہا ہے۔ خلقِ حق کے ساتھ ہمیشہ سے رہی ہے۔ شمسِ حقیقت سے شعاع ہمیشہ روشن اور چمکتی رہی ہے۔ کیونکہ آفتاب بے نور ظلمت و یجور ہے۔ خدا کے اسماء و صفات بھی کائنات کے وجود کے مقتضی ہیں۔ قدیم کے فیض میں تعطیل جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کمالاتِ الٰہیہ کے منافی ہے۔

(۸۱) مسئلہ تناسخ

سوال :- مسئلہ تناسخ جسے بعض اقوام مانتے ہیں کس طرح ہے؟

جواب :- جو کچھ ہم کہینگے اُس سے ہماری غرض حقیقت کا بیان کرنا ہے۔ کسی قوم کے عقائد کی توہین نہیں صرف واقعہ کا بیان کرنا ہے اور بس۔ کسی شخص کے اعتقاد سے ہمیں تعرض نہیں اور نہ ہم اعتراض کو روا رکھتے ہیں

تناسخ ماننے والے لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو عالمِ آخرت میں عذاب و ثواب کے معتقد نہیں۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ انسان تناسخ و رجوع کے ذریعے اسی دُنیا میں سزا و جزا دیکھے گا۔ وہ جنت و دوزخ کو اسی جہان کے اندر محصور جانتے ہیں کسی اور عالم کے قائل نہیں ہیں۔ اس فرقہ کی پھر دو قسمیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انسان اس دُنیا میں حیوان کی صورت میں لوٹ کر آتا ہے تاکہ سخت سزا پاکے اور عذاب الیم اُٹھا کر عالمِ حیوان سے دوبارہ عالمِ انسان میں آئے۔ اور اسے تناسخ کہتے ہیں۔ دوسری قسم کا خیال یہ ہے کہ عالمِ انسان سے عالمِ انسان ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور رجوع کے وقت پہلی زندگانی کے ثواب اور جزا کو مشاہدہ کرتا ہے۔ اسے تناسخ کہتے ہیں۔ دونوں فرقے اس دُنیا کے سوا دوسری دُنیا کے قائل نہیں ہیں۔

اہل تناسخ کا دوسرا فرقہ اُس جہان کا قائل ہے۔ اور تناسخ کو کاملیت تک پہنچنے کا ذریعہ خیال کرتا ہے کہ انسان اس جہان میں آنے اور جانے سے بتدریج کمال حاصل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ مرکز کمال تک پہنچ جاتا ہے یعنی نفوس مادّہ اور قوت سے مل کر بنے ہیں۔ مادّہ شروع میں یعنی دَورِ اوّل میں ناقص رہتا ہے اور جب مکرر اس دُنیا میں آتا ہے تو ترقی کرتا ہے اور صفائی و لطافت پاتا ہے۔ حتیٰ کہ آئینہ کی مانند شفاف ہو جاتا ہے۔ اور قوت جس سے مُراد رُوح ہے تمام کمالات کے ساتھ اُس میں نمودار ہوتی ہے۔ یہ ہے اہلِ تناسخ و تواسخ کا مسئلہ جو ہم نے مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ اگر تفصیل کریں تو بہت وقت صرف ہوگا۔ یہ مجمل ہی کافی ہے۔

اِس مسئلہ کے معتقد عقلی دلائل و براہین نہیں رکھتے۔ صرف تصور و قرائن سے استنباط کرتے ہیں۔ قطعی دلیل و بُرہان سے کام نہیں لیتے۔ تناسخ کے معتقدوں سے بُرہان و دلیل طلب کرنی چاہیئے۔ قرائن، تصور اور اعتقادات نہیں۔

آپ نے مجھ سے تناسخ کے ناممکن ہونے کے دلائل و براہین پوچھے ہیں۔ اس لئے اب ہم اُن کا بیان کرتے ہیں۔ تناسخ کے ناممکن ہونے کی پہلی دلیل یہ ہے کہ ظاہر عنوانِ باطن ہے۔ مُلک، آئینہ ملکوت ہے۔ عالمِ جسمانی، عالمِ رُوحانی کے مطابق ہے۔ پس مُلاحظہ فرمائیے کہ عالمِ محسوس میں تجلّی تکرار نہیں پاتی۔ کیونکہ کوئی ایک کائن بھی من جمیع الوجوہ دوسری کائنات کے مشابہ و مماثل نہیں۔ توحید کی آیت تمام چیزوں میں موجود و ظاہر ہے۔ اگر دُنیا کے خزانے دانوں سے بھر جائیں تو دو دانوں کو آپ من جمیع الوجوہ بغیر فرق کے مطابق و مماثل نہ پائینگے۔ فرق و امتیاز لازماً موجود ہے۔ پس جب توحید کی دلیل تمام چیزوں میں موجود ہے اور خُدا کی وحدانیت و فردانیت سب کائنات کے حقائق میں ظاہر و مشہود ہے تو تجلّی واحد کا تکرار محال و ناممکن ہے۔ لہٰذا تناسخ یعنی روحِ واحد کا اس دُنیا میں اپنی پہلی ماہیت و حالات کے ساتھ ظاہر ہونا واحد کی تجلّی ہے۔ جو بالکل مستحیل و ناممکن ہے۔ جب کائنات ناسوتیہ کے ہر کائن کے لئے اُسی صورت

یا تجلی کے ساتھ پھر آنا محال و ناممکن ہے تو کائناتِ ملکوتیہ کے لئے بھی خواہ قوسِ نزول میں ہوں خواہ قوسِ صعود میں گذشتہ مقامات میں سے پھر کسی مقام میں آنا غیر ممکن و محال ہے۔ کیونکہ ناسوت ملکوت کے مطابق ہے۔ کائناتِ ناسوتیہ یعنی اس دُنیا کی کائنات کے لئے از روئے توع لوٹنا اور پھر آنا واضح ہے۔ یعنی وہ درخت جن میں پہلے سالوں میں پتے، شگوفے اور پھل آئے تھے آنے والے سالوں میں بعینہ ویسے ہی پتے، شگوفے اور پھل آئینگے۔ اسے تکررِ نوع کہتے ہیں۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ وہ پتے، شگوفے اور پھل تو بکھر کر عالمِ نبات سے عالمِ جماد میں چلے گئے تھے اور پھر دوبارہ عالمِ جماد سے عالمِ نبات میں آئے ہیں۔ پس یہ تکرر نہ ہوا تو کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پارسال کے پتے اور شگوفے اور پھل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اُن کے عناصر مرکبہ تحلیل ہو کر اس فضا میں بکھر گئے تھے۔ پارسال کے پتے اور پھلوں کے اجزائے مرکبہ نے تحلیل کے بعد دوبارہ بعینہ ترکیب نہیں پائی۔ اور وہی اجزائے مرکبہ پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ بلکہ نئے عناصر کی ترکیب سے اُن کی نوعیت نے عود کیا ہے۔ یعنی اُن جیسے پھل اور پتے نئے عناصر کے ملنے سے پھر پیدا ہوئے ہیں۔

اسی طرح جسم انسان بھی تحلیل کے بعد بکھر جاتا ہے اور اُس کے اجزائے مرکبہ تتر بتر ہو جاتے ہیں اگر عالمِ جماد یا عالمِ نبات سے دوبارہ یہ جسم لوٹ کر آئے تو اس جسم کے اجزائے مرکبہ پہلے انسان کے جسم کے اجزائے مرکبہ نہ ہونگے۔ وہ عناصر تحلیل ہو کر بکھر گئے تھے اور اس وسیع فضا میں منتشر ہو گئے تھے۔ پھر عناصر سے دوسرے اجزاء ملے اور دوسرا جسم پیدا ہوا۔ شاید پہلے انسان کے اجزاء میں سے کچھ تھوڑے سے بعد کے انسان میں داخل ہو گئے ہوں۔ مگر وہ پہلے اجزاء تماماً ویسے ہی بغیر گھٹے بڑھے محفوظ نہ رہے تھے۔ جو دوبارہ ترکیب پاتے۔ اور اس ترکیب و امتزاج سے بعد کا انسان وجود میں آتا۔ پس یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جسم اپنے تمام پہلے اجزاء کے ساتھ لوٹ آیا ہے۔ اور وہ پہلا شخص بعد کا شخص بن گیا ہے۔ اور اس طرح یہ تکرر حاصل ہوا ہے۔ اور یہ کہ رُوح بھی جسم کی مانند بعینہ لوٹ کر آئی ہے اور مرنے کے بعد بذاتہ اس دُنیا میں واپس آئی ہے۔

اگر ہم کہیں کہ یہ تناسخ کمال کے حاصل کرنے کے لئے ہے تاکہ مادہ صفائی حاصل کر کے شفاف ہو جائے اور پرتوِ روح نہایت کمال کے ساتھ اس میں ظاہر ہو۔ یہ بھی صرف خیال ہی خیال ہے۔ اگر بالفرض اس مطلب کو مان بھی لیں تو بھی تجدد و عود سے ماہیت کا بدلنا ناممکن ہے۔ کیونکہ جوہر نقص عود و رجوع سے حقیقتِ کمال نہیں بن سکتا۔ خالص ظلمت عود و رجوع سے مصدرِ نور نہیں ہو سکتی۔ حقیقتِ عجز دوبارہ آنے سے قدرت و قوت نہیں بن سکتی۔ ماہیتِ ناسوتیہ عود و رجوع سے حقیقتِ ملکوتیہ نہیں بن سکتی۔ درختِ زقوم

کتنا ہی لوٹ لوٹ کر آئے میٹھے پھل نہیں دے سکتا۔ اور شجرِ طیب کتنا ہی عود کرے کڑوہ میوہ نہیں لا سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ عالمِ ناسوتی میں بار بار آنا حصولِ کمال کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اہلِ تناسخ کا یہ خیال کسی برہان و دلیل پر قائم نہیں۔ بلکہ حصولِ کمال کا مدار فی الحقیقت فضلِ پروردگار ہے۔

تھیاسوفیکل خیال پر تنقید

اہلِ تھیاسوفی کا یہ خیال ہے کہ انسان قوسِ صعود میں بار بار عود و رجوع کرتا ہے حتیٰ کہ مرکزِ اعلیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وہاں مادّہ آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ اور پھر انوارِ روح نہایت قوت و زور کے ساتھ اس میں چمکتے ہیں اور یہ اپنا ذاتی کمال حاصل کرتا ہے۔ حالانکہ اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے مسائلِ الٰہیہ کی چھان بین کی ہے یہ بات مسلّم ہے کہ عوالمِ جسمانی قوسِ نزول کے آخر میں ختم ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کا مقام قوسِ نزول کے آخر اور قوسِ صعود کے شروع میں ہے۔ اور یہ مقام مرکزِ اعلیٰ کے عین مقابل ہے۔ قوسِ صعود کے اوّل سے آخر تک بے شمار مراتب روحانیہ ہیں۔ قوسِ نزول کا نام ابداع ہے اور قوسِ صعود کو اختراع کہتے ہیں۔ قوسِ نزول کی انتہا جسمانیات ہیں۔ اور قوسِ صعود کا آخر روحانیات۔ پرکار کی نوک دائرہ بنانے میں پیچھے کی طرف نہیں لوٹتی۔ کیونکہ یہ قدرتی حرکت اور انتظامِ الٰہی کے منافی ہے اور دائرہ کی خوبصورتی اور اُس کے انتظام کو بھی خراب کرے گی۔ علاوہ ازیں یہ دُنیا اِس قدر خوبصورت اور دلچسپ نہیں ہے کہ انسان اس پنجرے سے نجات پاکر دوبارہ پھر اِس دام میں آنے کی آرزو کرے۔ فیضِ ابدی کے ذریعے مراتبِ وجود میں سیر کرنے سے حقیقتِ انسان کی استعداد و قابلیت ظاہر و عیاں ہوتی ہے نہ کہ تکرّر اور رجوع سے۔ اِس سیپ کا جب ایک مرتبہ مُنہ کُھل جاتا ہے تو ظاہر و عیاں ہو جاتا ہے کہ اِس میں موتی ہے یا کنکر۔ یہ پودہ جب ایک دفعہ اُگ آئے گا تو جو کانٹا یا پھول اُس میں اُگنے والا ہے اُگیگا۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ پھر سے پیدا ہو۔ علاوہ ازیں عوالم میں خطِ مستقیم پر نظمِ طبیعی کے مطابق سیر و حرکت کرنا زندگی کا سبب ہے۔ اور نظمِ طبیعی کے خلاف چلنا موت کا باعث ہے۔ اور صعود کے بعد روح کا رجوع حرکتِ طبیعی کے منافی اور نظمِ الٰہی کے خلاف ہے۔ اس لئے رجوع سے وجود حاصل کرنا بالکل نا ممکن اور محال ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہو گا کہ انسان عالمِ رحم سے نجات پاکر دوبارہ عالمِ رحم کی طرف لوٹ آئے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ اہلِ تناسخ و توانسخ کا کیا عجیب تصوّر ہے کہ جسم کو ظرف خیال کرتے ہیں اور روح کو مظروف۔ روح کو پانی سمجھتے ہیں اور جسم کو پیالہ۔ پانی اِس پیالے سے نکل کر دوسرے پیالے میں چلا جاتا ہے۔ یہ خیال بچوں کا کھیل ہے۔ اتنا نہیں سوچتے کہ روح مجرّدات میں سے ہے اور دخول و خروج سے مبرّا ہے۔ اس کا تعلق بدن سے ایسا ہی ہے جیسا آفتاب کا آئینہ سے۔ اگر عالمِ جسمانی میں بار بار آنے سے روح قطعِ مراتب کرتی اور کمالِ ذاتی پاتی ہے تو بہتر تھا کہ پروردگار عالمِ جسمانی میں

رُوح کو بڑھاتا۔ تاکہ کمالات وفیوضات کو حاصل کرتی۔ ہلاکت کا پیالہ پینا اور دوبارہ زندگی حاصل کرنا کچھ ضرور نہ تھا۔

یہ خیال کہ زندگی صرف اِس جہانِ فانی میں ہی محصور ہے۔ اور دوسرے عوالمِ اِلٰہی کا انکار بعض اہلِ تناسخ سے پھیلا ہے۔ حالانکہ عوالمِ الٰہی بے انتہا ہیں۔ اگر عوالمِ الٰہی اِس عالمِ جسمانی تک ہی ختم ہوجاتے تو یہ پیدائش ہی بے فائدہ ہوتی۔ بلکہ زندگی ایک بچوں کا کھیل ہوتی کہ اِس نامتناہی کائنات کا شریف ترین نتیجہ انسان ہے۔ اور وہ بھی چند روز اِس دارِ فانی میں آتا اور جاتا اور سزائیں بھگتتا ہؤا آخر کار کُل کاکُل ہوجاتے ہیں۔ یعنی خدا کی ایجاد اور موجودہ کائنات نامتناہی تکمیل ہوکر آخر کو پہنچ جاتی ہیں۔ تب خدا کی خدائی اور اسما و صفات اِن موجودہ کائناتِ رُوحانیہ کے حق میں بے اثر اور بے ثمر ہوجاتے ہیں سُبحان ربّك ربّ العزّة عمّا یصفون (پاک ہے تیرا خُدا خدائے برتر ان کے تمام توصیفی بیانات سے بالا ہے)

ایسی ہی محدود و قصیر عقلیں اُن پُرانے فلاسفروں مثلاً بطلیموس وغیرہ کی تھیں۔ جن کا اعتقاد اور خیال یہ تھا کہ جہان اور زندگی اور وجود صرف اِس کُرۂ ارض تک ہی محصور ہے۔ اور یہ وجود کی فضائے نامتناہی آسمان کے نو طبقوں میں گھری ہوئی ہے۔ اور سب خالی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ ان کی عقلیں کس قدر موٹی اور اُن کے خیال کیسے کمزور تھے۔ اَب اہلِ تناسخ بھی اسی جھوٹے خیال کے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہ خدا کی دُنیائیں صرف انسانی عوالمِ تصوّر تک ہی محدود ہیں۔ بلکہ بعض اہلِ تناسخ مثلاً دروزیوں اور نصیریوں کا یہ خیال ہے کہ زندگی صرف اِس جہانِ جسمانی تک ہی محصور ہے۔ یہ خیال کس قدر جاہلانہ ہے۔ کیونکہ جب اِس کونِ نامتناہی میں جو ایسے جمال و کمال وعظمت سے نمودار ہے عالمِ جسمانی کے اجرامِ نورانی اتنے بے شمار ہیں تو پھر خدائی عوالمِ رُوحانی جو اصل اساس ہیں کس قدر بے انتہا اور بے پایاں ہیں فاعتبروا یا اُولی الابصار (اہلِ بصیرت ذرا سوچو اور غور کرو)

الغرض اَب ہم اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔ خدائی کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں رجعت کا ذکر پایا جاتا ہے۔ مگر نادانوں نے اس کے معنوں کو نہ سمجھ کر اسے تناسخ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ رجعت سے انبیائے الٰہی کا مقصد رجعتِ ذاتی نہیں بلکہ رجعتِ صفاتی ہے۔ یعنی رجعت مظہر نہیں بلکہ رجعتِ کمالات ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ یحییٰ بن زکریا حضرت ایلیا ہیں۔ اِس بیان سے یہ مُراد نہیں کہ حضرت ایلیا کا نفسِ ناطقہ اور اُن کی شخصیت حضرت یحییٰ کے جسم میں آگئی تھی۔ بلکہ مُراد یہ ہے کہ حضرت ایلیا کے کمالات اور اُن کی صفات حضرت یحییٰ میں جلوہ نما ہوئی تھیں۔

چراغ جو کل رات اِس محفل میں روشن تھا آنے والی رات میں جب دوسرا چراغ جلایا جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ کل رات کا چراغ پھر روشن ہوا ہے۔ پانی ایک چشمہ سے جاری تھا پھر بند ہوگیا۔ پھر جاری کیا جاتا ہے۔ پھر جاری ہونے پر ہم کہتے ہیں کہ یہ پانی وہی پانی ہے۔ پھر جاری ہوا ہے اور یہ چراغ بعینہٖ وہی چراغ ہے۔

اِسی سالِ گذشتہ کے موسم بہار میں پھول اور شگوفے کِھلے تھے۔ خوشگوار میوے لگے تھے۔ آنیوالے سال میں ہم کہتے ہیں کہ وہ خوشگوار میوے پھر لگے ہیں اور وہ پھول اور شگوفے اور پھل لَوٹ کر دوبارہ آئے ہیں۔ اِس بیان سے مقصد یہ نہیں ہے کہ پارسال کے پھول کے اجزائے مرکبّہ تحلیل کے بعد دوبارہ ترکیب پاکر بعینہٖ ویسے ہی لَوٹ آئے ہیں۔ بلکہ مُراد یہ ہے کہ وہ لطافت و ملاحت اور وہ پیاری خوشبو اور پیارے رنگ جو پارسال کے پھول میں تھے بعینہٖ اس سال کے پھول میں ظاہر و واضح ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اِس پھول اور اُس پھول میں مشابہت و مماثلت مقصود ہے اور جس رجعت کا صحائفِ الٰہیہ میں ذکر آیا ہے یہی ہے۔

کتابِ ایقان میں قلمِ اعلیٰ نے اس مطلب کو نہایت تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اِس کتاب مستطاب کا مطالعہ فرمائیں تاکہ آپ اسرارِ الٰہیہ کی باریکیوں سے مطلع ہو جائیں۔ وعلیک التحیۃ والثنا۔

(ف)

وحدتِ وجود

سوال

تھیاسوفسٹ اور حضراتِ صوفیہ کا مسئلہ وحدت الوجود کس طرح ہے۔ اُن کے مقصد کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

جواب

معلوم ہو کہ یہ مسئلہ وحدت الوجود بہت پُرانا ہے۔ تھیاسوفسٹ اور حضراتِ صوفیہ سے ہی خاص نہیں بلکہ بعض حکمائے یونان بھی وحدت الوجود کے معتقد تھے۔ مثلاً ارسطو جس کا قول ہے کہ بسیطِ حقیقی تمام اشیاء ہیں۔ مگر یہ اُن میں سے کوئی ایک چیز نہیں، بسیط یہاں ترکیب کے مقابل ہے۔ یعنی حقیقتِ فردانیہ جو تقسیم و ترکیب سے مقدّس و منزّہ ہے بے انتہا صورتوں میں مُنتشر ہوگئی ہے۔ پس وجودِ حقیقی کُل چیزیں ہیں مگر اُن چیزوں میں سے کوئی ایک چیز نہیں ہے۔

المختصر وحدت الوجود کے معتقدین کا یہ اعتقاد ہے کہ وجودِ حقیقی ایک دریا کی مانند ہے اور کُل کائنات امواج کی طرح ہیں۔ یہ امواج جن سے مُراد کائنات ہے اُس وجودِ حقیقی کی بے انتہا صورتیں ہیں۔ پس حقیقت مقدسہ بحرِ قدیم ہے اور کائنات کی بے انتہا صورتیں امواجِ حادثہ ہیں۔ اسی طرح واحدِ حقیقی کو اعدادِ نامتناہی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کہ واحدِ حقیقی بے انتہا اعداد کے مراتب میں جلوہ گر ہے۔ کیونکہ اعداد واحدِ حقیقی کا ہی تکرار ہیں۔ مثلاً دو کا عدد ایک کا تکرار ہے۔ اسی طرح دوسرے اعداد بھی ؛

وحدت الوجود کی دلیل ان لوگوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ تمام کائنات خدا کی معلومات ہیں۔ اور علمِ لامعلوم پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ علم کا تعلق موجود چیزوں سے ہے۔ معدوم سے نہیں۔ خالص نیستی علم کے آئینوں میں کیا تعین و تشخص حاصل کر سکتی ہے؟ پس حقائق کائنات جو باریتعالیٰ کی معلومات ہیں۔ وجودِ علمی رکھتی تھیں کیونکہ وہ خدا کے علم کی صورت تھیں۔ اور چونکہ علم الٰہی قدیم ہے۔ اس لئے وہ بھی قدیم ہیں۔ چونکہ علم قدیم ہے اس لئے معلومات بھی قدیم ہیں۔ اور کائنات کی تشخصات و تعینات جو ذاتِ احدیت (خدا) کی معلوماتِ قدیمہ ہیں عینِ علم الٰہی ہیں اور ذاتِ احدیت کی حقیقت اور علم و معلومات کے لئے خاص وحدت محقق و مقرر ہے۔ ورنہ ذاتِ احدیت معرضِ کثرت میں پڑ جائے گی اور تعددِ قدما ماننا پڑے گا جو باطل ہے پس ثابت ہوا کہ معلومات عینِ علم ہیں۔ علم عین ذات ہے۔ یعنی عالم و علم و معلوم حقیقتِ واحد ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور خیال کرتے ہیں تو تعددِ قدیم ماننا پڑتا ہے اور تسلسل پیدا ہوتا ہے اور قدما بے انتہا ہو جاتے ہیں۔ چونکہ کائنات کی تشخصات و تعینات خدا کے علم میں عین ذاتِ احدیت تھیں اور کسی وجہ سے بھی کچھ امتیاز نہ تھا۔ اس لئے وحدتِ حقیقی تھیں تمام معلومات بساطت و وحدت کے طریقہ پر حقیقتِ ذاتِ احدیت میں مندرج و منتشر تھیں۔ یعنی بساطت و وحدت کے طریقہ پر معلومات باریتعالیٰ میں تھیں اور عینِ ذاتِ حق تھیں۔ جب خدا نے اپنی تجلّی کو ظاہر فرمایا تو کائنات کی تشخصات و تعینات نے جو وجودِ علمی رکھتی تھیں یعنی خدا کے علم کی صورتیں تھیں ظاہر میں وجودِ عینی پایا اور وہ وجودِ حقیقی بے انتہا صورتوں میں منتشر ہوگیا" یہ ہے کُلی کے استدلال کی اصل بنیاد۔

تھیاسوفسٹ اور صوفی دو قسم کے ہیں۔ ایک تو عوام ہیں۔ جو محض تقلیداً وحدتِ وجود کے معتقد ہیں اور اپنے مشہور علماء کے مطلب کو نہیں سمجھتے۔ کیونکہ عوام صوفیوں کا یہ خیال ہے کہ وجود سے مُراد عام وجودِ مصدری ہے۔ جسے انسان کا ذہن اور عقل سمجھتی ہے۔ یعنی انسان اُسے سمجھ سکتا ہے۔ حالانکہ یہ وجودِ عام اُن اعراض میں سے ایک عرض ہے جو حقائقِ کائنات میں حلول کرتا ہے۔ اور کائنات کی ماہیات جوہر ہیں اور یہ وجودِ عرضی جو کائنات سے قائم ہے اشیاء کی خاصیتوں کی مانند ہے جو اشیاء کے سبب قائم ہیں۔ یہ بھی اعراض میں سے ایک عرض ہے۔ جوہر البتہ عرض سے بڑا ہے۔ کیونکہ جوہر اصل ہے اور عرض اُس کی فرع ہے۔ جوہر اپنی

ذات سے قائم ہے۔ اور عرض دوسرے پر قائم ہے یعنی جوہر کا محتاج ہے۔ جس پر قائم ہو۔ اگر یہ مان لیا جائے تو حق فرع خلق ہوتا ہے یعنی خدا خلقت سے نکلا اور خلق کا محتاج ہے اور خلق حق سے مستغنی ہے۔ مثلاً ہر بار جب عناصر مفردہ خدا کے نظام عمومی کے مطابق ملتے ہیں تو کائنات میں کا ایک کائن پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کچھ عناصر ملتے ہیں اور اس ملنے سے ایک وجود نباتی پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دوسرے عناصر ملتے ہیں اور دوسری کائنات پیدا ہوتی ہیں۔ اس صورت میں وجود اشیاء حقائق اشیاء کی فرع ہے۔ پھر کس طرح یہ ہو سکتا ہے کہ یہ وجود اعراض میں سے ایک عرض ہے اور اپنے قیام کے لئے ایک جوہر کا محتاج ہے۔ قدیم ذاتی یا موجد کل ہو۔ مگر تھیاسوفسٹ اور صوفیوں کے ماہر علما، اس مسئلہ میں غور و خوض کرنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ موجود دو قسم کا ہے ایک وجود عام جسے انسان کا ذہن سمجھ سکتا ہے۔ یہ حادث ہے، اعراض میں سے ایک عرض ہے اور حقائق اشیاء جواہر ہیں۔ مگر وحدت وجود یہ وجود عام ذہنی نہیں۔ بلکہ وجود حقیقی مقصود ہے جو ہر تعبیر سے مقدس و منزہ ہے، اسی پر سب کا سہارا ہے اور یہ واحد ہے۔ یعنی وہ واحد حقیقی جس سے تمام اشیاء نے زندگی پائی ہے یعنی مادہ و قوت و وجود عام جنھیں انسان کی عقل سمجھ سکتی ہے۔ یہ تھیاسوفی والوں اور صوفیوں کے مسئلہ کی حقیقت ہے۔

الغرض اس بات پر کہ ما یتحقق بہ الاشیاء (وہ جس سے تمام اشیاء موجود ہیں) واحد ہے، سب اس پر متفق ہیں۔ یعنی فلاسفہ بھی اور انبیا بھی۔ لیکن فرق یہاں آکر پڑتا ہے کہ انبیاء فرماتے ہیں کہ علم حق وجود کائنات کا محتاج نہیں۔ خلق کا علم وجود معلومات کا محتاج ہے۔ اگر علم حق غیر کا محتاج ہو تو وہ علم خلق ہے علم حق نہیں۔ کیونکہ قدیم کا ضد حادث ہے اور حادث کا مخالف قدیم ہے۔ جو کچھ ہم خلق کے لئے ثابت کرتے ہیں یعنی وہ چیزیں جو لوازم حدوث ہیں، انھیں ہم حق کے لئے سلب کرتے ہیں۔ کیونکہ نقائص سے تنزیہہ و تقدیس حق کے خاص خصائص میں سے ہے۔ مثلاً حادث میں ہم جہل دیکھتے ہیں، قدیم کے لئے علم ثابت کرتے ہیں۔ حادث میں عجز دیکھتے ہیں، قدیم میں قدرت کا اثبات کرتے ہیں۔ حادث میں فقر دیکھتے ہیں، قدیم میں غنا کا اثبات کرتے ہیں یعنی حادث منبع نقائص ہے اور قدیم جامع کمالات۔ چونکہ حادث کا علم وجود معلومات کا محتاج ہے۔ علم قدیم وجود معلومات سے مستغنی ہے۔ پس کائنات کے تعینات و تشخصات کی قدمیت (جو باریتعالیٰ کی معلومات ہیں) درست نہیں۔ اور خدا کے ان اوصاف کمالیہ پر ادراکات عقلیہ حاوی نہیں کہ ہم یہ حکم لگا سکیں کہ علم الٰہی معلومات کا محتاج ہے یا نہیں۔

الغرض صوفیوں کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے، اگر ہم چاہیں کہ ان کی تمام دلیلوں کا یہاں ذکر کریں اور ان کے جواب دیں تو بہت طول ہو جائے گا۔ صوفیوں اور تھیاسفیوں کے علما و فضلا کی سب سے بڑی قطعی دلیل اور روشن برہان یہ تھی۔

مسئلہ وجود حقیقی پر یعنی ما یتحقق بہ الاشیاء، یا حقیقت ذات احدیت کے بارے میں جس سے تمام

کائنات نے وجود پایا ہے۔ سب متفق ہیں۔ فرق یہاں آکر پڑتا ہے کہ صوفی کہتے ہیں کہ حقائق اشیاء واحدِ حقیقی کا ظہور ہیں اور انبیاء فرماتے ہیں کہ وہ واحدِ حقیقی سے صادر ہیں۔ ظہور و صدور کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ تجلیٔ ظہوری سے مُراد یہ ہے کہ ایک ہی چیز بے انتہا صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً بیج جو شیٔ واحد ہے اور کمالاتِ نباتی کا مالک ہے جب ظاہر ہوتا ہے تو شاخوں، پتوں، شگوفوں اور پھلوں کی بے انتہا صورتوں میں حل ہو جاتا ہے۔ اِسے تجلیٔ ظہوری کہتے ہیں۔

تجلیٔ صدوری یہ ہے کہ وہ واحدِ حقیقی اپنی تقدیس کی بلندیوں میں باقی و برقرار ہے۔ اور وجودِ کائنات اس سے صادر ہوا نہ کہ ظاہر۔ اس کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ شعاعیں اس سے صادر ہیں اور تمام کائنات پر فائض۔ مگر آفتاب اپنی تقدیس کی بلندیوں میں قائم ہے۔ اس کے لئے تنزّل نہیں اور شعاعوں کی صورت میں بکھرا نہیں اور تعیّنات و تشخصاتِ اشیاء کے ذریعے ہویتِ اشیاء میں جلوہ نما نہیں ہوا۔

قدیم حادث نہیں ہوتا۔ غنائے مطلق اسیرِ فقر نہیں ہوتی۔ خالص کمال سراسر نقص نہیں بنتا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ صوفی حق و خلق کے قائل ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ حق، خلق کی بے انتہا صورتوں میں متخیل ہو کر ظاہر ہوا ہے۔ دریا کی مانند جو امواج کی بے انتہا صورتوں میں جلوہ نما ہو۔ یہ ناقص امواج حادثہ اسی بحرِ قدیم سے ہیں جو تمام کمالاتِ الٰہیہ کا جامع تھا۔ مگر انبیاء فرماتے ہیں کہ عالَمِ حق ہے اور عالَمِ ملکوت ہے اور عالَمِ خلق ہے۔ تین چیزیں حق سے صادر ہیں۔ اوّل فیضِ ملکوتی ہے جو صادر ہوا ہے اور حقائق کائنات میں تجلّی نما ہوا ہے۔ مثلاً شعاع جو آفتاب سے صادر ہوئی ہے اور کائنات میں جلوہ نما ہے۔ اور یہ فیض جو شعاع ہے کُل چیزوں کے حقائق میں بے انتہا صورتوں کے ساتھ تجلّی کرتا ہے اور چیزوں کی ماہیات کی استعداد و قابلیت کے مطابق تعیّن و تشخص حاصل کرتا ہے۔

صوفیوں کا قول یہ تقاضا کرتا ہے کہ غنائے مطلق تنزّل کرکے فقر کے درجے میں آتے اور قدیم، حادث صورتوں میں مقیّد ہو۔ اور خالص قدرت عجز کے آئینوں میں حدودِ امکانیہ سے محدود ہو۔ اور یہ بدیہی البطلان ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ انسانی حقیقت جو اشرف المخلوقات ہے، حیوانی حقیقت میں تنزّل نہیں کرتی۔ اور حیوانی ماہیت جو قوّتِ حسّاسہ کی مالک ہے رُتبۂ نبات میں اُترنا پسند نہیں کرتی۔ حقیقتِ نباتیہ جو قوّتِ نامیہ ہے، حقیقتِ جمادیہ میں ساقط نہیں ہوتی۔ مختصر یہ ہے کہ حقائقِ عُلویہ مراتبِ سفلیہ میں تنزّل اور ہبوط نہیں کرتے۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ حقیقتِ کُلّیۂ الٰہیہ جو تمام اوصاف و نعوت سے مقدّس ہے۔ باوجود خالص تنزیہہ و تقدیس کے اِس دُنیا کے حقائق اور صورتوں میں جو مصدرِ نقائص ہیں حلول کرے یہ سراسر وہم اور خیالِ محال ہے۔ بلکہ وہ جوہرِ تقدیس کمالاتِ ربوبیت و اُلوہیت کا جامع ہے۔

اور تمام کائنات اُس کی تجلّی صدوری کے فیض سے مستفیض اور اُس کے جمال وکمالِ ملکوتی کے انوار کے پانے والے ہیں جس طرح تمام زمینی کائنات جو آفتاب کی شعاع سے فیضِ نور پاتی ہیں۔ اور آفتاب نیچے اُتر کر موجوداتِ زمینی کے حقائقِ مستفیضہ میں نہیں آتا۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد اور رات کے زیادہ گذر جانے کے سبب اس سے زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ والسلام

(فج)

موازینِ ادراک

میزانِ ادراک جو مُسلّم ہے چار موازین پر منحصر ہے۔ یعنی حقائق اشیاء ان چار چیزوں سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اوّل میزانِ حس ہے۔ یعنی جو کچھ دیکھنے، سُننے، چکھنے، سونگھنے، چھونے کے ذریعے دریافت ہو اُسے محسوس کہتے ہیں۔ آجکل یورپ کے تمام فلاسفر اس میزان کو مکمّل سمجھتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ سب سے بڑی میزان حس ہے۔ اور اس میزان کو بے خطا قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ میزانِ حس ناقص ہے کیونکہ بے خطا نہیں۔ مثلاً قوائے حسیہ میں سب سے بڑی قوت نظر ہے۔ نظر سراب کو دیکھتی ہے اور آئینہ میں معکوس تصاویر کو سچا سمجھتی اور موجود جانتی ہے۔ بڑے بڑے اجسام کو چھوٹا سمجھتی ہے۔ چکّر کھاتے ہوئے نقطہ کو دائرہ خیال کرتی ہے۔ زمین کو ساکن اور آفتاب کو متحرک سمجھتی ہے۔ اسی طرح بہت سی باتوں میں خطا کرتی ہے۔ اس لئے اُس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری میزان، میزانِ عقل ہے۔ یہ میزان پہلے بڑے بڑے فلاسفروں کے نزدیک میزانِ ادراک تھی۔ وہ عقل سے استدلال کرتے تھے۔ اور عقلی دلیلوں کو مضبوطی سے پکڑتے تھے۔ اُن کے تمام استدلال عقلی ہیں۔ باوجود اس کے بہت اختلاف کرتے تھے اور اُن کی رائیں مختلف ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ خیال کو بدل بھی دیتے تھے۔ یعنی بیس سال تک ایک مسئلہ کو عقلی دلیلوں سے ثابت کرتے تھے اور بیس سال کے بعد عقلی دلیلوں سے اُس کی ہی نفی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ افلاطون نے بھی پہلے پہل عقلی دلیلوں سے زمین کے سکون اور آفتاب کی حرکت کو ثابت کیا تھا۔ پھر عقلی دلیلوں سے ثابت کیا کہ آفتاب مرکز ہے اور زمین متحرک۔ اس کے بعد بطلمیوس کے خیال نے شہرت پائی اور افلاطون کا خیال بالکل فراموش کر دیا گیا۔ آخر پھر ایک رصد لگانے والے نے دوبارہ اس رائے کو زندہ کیا۔ پس کل اہلِ ریاضی اختلاف کرتے تھے۔ حالانکہ سب عقلی

دلیلیں دیتے تھے۔ اسی طرح ایک مسئلہ کو ایک مدت تک عقلی دلائل سے ثابت کرتے تھے۔ اور کچھ مدت کے بعد عقلی دلائل سے ہی اس کی نفی کرتے تھے۔ ایک فلاسفر ایک مدت تک ایک رائے پر ثابت تھا۔ اور اس کے ثبوت میں دلیلیں اور براہین پیش کرتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد اس رائے کو بدل دیتا تھا۔ اور عقلی دلیلوں سے ہی اس کی نفی کرتا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ میزانِ عقلی تام نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے فلاسفروں کا اختلاف، ان کا عدم ثبات اور ان کے خیالات کی تبدیلیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ میزانِ عقلی کامل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر میزان کامل ہوتی تو چاہیئے تھا کہ سب متحد الخیال اور متفق الآراء ہوتے۔

تیسری میزان میزانِ نقل ہے۔ اور وہ پاک کتابوں کی نصوص ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ خدا نے تورات میں ایسا فرمایا ہے۔ انجیل میں ایسا فرمایا ہے۔ یہ میزان بھی کامل نہیں ہے۔ اس لئے کہ نقل کو عقل سمجھتی ہے۔ جب خود عقل ہی قابلِ خطا ہے تو پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اقوالِ منقولہ کے معنوں کو سمجھنے اور جاننے میں اس نے غلطی نہیں کی۔ کیونکہ اس کے لیے خطا کرنا ممکن ہے۔ اس لئے یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میزان کو رؤساتے ادیان پیش کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ نصوصِ کتاب سے سمجھتے ہیں، وہ ان کی عقل کے ادراکات ہیں۔ حقیقتِ واقعہ نہیں ہیں۔ کیونکہ عقل ایک ترازو کی مانند ہے۔ اور نصوص سے سمجھے ہوئے معنی اس چیز کی مانند ہیں جس کا وزن کیا جائے۔ جب ترازو ہی بگڑا ہوا ہے تو اس چیز کا وزن کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔

پس جاننا چاہیئے کہ جو کچھ لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور جس کے لوگ معتقد ہیں وہ قابلِ خطا ہے۔ کیونکہ ایک چیز کے اثبات و نفی میں اگر حسی دلیل دیتے ہیں تو یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ میزانِ کامل نہیں اور اگر عقلی دلیل دیتے ہیں تو وہ بھی کامل نہیں۔ اگر نقلی دلیل دیتے ہیں تو وہ بھی تام نہیں۔ پس واضح ہو گیا کہ لوگوں کے ہاتھ میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس پر اعتماد کیا جائے۔ اس لئے فیض رُوح القدس صحیح میزان ہے۔ کہ اس میں بالکل شک و شبہ نہیں اور وہ رُوح القدس کی تائیدات ہیں جو انسان کو پہنچتی ہیں اور اس مقام میں اُسے یقین حاصل ہوتا ہے۔

(۸۴)

تعلیماتِ مظاہرِ الٰہیہ کی پیروی ضروری ہے

سوال

وہ لوگ جو نیک اعمال کر رہے ہیں۔ سب کی بھلائی چاہتے ہیں۔ پسندیدہ اخلاق رکھتے ہیں۔

تمام مخلوق کے ساتھ محبت و مہربانی سے پیش آتے ہیں، نفیروں کی پرورش کرتے ہیں، صُلح عمومی کے لئے کوشاں ہیں۔ پھر انھیں تعالیم الٰہیہ کے ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے یہ لوگ اپنے آپ کو آزاد شمار کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کا حال کیسا ہے؟

جواب

جاننا چاہیے کہ ایسے اعمال مقبول ہیں۔ یہ رفتار و گفتار قابلِ تعریف و پسندیدہ ہے۔ اور عالمِ انسانی کا شرف ہے۔ مگر تنہا یہ اعمال کافی نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک نہایت ہی خوبصورت جسم کی طرح ہیں جس میں جان نہیں ہے۔ ہمیشہ کی زندگی، دائمی عزت، کامل نورانیت اور حقیقی فوز و فلاح کا پہلا ذریعہ خُدا کا عرفان ہے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ خُدا کی معرفت ہر ایک عرفان پر مقدم ہے۔ اور یہ عالمِ انسانی کی سب سے بڑی بزرگی ہے۔ کیونکہ وجود میں حقائقِ اشیاء کی معرفت جسمانی فائدے بخشتی ہے اور ظاہری تہذیب بڑھتی ہے۔ مگر عرفانِ الٰہی روحانی ترقی و انجذاب کا، حقیقی بصیرت کا، عالمِ انسانی کی بزرگی کا، تہذیب ربانی کے بڑھنے کا، اخلاق کے درست ہونے کا اور قلب میں نورانیت پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے۔

دوسرا ذریعہ خُدا کی محبت ہے۔ عرفانِ خُدا کے باعث چراغ محبتِ الٰہی، فانوسِ دل میں روشن ہوتا ہے اور اُس کی چمکتی ہوئی کرنیں تمام آفاق کو روشن کرتی ہیں۔ وجودِ انسان کو حیاتِ ملکوتی بخشتی ہیں۔ فی الحقیقت وجودِ انسانی کا نتیجہ محبت اللہ ہے۔ محبت اللہ روحِ حیات اور فیضِ ابدی ہے۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو دنیا تاریک ہوتی۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو انسان کے قلوب مُردہ اور احساساتِ وجدانی سے محروم رہتے۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو عالمِ انسانی کی خوبیاں محو و نابود رہتیں۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو ارتباطِ حقیقی یا اتحادِ روحانی انسانوں میں نہ ہوتا۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو عالمِ انسانی کی وحدت کا نور خاموش رہتا۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو مشرق و مغرب دو دلبروں کی مانند ایک دوسرے سے بغلگیر نہ ہوتے اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو اختلاف و انشقاق، اتحاد و اتفاق سے نہ بدلتے۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو بے گانگی یگانگت پر ختم نہ ہوتی۔ اگر محبت اللہ نہ ہوتی تو اغیار یار نہ بنتے۔ عالمِ انسانی کی محبت، محبت اللہ کی ایک کرن ہے اور خُدا کی عنایت کے فیض کا ایک جلوہ ہے۔

یہ واضح ہی ہے کہ نوعِ انسان کے حقائق مختلف، آراء متضاد اور احساسات متفرق ہیں۔ افرادِ نوعِ انسان میں خیالات و آراء اور ادراکات و احساسات میں تفاوت اُس کے لوازمِ ذاتی سے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ وجود کائنات کے مراتب میں تفاوت کا ہونا لوازمِ وجود میں سے ہے جو بے انتہا صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس ہم ایک ایسی کامل قوت کے محتاج ہیں جو سب کے احساسات، آراء اور خیالات پر غالب

وہ قوّت اِس اختلاف کو اُڑا دے اور تمام لوگوں کو وحدتِ عالمِ انسانی کے نفوذ کے نیچے لے آئے۔ یہ واضح وظاہر ہے کہ عالمِ انسانی میں سب سے بڑی قوّت محبت اللہ ہے۔ مختلف اقوام کو یگانگی کے خیمہ میں لاتی ہے۔ اور جنگجو وفسادی فرقوں اور قبیلوں میں بے نہایت محبت اور دوستی پیدا کر دیتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت مسیح محبت اللہ سے کس قدر مختلف قوموں، قبیلوں اور فرقوں کو سایۂ کلمتہ اللہ کے اندر لائے تھے۔ اور ہزاروں سالوں کی عداوت ودشمنی کو محو ونابود کر دیا تھا۔ جنسی ووطنی تعصب کو درمیان سے اُٹھا دیا تھا۔ اور دلی و جانی اتحاد پیدا کر دیا تھا۔ سب مسیحی سچے اور روحانی ہو گئے تھے۔

تیسرا ذریعہ۔ عالمِ انسانی کے شرف کا، نیک نیّتی ہے۔ نیک نیّتی نیک اعمال کی جڑ ہے بعض محققین نے نیک نیّتی کو عمل پر ترجیح دی ہے۔ کیونکہ نیک نیّتی خالص نور ہے۔ اور غرض اور مکر اور دھوکے کی آلائشوں سے پاک ومنزّہ ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ انسان بظاہر نیک عمل کرتا ہو۔ مگر اس کے یہ اعمال نفسانی اغراض پر مبنی ہوں۔ مثلاً قصائی بکری کو پالتا ہے اور اُس کی محافظت کرتا ہے۔ مگر قصائی کا یہ نیک عمل نفع کی غرض پر مبنی ہے۔ اور اِس پرورش کا نتیجہ بیچاری بکری کا ذبح کرنا ہے۔ کتنے ہی نیک اعمال اغراضِ نفسانی کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مگر نیک نیّتی اِن تمام آلائشوں سے پاک ہے۔

الغرض عرفانِ الٰہی اور ظہورِ محبت اللہ اور انجذاب وجدانی اور نیک نیّتی حاصل ہونے کے بعد نیک اعمال، تام اور کامل ہوتے ہیں۔ ورنہ اگرچہ نیک اعمال اچھے ہیں۔ مگر جب تک وہ عرفانِ الٰہی اور محبت ربّانی اور نیک نیّتی سے مستند نہیں ہوتے ناقص رہتے ہیں۔ مثلاً انسانی وجود کو اپنے کمال میں تمام اوصاف کا جامع ہونا چاہئے۔ نظر نہایت ہی محبوب ومقبول ہے۔ مگر اسے کان سے مدد پانا ضروری ہے۔ کان بہت عمدہ ہے۔ مگر قوّۂ ناطقہ کی مدد اس کے لئے ضروری ہے۔ پھر قوّۂ ناطقہ بہت پسندیدہ ہے۔ مگر قوّتِ عاقلہ کی مدد کی محتاج ہے۔ اسی طرح سب دوسرے انسانی اعضاء اور ارکان کے لئے قیاس کیجئے۔ جب اِن قوتوں اور اعضاء واجزاء وحواس کی جمعیت مرتب ہو جاتی ہے تو انسان کامل ہو جاتا ہے۔

آجکل دُنیا میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو فی الحقیقت خیرِ عموم چاہتے ہیں اور اپنی طاقت کے مطابق مظلوم کی معاونت اور فقیروں کی اعانت پر کمربستہ ہوتے ہیں، اور صلح وآسائش عمومی کے شیدا ہیں۔ اگرچہ اِس جہت سے کامل ہیں، لیکن عرفان اللہ اور محبت اللہ سے محروم ہیں۔ اس لئے ناقص ہیں۔

حکیم جالینوس اپنی کتاب میں جو اُس نے افلاطون کے رسالے "فنِ حکومت" کی شرح میں

لکھی ہے لکھتا ہے کہ صحیح مدنیت (سویلیزیشن) کے پھیلانے میں دینی عقائد بہت بڑا دخل رکھتے ہیں اور اُس کی دلیل یہ ہے کہ عام لوگ الفاظ برہانیہ کے سیاق کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے آخرت کے ثواب و عذاب کی خبروں کے سمجھنے کے لئے کلماتِ رموزیہ کے محتاج ہیں۔ اس مطلب کے ثبوت میں یہ دلیل ہے کہ ہم ایک قوم کو دیکھتے ہیں جس کا نام نصاریٰ ہے۔ یہ لوگ ثواب و عذاب کے معتقد اور مومن ہیں۔ ان سے ایسے نیک اعمال صادر ہوتے ہیں جو ایک سچے فلاسفر سے ہوتے ہیں۔ ہم سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ موت سے نہیں ڈرتے۔ اور چونکہ وہ عدل و انصاف کے بہت ہی شائق اور خواہشمند ہیں۔ اس لئے سچے فلاسفروں میں گنے جاتے ہیں۔"

آپ ملاحظہ فرمائیے کہ مومنینِ مسیح کا صدق۔ ان کی جانفشانی، اُن کے احساساتِ رُوحانی، اُن کی سچی دوستی، اُن کے نیک اعمال کیسے تھے کہ جالینوس حکیم فیلسوف نے حالانکہ ملتِ مسیح سے نہ تھا، اُن لوگوں کے اخلاق و کمالات کی شہادت دی ہے کہتا ہے کہ یہ لوگ سچے فیلسوف ہیں۔ یہ فضائل و خصائل صرف نیک اعمال سے ہی حاصل نہیں ہوتے، اگر مقصد صرف نیکی کا حصول و صدور ہی ہوتا تو یہ چراغ بھی اس وقت روشن ہے اور اس جگہ کو روشن کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ روشنی بھلائی ہے، باوجود اِس کے آپ اِس چراغ کی ستائش نہیں کرتے۔

آفتاب تمام کائناتِ زمینی کی تربیت کرتا ہے۔ اور حرارت سے نشو و نما دیتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر بھلا کون سی نیکی بڑی ہو سکتی ہے۔ مگر چونکہ یہ نیکی نیک نیتی اور محبتِ الٰہی اور عرفانِ الٰہی سے صادر نہیں ہوتی، اِس لئے بالکل ناقص اور بے جلوہ ہے۔ مگر جب ایک انسان دوسرے انسان کو پانی کا ایک پیالہ دیتا ہے تو وہ اس کا ممنون و شکر گذار ہوتا ہے۔

کم فہم انسان کہتا ہے کہ چونکہ آفتاب تمام جہان کو روشن کرتا ہے اور یہ فیضِ عظیم اُس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی پرستش و ستائش کرنی چاہئے۔ کیوں ہم اس کے ممنون و متشکر نہ ہوں جبکہ ہم ایک انسان کی جو ایک نہایت چھوٹی سی مہربانی کرتا ہے، تعریف کرتے ہیں۔ مگر جب ہم حقیقت پر نظر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان کی یہ چھوٹی سی مہربانی اُس کے احساسات و وجدان سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے ستایش کی سزاوار ہے۔ چونکہ آفتاب کی حرارت اور روشنی احساس و وجدان سے پیدا نہیں ہوتی اِس لئے تعریف و ثنا کے لائق اور شکر و ممنونیت کی سزاوار نہیں۔

اِسی طرح وہ لوگ جن سے نیک اعمال صادر ہوتے ہیں اگرچہ ممدوح ہیں مگر چونکہ یہ نیک اعمال عرفانِ حق اور محبت اللہ سے پیدا نہیں ہوتے اس لئے ناقص ہیں۔ علاوہ ازیں اگر ہم انصاف

سے نظر کریں تو دیکھتے ہیں کہ اُن لوگوں کے نیک اعمال بھی اصل میں تعالیم الٰہی سے ہی پیدا ہوئے ہیں یعنی پہلے نبیوں نے لوگوں کو اِن نیک اعمال کا راستہ دکھایا ہے۔ اُن کی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور اُن کی نیک اور پسندیدہ تاثیرات کو اُنھیں سمجھا دیا ہے۔ یہ تعالیم انسانوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں اور سلسلہ وار یکے بعد دیگرے اُن تک پہنچی ہیں اور اُن کے دلوں کو اُن خوبیوں کی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ یہ اعمال نیک ہیں اور عالَم انسانی میں سعادت و کامرانی کے سبب ہیں۔ اِس لئے اُن کی پیروی کی۔ پس یہ بھی تعالیم الٰہی کا نتیجہ ہیں۔ اس بات کے ماننے کے لئے انصاف لازم ہے بحث و جدال کی ضرورت نہیں۔

الحمدللہ! آپ ایران تشریف لے گئے تھے اور دیکھا ہے کہ حضرت بہاء اللہ کے پاک نفحات سے ایرانی کس قدر نوعِ انسان پر مہربان ہیں۔ پہلے ہر شخص دوسرے لوگوں سے لڑتا تھا، طعنے دیتا تھا، اور باہم نہایت عداوت و بغض رکھتے تھے، حتیٰ کہ لوگوں کو نجس خیال کرتے تھے۔ انجیل و تورات کو جلا ڈالتے تھے۔ اگر اُن کے ہاتھ اُن کتابوں سے لگ جاتے تھے تو اُنھیں دھوتے تھے۔ اَب اُن دو کتابوں کے اکثر مضامین کو اپنی مجلسوں میں مناسبت کے ساتھ پڑھتے اور اُن کی تفسیر کرتے ہیں۔ اور معانی و رموز کو سمجھاتے ہیں اور اپنے دشمنوں کی پرورش کرتے ہیں۔ خونخوار بھیڑیوں پر بھی صحرائے محبتِ الٰہی کے ہرنوں کی مانند نوازش کرتے ہیں۔ آپ نے اُن کے رویّہ و سلوک بھی دیکھے اور دوسرے ایرانیوں کے اخلاق کا بھی حال سُنا۔ یہ عادات کا بدلنا، رفتار و گفتار کا اعتدال پر آنا کیا سوائے محبت اللہ اور کسی طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے؟ لا واللہ! اگر ہم علوم و معارف کے ذریعے اِن عادات و اطوار کو رائج کرنا چاہتے تو ہزار سال گذرنے پر بھی لوگوں میں جاری نہ ہوتے۔ اَب محبت اللہ کے ذریعے نہایت آسانی سے حاصل ہو گئے ہیں۔ فاعتبروا یا اُولی الالباب (پس اے عقلمندو! عبرت حاصل کرو)۔